

تذکرہ معاصرین

(1974 اور 1975 کے دوران میں وفات پانے والے ادباء کے حالات اور کلام)

(حصہ سوم)

مالک رام

مکتبہ جامعی دہلی

اشتراک

پیشکش کنندہ: قومی ادارہ برائے ادبیات

تذکرہ معاصرین

(1974 اور 1975 کے دوران میں وفات پانے والے ادباء کے حالات اور کلام)

(حصہ سوم)

مالک رام

مکتبہ جامعہ دہلی

اشتراک

پیشکش کنندہ: قومی نصابی و فنی ادارہ، لاہور

معروضات

قارئین کرام! آپ جانتے ہیں کہ مکتبہ جامعہ لیٹلڈ ایک قدیم اشاعتی ادارہ ہے، جو اپنے ماضی کی شاندار روایات کے ساتھ آج بھی سرگرم عمل ہے۔ 1922ء میں اس کے قیام کے ساتھ ہی کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا جو زمانے کے سرو و گرم سے گزرتا ہوا آگے کی جانب گامزن رہا۔ درمیان میں کئی دشواریاں حائل ہوئیں، تا مساعدا حالات سے بھی سابقہ بڑا مگر سفر جاری رہا اور اشاعتوں کا سلسلہ کئی طور پر کبھی منقطع نہیں ہوا۔

اس ادارے نے اردو زبان و ادب کے معتبر و مستند مصنفین کی سیکڑوں کتابیں شائع کی ہیں۔ بچوں کے لیے کم قیمت کتابوں کی اشاعت اور طلباء کے لیے ”دری کتب“ اور ”معیاری سیریز“ کے عنوان سے مختصر مگر جامع کتابوں کی جاری بھی اس ادارے کے مفید اور مقبول منصوبے رہے ہیں۔ ابھر چند برسوں سے اشاعتی پروگرام میں کچھ قفل پیدا ہو گیا تھا جس کی وجہ سے فہرست کتب کی اشاعت بھی ملتوی ہوتی رہی مگر اب برف پگھلی ہے اور مکتبہ کی جو کتابیں کیا اب تک نایاب ہوتی جا رہی تھیں شائع ہو چکی ہیں۔ ذریعہ نظر کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اب تمام کتابیں مکتبہ کی دینی، ممیعی اور علی گڑھ شاخوں پر دستیاب ہیں اور آپ کے مطالبہ پر بھی روانہ کی جا سکیں گی۔

اشاعتی پروگرام کے محمود کو توڑنے اور مکتبہ کی نادر کو پھنور سے نکالنے میں مکتبہ جامعہ بورڈ آف ڈائریکٹرز کے چیئرمین اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر جناب نجیب جنگ (آئی اے ایس) کی خصوصی دلچسپی کا ذکر ناگزیر ہے۔ موصوف نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے فعال ڈائریکٹر جناب حمید اللہ بھٹ کے ساتھ (مکتبہ جامعہ لیٹلڈ اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے درمیان) ایک معاہدے کے تحت کتابوں کی اشاعت کے معطل شدہ عمل کو نئی زندگی بخشی ہے۔ اس سرگرم عملی اقدام کے لیے مکتبہ جامعہ کی جانب سے میں ان صاحبان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ امید ہے کہ یہ تعاون آئندہ بھی شامل حال رہے گا۔

خالد محمود

شیبنگ ڈائریکٹر، مکتبہ جامعہ لیٹلڈ

ڈاکٹر سید عابد حسین
کی نذر

نشانِ سجدہ من نیز ہم بر آستانِ بینی

تعارف

تذکرہ معاصرین کی اس جلد میں ان ۵۶ آدمیوں، شاعروں، صحافیوں کے حالات شائع کیے جا رہے ہیں جو ۱۹۰۲ء اور ۱۹۰۵ء کے دو برسوں میں ہم سے پیدا ہوئے۔ ۱۵۸ برس گئے، اجاں ہم میں سے ہر ایک آگے پیچھے پہنچنے والا ہے۔ اِنَّا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ۔ دیکھنا یہ ہے کہ انھوں نے اپنی حیاتِ مستحادمیں کیا کیا اہمیتوں نے انھیں جو صلاحیتیں دی ہیں کہ انھیں کیا انھوں نے ان کا اپنی باطنی جبرِ شکیک استعمال کیا کیا انھوں نے اپنے دل و دماغ کی خداداد قوتوں کو اپنے ہوشوں اور ذہنی نوعِ انسان کی بھلائی اور سہجی کی راہ میں صرف کیا! کسی زندگی کی کامیابی اور ناکامی کا یہی معیار رہا ہے، اور یہی آئندہ بھی رہے گا۔ اگر ان سوالات کا جواب اثبات میں ہے، تو بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے امانت میں خیانت نہیں کی، اور کم و بیش کامیاب زندگی گزار دی۔

ان میں سے بعض اصحاب اس پالے کے نیچے کو کوئی نوٹرخ ادب اور دوا نہیں نظر انداز نہیں کر سکتا۔ انہوں نے اپنے پیچھے لیے آیت آنا دھوٹے میں اور اپنے بعد کے آنے والوں کی راہ اس حد تک ہموار کر دی ہے کہ اگر دو کاہر ایک طالب علم ان کا متنبہ رہ گیا ۔ حالات کی فراہمی میں طریقہ کار وہی رہا ہے جس کی طرف اس سے پہلے اشارہ کر دیا ہے۔ جن اصحاب کے میرے طویل زمانے تک ذاتی تعلقات ہے، یا جن کے لواحقین اور متعلقین نے معلومات چھپا کر نے میں مستعدی دکھائی، ان کے حالات بھی مفصل اور بڑی حد تک مکمل ہیں؛ ورنہ دوسرے نسبتاً تشنہ ہیں، اگرچہ یہاں بھی بنیادی ادوارم کو نصف بہر حال محفوظ چھوٹے ہیں۔ موجودہ حالات میں ان سے زیادہ معلومات حاصل کرنا دشوار تھا ۔

ہاں ایک اور بات کی طرف اشارہ کرنا یہ ممکن نہیں ہو گا:

بعض اوقات ایک صاحب کے ترجمے میں کہی: ”میرے شخص کے حالات بھی جمع ہو گئے ہیں۔“
 ”جی، کسی کے نزدیک یہ فیضِ ربی ہو۔ یہ بات اہم خیال کرتا ہوں کہ حق الامکان

ہر ایک ادیب یا شاعر کے خاندان کا حال معلوم ہونا چاہیے، تاکہ ہم دیکھ سکیں کہ اس کا پس منظر کیا تھا، وہ کس ماحول میں پیدا ہوا، بڑا ہوا۔ پھر اس کا اندازِ فکر تھا، جس سے ہم اس کی تفہیم و ترمیم کا کچھ اندازہ کر سکیں۔ اس سے ہمارے لیے یہ فیصلہ کرنا آسان ہو جائیگا کہ اس کی کونسی صلاحیت موردِ توجہ تھی اور کونسی اس کے اپنے ذمہ پر بازو کا نتیجہ۔ اس کے علاوہ ایک اور بات بھی ان تفصیلات میں جاننے کا باعث ہوتی ہے۔

اپنی جستجو اور پوچھ گچھ کے دوران میں میرے سامنے کئی ایسی باتیں آ جاتی ہیں، جن سے متعلق کسی نے کچھ نہیں سمجھا۔ چونکہ حسن اتفاق سے یہ معلومات حاصل ہو گئی ہیں، چاہتا ہوں کہ وہ محفوظ ہو جائیں، ورنہ بعد کو کوئی اتنا تامل والا بھی نہیں ہوگا اور وہ کاٹا مرڈہ نفا میں چل جائیگی؛ میرے خیال میں یہ علم کا ناقابلِ تلافی نقصان ہو گا۔ کون کہہ سکتا ہو، کمال کسی کو اللہ کی ضرورت نہیں پیش آئیگی۔

جب بھی ان اموات کی فہرست اور ان کے حالات پر نظر ڈالتا ہوں، تو وہ دم کے ایک بتا ذہن میں آتی ہے کہ سچے سچہ ریسے ہیں اور سینے خالی ہوتے جا رہے ہیں۔ ہر روز بیمار نئی کتابیں شائع ہو رہی ہیں، لیکن علم کم ہو رہا ہے۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ مستقبل کی طرف سے ایسے ہو جائے، تو انہیں فطرت کی صداقت سے انکار کا مرادف ہو گا لیکن اتنا قہر کوئی محسوس کر سکتا ہے کہ ہماری نئی نسل کو بزرگوں کی حلائی ہوئی شیخ علم و معرفت روشن رکھنے کے لیے بہت کوشش کرنا پڑیگی۔

آخر میں ایک مرتبہ پھر ان احباب کا شکریہ ادا کرتا ہوں، جنہوں نے حالات کی فراہمی میں مدد کی، کلام کے مجموعے تیار کیے، یاد دہری مطبوعات مستعار دیں۔ میں ان سب کا شکریہ فرداً فرداً پہلے بھی ادا کر چکا ہوں، اب پھر مجموعی طور پر اس کا اعادہ کرتا ہوں۔

محمد امجد الحسن الخضر

نئی دہلی

۲۰ اپریل ۱۹۷۸ء

مالک دھرم

نہرست بہ ترتیب حروف تہجی

- ۱۔ اثر حیدر آبادی، صدیقی احمد : ۹۲
 - ۲۔ اظہر سیالکوٹی، احمد الدین (اے، ڈی) : ۵۳
 - ۳۔ اعجاز حسین، شید (پروفیسر) : ۲۱۸
 - ۴۔ افسر میرٹھی، حامد اللہ : ۸۴
 - ۵۔ اگل جان دھری، رام پرتاپ : ۳۰
 - ۶۔ امجد گہی، محمد امجد : ۳۰
 - ۷۔ انور، ڈاکٹر منوہر سہاس : ۴۵
 - ۸۔ انور کامٹھی، یار محمد انصاری : ۱۶۲
-
- ۹۔ بسمل الا آبادی، سکھ دیو پرشاد : ۳۰۹
 - ۱۰۔ بھڑاد بھٹنڈوی، سردار احمد خان : ۱۴۲
 - ۱۱۔ تاج کوٹلی، محمد اسماعیل علی خان بہادر : ۱۵۱
 - ۱۲۔ تمکین مرست، محمد قلاو الدین، شید : ۲۳۷
 - ۱۳۔ ٹھاکر پوٹھی، جگن ناتھ : ۱۳۱
 - ۱۴۔ شائق منظم آبادی، شید حسن رضا : ۱۵
 - ۱۵۔ شرچھری، عبدالحفیظ صدیقی : ۱۵۸
 - ۱۶۔ جمالی، طفیل احمد : ۱۳۶
 - ۱۷۔ جوان شہیلوی، سنی لال : ۲۴
 - ۱۸۔ حامد الا آبادی، حامد حسین : ۲۶۹

- ۱۹۔ حیدر احمد خان ۷۹ : ۶
- ۲۰۔ حیرت بدایونی، سید حسن ۷۰ : ۴
- ۲۱۔ حضرت عیسیٰ، مراد بخش ۹۹ : ۳
- ۲۲۔ دیوان سنگھ مفتون ۱۸۷ : ۲
- ۲۳۔ ذوالفقار علی بخاری ۲۴۸ : ۳
- ۲۴۔ ق۔ م۔ راشد ۲۷۵ : ۳
- ۲۵۔ ریاض الفوائد، ریاض الدین، قاضی ۱۱۷ : ۱
- ۲۶۔ ساغر صدیقی، محمد اختر ۱۲۸ : ۱
- ۲۷۔ ساگر نودوی، بلونت گار ۶۰ : ۳
- ۲۸۔ سید مسعود حسن رضوی ادیب ۳۲۳ : ۲
- ۲۹۔ شاہ حسین الدین احمد ندوی ۱۶۶ : ۱
- ۳۰۔ شہادت کاظمی، سید فضل الحسن ۲۲۵ : ۱
- ۳۱۔ شمس مینری، شمس الدین احمد ۲۱۳ : ۳
- ۳۲۔ شمیم کرمانی، شمس الدین حیدر ۲۲۳ : ۳
- ۳۳۔ شوہر کش کاشمیری، مبداء الکرم، آغا ۲۸۷ : ۱
- ۳۴۔ شیر محمد اختر گجراتی ۱۷۲ : ۱
- ۳۵۔ طالب دلوی، شیش چندر سکیت ۲۹۷ : ۳
- ۳۶۔ طالب دواتی، محمد قطب الدین حسن قادری ۳۵۵ : ۱
- ۳۷۔ عبدالرحمن چغتائی ۱۷۶ : ۱
- ۳۸۔ عزیز جلال دہلوی، محمد عزیز الرحمن قریشی ۳۷ : ۱
- ۳۹۔ قاضی، یحییٰ نامہ وحدت ۳۱۲ : ۳
- ۴۰۔ قیس کوٹوی، نور محمد ۲۷ : ۱
- ۴۱۔ قاضی ناگپوری، بشیر خان ۲۴۰ : ۱

تذکرہ عامرین

- ۴۲۔ جمید امجد، عبدالمجد : ۱۱۰ :
 ۴۳۔ عشر مرزا لچدی، مرزا فرزند علی : ۱۲۸ :
 ۴۴۔ محمد حسین حستان : ۱۳۳ :
 ۴۵۔ محمود احمد عباسی امر دہوی : ۶۳ :
 ۴۶۔ محی مدنی گھنوی، محمد حسین : ۳۰۳ :
 ۴۷۔ مسیح الزمان، شید : ۲۰۴ :
 ۴۸۔ مظفر حیدری، دلاور حسین : ۲۲۳ :
 ۴۹۔ مظفر گھنوی، شید مظفر حسن : ۲۶۵ :
 ۵۰۔ ہندو ناتھ : ۷۱ :
 ۵۱۔ ہمدوشی، شید عبدالقیوم : ۴۱ :
 ۵۲۔ میرزا محمود بیگ : ۳۲۲ :
 ۵۳۔ نثار، نادی، نثار حسین : ۱۰۳ :
 ۵۴۔ نجم آفندی، میرزا جمال حسین : ۳۴۹ :
 ۵۵۔ نثر جالندھری، محمد عبدالکیم خان : ۲۶۱ :
 ۵۶۔ ہزا گھنوی، شید حسن : ۲۹۴ :

فہرست

بترتیب تاریخ وقات

- نمبر ۱۰/م/تخلص مقام وفات تاریخ دفات صفحہ
- ۱۔ نائب عظیم آبادی، سید حسن غا..... پٹنہ ۱۹ جنوری ۱۹۷۴ ۱۵
 - ۲۔ اکمل جالندھری، ارام پرتاپ دلی ۲۰ جنوری ۱۹۷۴ ۲۰
 - ۳۔ جواہر سندیلوی، مستی لال لکھنؤ ۲۵ جنوری ۱۹۷۴ ۲۳
 - ۴۔ قیس کوٹلی، نور محمد سیکت ۲۶ جنوری ۱۹۷۴ ۲۷
 - ۵۔ امجد بھٹی، محمد امجد سکک یکم فروری ۱۹۷۴ ۳۰
 - ۶۔ عزیز بھالاداری، محمود عزیز الرحمن قوشی، بھالادار ۶ فروری ۱۹۷۴ ۳۷
 - ۷۔ ہجوڑی، سید عبدالیقوم پٹنہ ۸ فروری ۱۹۷۴ ۴۱
 - ۸۔ انور، ڈاکٹر منو ہر سہاے دلی ۱۷ فروری ۱۹۷۴ ۴۵
 - ۹۔ انور سیالکوٹی، احمد الدین (لے ڈی) بکھاسی ۲۳ فروری ۱۹۷۴ ۵۳
 - ۱۰۔ سائر نگودر، بلونت کمار ننکودر ۲۵ فروری ۱۹۷۴ ۶۰
 - ۱۱۔ محمود احمد عباسی اردو نوی کراچی ۲۴ مارچ ۱۹۷۴ ۶۴
 - ۱۲۔ ہندناقم بیٹی ۲۰ مارچ ۱۹۷۴ ۷۱
 - ۱۳۔ حمید احمد خان لاہور ۲۳ مارچ ۱۹۷۴ ۷۶
 - ۱۴۔ انور میرٹھی، جاوید لکھنؤ ۱۹ اپریل ۱۹۷۴ ۸۴
 - ۱۵۔ اثر حمید آبادی، صدیق احمد حیدر آباد ۲۷ اپریل ۱۹۷۴ ۹۴
 - ۱۶۔ خضر تھمی، مولابخش لاہور اپریل ۱۹۷۴ ۹۹
 - ۱۷۔ نثار آبادی، نثار حسین اٹاوہ ۴ مئی ۱۹۷۴ ۱۰۳
 - ۱۸۔ مجید امجد، عبدالحمید ساہیوال ۱۲ مئی ۱۹۷۴ ۱۱۰

- ۴۲۔ فخر جان دہری، محمد عبدالجکیم خان لاہور۔۔۔۔۔ ۲۲ جون ۱۹۷۵ء ۲۶۱
- ۴۳۔ منظر لکھنوی، سید منظر حسن۔۔۔۔۔ لکھنؤ۔۔۔۔۔ ۲۲/۲۳ جون ۱۹۷۵ء ۲۶۵
- ۴۴۔ حامد الاکبادی، حامد حسین۔۔۔۔۔ الاکباد۔۔۔۔۔ ۱۰ ستمبر ۱۹۷۵ء ۲۶۹
- ۴۵۔ ن، م، راشد (زند محمد)۔۔۔۔۔ لندن۔۔۔۔۔ ۹ اکتوبر ۱۹۷۵ء ۲۷۵
- ۴۶۔ شوش کاشمیری، عبدالکریم (آغا) لاہور۔۔۔۔۔ ۲۲ اکتوبر ۱۹۷۵ء ۲۸۷
- ۴۷۔ ہزار لکھنوی، سید حسن۔۔۔۔۔ کانپور۔۔۔۔۔ ۳ نومبر ۱۹۷۵ء ۲۹۴
- ۴۸۔ طالب دہلوی، شمس خندرسکینہ۔۔۔۔۔ دہلی۔۔۔۔۔ ۱۷ نومبر ۱۹۷۵ء ۲۹۷
- ۴۹۔ محوی صدیقی لکھنوی، محمد حسین۔۔۔۔۔ بھوپال۔۔۔۔۔ ۱۹ نومبر ۱۹۷۵ء ۳۰۳
- ۵۰۔ بسمل الاکبادی، سکھدی پرشاد۔۔۔۔۔ الاکباد۔۔۔۔۔ ۲۲ نومبر ۱۹۷۵ء ۳۱۹
- ۵۱۔ قاصر، ابرہیم ناتھوت۔۔۔۔۔ کوئٹہ کیشتر۔۔۔۔۔ ۲۵ نومبر ۱۹۷۵ء ۳۱۲
- ۵۲۔ سید مسعود حسن رضوی ادیب۔۔۔۔۔ لکھنؤ۔۔۔۔۔ ۲۰ نومبر ۱۹۷۵ء ۳۲۲
- ۵۳۔ نکیل سرمست، سید محمد قادری الدین۔۔۔۔۔ حیدرآباد۔۔۔۔۔ ۱۲ دسمبر ۱۹۷۵ء ۳۳۷
- ۵۴۔ میرزا محمود بیگ۔۔۔۔۔ دہلی۔۔۔۔۔ ۱۴/۱۵ دسمبر ۱۹۷۵ء ۳۴۲
- ۵۵۔ نجم آفندی، میرزا مجتبیٰ حسین۔۔۔۔۔ کراچی۔۔۔۔۔ ۲۲ دسمبر ۱۹۷۵ء ۳۴۹
- ۵۶۔ طالب رزاقی، محمد قطب الدین حسن۔۔۔۔۔ حیدرآباد۔۔۔۔۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۷۵ء ۳۵۵

شائق عظیم آبادی اسید حسن رضا

پٹنہ کے مٹی دادی لکھنے کی معروف شخصیت تھے۔ ان کے والد شیخ عبد علی حسن عظیم آبادی وہاں کے مشہور اور باہر خوشنویس تھے اور شہر میں بڑے منشی صاحب کے نقیب سے معروف تھے۔ اس فن میں باقر عظیم آبادی کے شاگرد تھے۔

شائق کی ولادت ۱۹۰۵ء میں ہوئی، ابتدائی تعلیم غمی طور پر گھر کے بزرگوں سے پائی۔ اس کے بعد شہر کے سلسلہ استاد عالم مولانا لکھنے صاحب نے منطق، فلسفہ، طب، فقہ احمدیہ وغیرہ حاصل کیے۔ ۱۹۳۶ء میں مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ سے "عالم کلی سندل اور ۱۹۴۲ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے "فاضل ادب" کی۔ پھر ۱۹۴۳ء میں انگریزی کے دوسرے درجہ کا امتحان بھی پاس کر لیا، حال آنکہ وہ خود اس زمانے میں سرکاری اسکول پٹنہ میں عربی اور فارسی کے معلم تھے۔ مختلف اسکولوں میں کام کرنے کے بعد بالآخر ۱۹۶۵ء میں پٹنہ پریسکول و شہر ہوئے۔

اس صاحب کے ادب میں پٹنہ سٹی اچھا ان کی سکونت تھی، علم و ادب اور شعر و سخن کا مرکز تھا۔ شاہ عظیم آبادی (دف جنوری ۱۹۲۷ء) عبد الحمید پریشان (دف اگست ۱۹۵۵ء) تنہا علی (دف نومبر ۱۹۵۷ء) اور کئی دوسرے حضرات اسی گوارا کے رہنے والے تھے۔ غرض پوری فضا شعر و فن سے ممتلئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ شائق بھی بچپن سے شعر گوئی کی طرف مائل ہو گئے۔ آغا ذہیں انھوں نے میر باقر عظیم آبادی اور ان کے سارے رشتہ دار و حیدر الدین و حیدر آبادی سے مشورہ کیا۔ فن حیطہ علی اور خوشنویس میں بھی میر باقر ہی کے شاگرد تھے ان دونوں سے اپنے استفادے کا ذکر ایک مقطع میں کرتے ہیں:

یہی ہے راہنمای سخن کی، اے شائق! جو کھینچا ہو، تو نقشِ حیدر باقر کھینچ

ایک اور قطع ہے :

ہے فیض حضرت یاقرب سے اتباع وحید

کہ جن کے رنگ کا، ثناء قیہ جواب ہو نہ سکا

افسوس کہ ان کا شعری تجربہ ان کی زندگی میں شائع نہ ہو سکا۔ اسے ان کی ذفات کے بعد ان کے صاحبزادے سید سعید رضا گہر عظیم آبادی نے "سرمایہ نشاط" کے عنوان سے رتبہ کو کے شائع کیا (ربیع الثانی ۱۹۷۷ء) دو شعری کتابیں عظیم آبادی کی محوشہ ادبی مجلس "دریا کا پریشان" (سوانحی شاہ دکن الدین عشق دہلوی ثم عظیم آبادی) ان کی حیات میں چھپ گئی تھیں۔ پہلی کتاب پر بہار انجوش بورد نے ایک ہزار روپیہ انعام بھی دیا۔

ان کے صحیارہ اولادیں ہوئیں لیکن بدست سے نورسے ان کی زندگی ہی میں دروغ مفاد دے گئے۔ ان پے در پے حادثات نے ان کا داخلی توازن بکھل کر دیا۔ بہت دن کے علاج معالجے کے بعد یہ توازن بحال ہوا تھا کہ اپنے جلی جلاؤ کا زمانہ آگیا۔ ۱۹ جنوری ۱۹۷۳ء کو دن کے دس بجے چٹنے میں رطبت کی۔ "آناشد و آتانا ایسہ راجون۔ محلہ شاہ کی لٹا" میں محل مسجد کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

حضرت قاتل دانا پوری نے تمارینح ذفات کہی :

ایں غلط ثابت آمدہ، صد حیف قطب جہند اسے قاتل از جاے

بہر تارینح اد، ندا آمد "آہ ثاقب، صدا آہ، حسرت بے"

(۱۳۹۳ء)

تیدم یوسف کے طویل قطعہ تمارینح کا آخری شعر ہے :

رطبت کا سن ہے بے سہراہ "ثاقب سوے جنت روا نہ"

(۱۳۹۳ء-۱۳۹۳ء)

ان کا کلام بختیہ اور بے عیب ہے، مضمون آفرینی کی کوشش نمایاں ہے، غزل کے

علاقہ نظم بھی کہتے تھے۔ چنانچہ جموعے میں چند نفیس بھی شامل ہیں۔ خود کے طور پر چند شعر کا غلط ہوں،

کل کہتے ہیں وہ ہر دن کل آج نہیں ہوتا

ہے وعدہ خدا بھی فرداے قیامت کا

یہ رات مصیبت کا نام ہے بھی نہیں ملتی

سٹ جا تا ہے باتوں میں، دن عیش و عشرت کا

نہ دیکھا مجھے آنکھ اٹھا کر، تو کیا غم شراف تو ملا بزم کی حاضری کا

تھری جو دیر کعبہ میں تھی پستی منا منزل نہیں تھی وہ، جسے منزل بنا دیا

گرتے ہیں زرد چٹے کہ شاخیں ہوں سبز پھر

پیغام دے رہی ہے خزاں بھی بہار کا

ایسا بھی آشیانہ کبھی شاخ گل پر تھا میں نے بھی لطف اٹھایا ہے فصل بہار کا

رتے گناہ ہیں پھر سبھی شمار کے اندر ترے کرم کا تو کوئی حاب ہو دم کا

وقت یہ کیا آگیا، نام خلوص مٹ گیا

غیر تو غیر ہی ہوں، دیتے ہیں آشا فریب

ہیں مسور کیوں اپنے جلوں سے خود چلے کیا ہیں آئینہ خانے سے آب

کہتے ہو، کیوں نظر آتا ہوں پریشان بہت

جان کر تم تو بنا کرتے ہو انجان بہت

فریب دینے لگی انتظار کی آہٹ سمجھ رہا ہوں جسے پائے یاد کی آہٹ

ہے کاروان جب سب کیو سب کے قرار کہ پیدلوں کے گلے ہے سوار کی آہٹ

بجلی ہی آتی ہے پری جو اب بے یاروں ہے بے نیسوں کو یہ روز شمار کی آہٹ

ساقی! ترے کرم کی حلاوت بھی ہے عجیب

کل جو شراب تلخ تھی، وہ انکبیں ہے آج

تقدیر بگڑتی ہے تو ساحل پہ ہے طوفان اللہ نگہاں ہے، تو طوفان بھی ہے ساحل

عیش بریں سے روزِ پلشتی ہے نامراد ہے شکوہِ سخن ہم سے نغماں اور نغماں سے ہم
 زندگِ بونگنی کس طرح بسر، یاد نہیں روزِ شب یاد نہیں، شام و سحر یاد نہیں
 گٹھیا کیسے محبت میں یہ گھر، یاد نہیں کیسے برباد ہوئے قلب و جگر، یاد نہیں
 جب چاک گریباں ہکلی آتی ہے خوبینو خیرِ جیب پر دے میں ہے تعمیر کا پہلو

زمین و آسمان کا فرق ان دونوں میں ہے پھر بھی

غمِ جاناں سے ہوتا ہے، غمِ دوراں کا اندازہ
 کس کا ایک دروازہ خدا جب بند کرتا ہے

اسی کے فضل سے کھلتا ہے کوئی اور دروازہ
 دنیا کے ال و زل کی حقیقت ہی کیا رہے رشتہ جو استوار ہو شاقب! خدا کے راستہ
 خدا کا شکر ہے وحشت رکھ لے، دہرِ دل کی

دگر ہم زمانے بھر کو سمجھانے کہاں جاتے
 فرمائے، کس کس سے کوئی دل کو بچائے انداز سے، شوخی سے، تبسم سے، حیا سے
 جب کچھ نہ رہا جامِ دردی کو، تو یہ سوچھی دو چاند گرہ کم کودن زادہ کی جلا سے
 ہے شمع بھی خاموشی، چنگوں کو جلا کر سچ ہے کہ مجھ سے کام کا انجام برابر ہے
 جس حال میں وہ رکھے، اسی حال میں خوش ہو بند و دیبا اچھا ہے، جو راضی بہ رضا ہے
 داغِ ماضی، چشمِ تنہا، قلب و وارفتہ انھیں غفلتوں سے ہم شرحِ کتابِ زندگی لکھ
 ہمارے گلشنِ ہستی خردِ ان کے ساتھ ہے ثابت جو دیکھے گریہ، شبنم، وہ پھولوں کی شبنم ہی ہے
 دے بے پاؤں نسیم آگے کہ جاتی ہے کچھ سب سے

چمن کی جو کلی ہے، رازِ دامن معلوم ہوتی ہے

چھتا توڑے میں کاٹنا اور چلش دل میں کوئی پیدا

کہاں تکلیف پہنچی ہے، کہاں معلوم ہوتی ہے

دیکھو اور کوئی دوسرا، باتیں ہوں تو ان کی مٹوں

یہی اک داستان ہے یہی اک داستان کہیے

دوسرا ہونے تھے کل تو صبح اے جا بلی! پھر اس گل میں جانے کو تیار کیوں ہوئے؟

دیکھتے ہیں جو تھا دس گیسو ورنے کی جہاد صبح ان کی صیغہ ہے اور شام ان کی شام ہے

کیا بتاؤں آپ کو تاریکی روزِ فراق صبح سے معلوم ہوتا تھا کہ وقتِ شام ہے

اتنے کابل سمجھتے ہیں جس پہ قباب کو زمین ہے گیسوؤں کی اسی پہ داتا ہے

اکمل جالندھری، رام پرتاب

اگرچہ ان کا خاندان مشرقی پنجاب کے شہر جالندھر کا رہنے والا تھا، مگر چونکہ ان کے والدین ذات بھگت نام (وفات: اگست ۱۹۲۹ء) کشمی جسٹس فیکری، کھنڈہ (خلع کرنا) میں ملازم تھے، اور اسی سلسلے میں یہاں مقیم تھے، اس لیے رام پرتاب کی ولادت یہیں کھنڈہ میں ۲ فروری ۱۹۰۷ء کو ہوئی۔

ابتدائی تعلیم کے بعد ڈی اے، دی کالج، لاہور میں داخلہ لے لیا، لیکن ان کے بعد یہ سلسلہ منقطع ہو گیا اور انھوں نے اکتوبر ۱۹۲۷ء میں ریلوے کے محکمے میں ملازمت اختیار کر لی۔ یہیں شرگوئی کے شوق کو فروغ ہوا جس کی طرف وچمان طالب علم کے زمانے ہی سے نمایاں تھا۔ ان کے ابتدائی اسکولی میں پنڈت یوگ راہ نظر سوداوی بھی مدرس تھے۔ نظر اچھے شاعر تھے۔ وہ زیادہ تر مذہبی مضامین لکھتے تھے؛ ان کا گیتا کا منظوم ترجمہ چھپ چکا ہے۔ اسی باعث شہر سیاسی نیدرینڈت ملک موبن، الوہیہ ان کے بڑے تراح تھے۔ نظر نے نوجوان رام پرتاب کا میلان بطبع دیکھ کر ان کی حوصلہ افزائی کی؛ اکمل تخلص بھی انھیں کامیاب تھا۔

ملازمت کے بعد باقاعدہ شہر کہنے کا موقع ملا تو انھوں نے رضا علی خان رضا اداوی سے اصلاح لینا شروع کی جو انھیں کی طرح ریلوے ہی میں ملازم تھے۔ جسٹس اتفاق سے اس زمانے میں ریلوے کے اس دفتر میں کئی شاعروں کا اجتماع ہو گیا تھا۔ مثلاً عبدالغنی، نہال سوداوی، مکی بیس، تھو ادا، اکمل سے ان کی گاڑی چھنتی تھی، نہال بیس، انھیں کہتے تھے؛ ادا وہ ان کا سائل دلوئی کے متاذاگر دوں میں شمار ہوتا تھا۔ وہ پادری ناخو است تقسیم ملک کے بعد پاکستان گئے تھے اور وہیں کراچی میں جنوری ۱۹۵۲ء میں ان کا انتقال

ہوا۔ منور کھنوسی بھی اس زمانے میں رہیں تھے۔

دہلی عریضوں کے ملازمت میں گوری۔ یہیں سے ۳ فروری ۱۹۲۷ء کو سکندرشاہ
اس کے بعد بسرفات کے لیے دلی کی ایک ٹرانسپورٹ کمپنی میں ملازم ہو گئے تھے۔
اتوار ۲ جنوری ۱۹۲۷ء کو انتقال ہوا اور ۲ جنوری کو جسدِ خاکی نذرِ آتش کر دیا گیا۔

دولای میں صرف ایک بیارنگو ہرندن چھوڑا۔ یہ سیندری فیکٹری میں ملازم ہیں۔

انتخابِ کلام: جسے نکل آن کی زندگی میں چھپ گیا تھا دلی ۱۹۵۶ء قلاب کے شہر
کا ملازم اور اس کے کوہ اور محبوبے "مالِ دل" اور "دودھِ حراغ" بھی شائع کرنا چاہتے
تھے، لیکن یہ آرزو دہلی نہ ہو سکی، حال آں کہ دونوں مرتب ہو چکے تھے۔

ان کے کلام میں کلاسیکل رجحان اور صحتِ زبان کے ساتھ جدید رجحانات کا تبا بھی جلتا
ہے۔ وہ نظری شاعر تھے اور اگر زیادہ سادہ گوشتوانا تو یقیناً اس سے کہیں زیادہ شہرت حاصل
کرتے جو انھیں نصیب ہوئی۔ چند شعر ملاحظہ ہوں،

جب اکیاں ہی اپنا چمن زار میں نہیں کیا شاعر سے عرض ہمیں مطلب نمرے کیا
میں دانشاں، غفلتِ دید و حرم نہیں نسبت انھیں مگر ہے تھے رنگِ دے کیا

ہمیں کیا، مگر خزاں کا دور ہو یا موسمِ گل ہو

خزاں کا غمِ زبان کو ہو جو کیلئے ہونِ جان ہے

اب اس پر بھی کوئی جھگڑے، تو کچھ غلات نہیں حراغِ ڈاہ تری رنگِ زہری ہوئی تو ہے
کرم نہیں نہ ہی، میں کرم سے درِ مگر را یہ کیا ہستم پیکھی مائل ستم شعار نہیں

طریقِ عشق میں جب مفرودستی شرطِ اول ہے

تو پھر عشاق کا منزلِ منزل امتحانِ کبوں ہو!

یہ مانا غنیمتِ زن ہو تم، مرے سادِ تصور میں

مگر سادِ تصور کا بھی پردہ درمیان کیوں ہو!

ہزار داغ ہیں ادا میں دل ہے یوں جیسے

کئی جاندوں میں اک سوچو ار کا عالم

گود جاتا ہے اب دامن بچا کر ہر بشر مجھ سے ناز نہ پھیر گیا، کیا پھیر لی تم نے نظر مجھ سے
 مجھے دم سے جہانِ زندگی میں زندگی ہے خدا شاہد کہ ہے یہ روحی شام و صبح مجھ سے
 زبانِ دل میں یہ کیا تفرقہ والا محبت سے کدال کچھ اور کہتا ہے، زبان کچھ اور کہتی ہے
 کچھ تم پہ نہیں موقوف ہوئی دنیا میں ہمارا ہونہ کا
 تم ہم سے کنا را کر بیٹھے، ہم سے تو کنا را ہونہ کا
 جالِ انجہ ایمان لینے لگا ہے ہمارا دل ہمارا اور کب تک !
 بجز اس کے کیا ہیں یہ انگ اور اکس وہ آنکھوں کا قعقہ، یہ غم کی کہانی
 دوش پر کھڑی ہوئی دلق پریشاں دیکھئے پھر ہوئے میری پریشانی کے سامان دیکھئے

بنت

میں کو دیش وہ اشہبیل دنہار نے فطرت چلی ہے دھمکے جہاں کو نکھار نے
 انا نقاب رخ سے عروسِ بہاؤ نے جلوہ دکھا دیا کسی انگلیں عذار نے
 ہر شاخ، ہر شجر کی ادا میں بدل گئیں ہمارا وہ رخ فضائے، موڑ میں مل گئیں
 ہر پھول ہر کلی میں لطافت کا جوش ہے ہر نخلِ گلستانِ جہاں سبز پوش ہے
 صحنِ چین میں بادِ صبا میفر دیش ہے غرقِ نئے نشاط ہے جس کو بھی ہوش ہے
 ہر سمت فیضِ ساقی محبوب عام ہے ہر چشم مستِ ادہ گنگول کا جام ہے
 صبا ہے دگ، باتیں ہے دوا ہوا جہاں موجِ موائیں کیف سے تاب ہے رواں
 پس بارِ خلد میں رنگینیاں کہاں جو گلستانِ حید کے پھولوں میں میناں
 ہر ذرہ آفتاب ہے اس سرزمین کا کیا حسنِ لا جواب ہے اس نازنین کا
 دنیا نہیں یہ گلشنِ جنت ہے ہو بہو ہر سمت ہے تلاطمِ امواجِ دگدگ

ہر لب پستیوں کے ترانے ہیں چار سُو گمانے لگے بسنت جو انسان خوش گلو
 بزم جہاں میں عیش و طرب کا نجوم ہے
 دیکھو جدھر بسنت کے گنے کی دھوم ہے
 یہ دوسرے عجیب، سماں لا جواب ہے احباب میگسار میں شغل شراب ہے
 ہر جام میں تجلّی صبا کے تاب ہے ہر دل بقدر ذوق طلب فیضیاب ہے
 اتنی ملی ہے نے مجھے جتنی انگ ہے
 اس حسن امتیاز پر ہر شخص رنگ ہے
 ہے دیدنی جو رخ چہینوں کے نور ہے جس ماہوش کو دیکھئے وہ رشک ہے
 مستانہ انکھریوں میں وہ کیف دسور ہے گویا شے میں حسن کے، خود حسن چور ہے
 ہر ایک ناز میں ہے بسنتی لباس میں
 نے جیسے زعفران کی بھری ہو گلابیں

جوان سندیلوی، مئی لال

۱۸۸۹ء میں سندیلہ (ضلع ہرودنی) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد گلاب داس شاہ تجارت پیشہ تھے۔ مئی لال نے بمشکل آٹھویں درجے تک تعلیم پائی تھی کہ اس کے بعد اپنے والد کے بیروں کے کاروبار میں ملوث ہونے لگے۔ جب والد نے نقل مکان کر کے کھنوا میں سکونت اختیار کر لی، تو یہ بھی ان کے ساتھ چلے گئے۔ اس کے بعد نجی طور پر اردو اور فارسی میں کچھ بہارستا پیدا کر لی تھی۔

انھوں نے ۱۹۰۶ء میں شعر کہنا شروع کیا۔ شروع میں میر تقی میر سندیلوی سے مشورہ کرتے رہے اور ان کے انتقال کے بعد انور حسین آرزو کھنوی (ف: اپریل ۱۹۵۱ء) کے حلقہ تلامذہ میں شامل ہو گئے۔ یہ تعلقی محض حسن اتفاق سے پیدا ہو گیا۔ سندیلوی فنی فضل رسول واسطی سندیلوی کا سالانہ عرس بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ ایک مجلس مشاعرہ بھی منعقد ہوتی، جس میں شریکیت کے لیے دور دور سے شاعر حضرات بلائے جاتے۔ ایک سالہ میں شیدا نور حسین آرزو بھی آئے۔ شاعر کے اختتام پر شیدا انعامات رسول ہاشمی تعلقہ اوسے ان کا تلخذا اختیار کیا اور انھیں اپنے پاس روک لیا۔ اس کے بعد آرزو متواتر گیارہ برس تک ہاشمی صاحب کے اوسے وابستہ رہے۔ سندیلہ میں ان کے قیام کے زمانے میں یہاں کے بہت اصحاب نے ان سے اصلاح لینا شروع کی۔ ان میں جوان بھی تھے۔ ۱۹۲۰ء میں شیدا انعامات رسول ہاشمی کے انتقال کے بعد آرزو سندیلہ سے نکلے اور بعض غلامان کی دعوت پر مستقلاً مکملہ میں مقیم ہو گئے۔ اس پر جوان نے بھی وہیں کی سکونت اختیار کر لی۔

تاکہ استاد سے پورے طور پر استفادہ ہو سکیں۔ سیکھنے میں بھی انھوں نے تجارت میں کو اپنی سہرا تھاک کا ذریعہ بنایا۔ وہ ۱۹۶۱ء میں کلکتے سے گھنٹو واپس آئے۔

آزاد کی زبان و بیان اور عروض سے ماہرانہ واقفیت زبانِ نودِ خاص و عام میں ان علوم میں بھی جو ان اپنے استاد کے شاگردِ رشید ثابت ہوئے۔ چنانچہ بعد کو بہت شاگردوں نے ان سے بھی فیضان حاصل کیا۔

بروز جمعہ ۲۵ جنوری ۱۹۷۳ء کو شام کے چھ بجے اپنے مکان محلہ حسن مہینج، گھنٹو میں انتقال کیا۔

جوان کی شادی شالہ بانو میں شریعتی رنج رانی سے ہوئی تھی جن کا ۱۳ اپریل ۱۹۷۰ء کو بھارمڑہ قلعہ گھنٹو میں انتقال ہوا۔ ان کے پانچ اولاد ہیں بھیس، لیکن چاندنی ان کی زندگی میں فوت ہو گئے تھے۔ ایک بیٹا شری آشد بہاری لال گپتا اپنی جہاننی یادگار بھوڑا ہے؟ یہ بولی حکومت کے محکمہ مالیات میں ملازم ہیں۔

کلام کے فنی مجموعے شائع ہو چکے ہیں؛ کلیاتِ جوان حصہ اول عرف حسین چراغاں (۱۹۶۲ء)؛ کلیاتِ جوان حصہ دوم عرف شوخ غنچ (۱۹۶۴ء)؛ کلیاتِ جوان حصہ سوم عرف چراغِ کاف (۱۹۶۶ء)؛ سوزِ دل (دس نظمیں)؛ رباعیاتِ جوان؛ خوشترنگ پھول (غالب اور آزاد کے اشعار کی تصنیف)؛ فرادہ جوابِ فرادہ (بطور شکر و تحفہ شکوہ اذ اقبال) مع غزلیات؛ رام بن باس وغیرہ۔

انھوں نے پارہ مشعلی بھی کہے تھے۔ شہادتِ امام حسین علیہ السلام؛ دردِ جِ حضرت عون و محمد؛ دردِ جِ حضرت عباس علیہ السلام؛ دردِ جِ حضرت علی اہل۔ یہ بھی شائع ہو چکے ہیں۔

تفصیلِ تعاقبات اور آئینہٴ بخور (کلکتہ ۱۹۵۸ء) اپنے شاگردوں کے لیے نثر میں بھی تھیں۔ اسی سلسلے کی ایک مختصر چیز "حضرت آزاد کی اصلا حین" (شاگردوں کے کلام پر) ہے۔ بعض چیزیں بچوں کے لیے بھی ہندی اور اردو میں شائع کی گئیں۔ آخری عمر میں مالی حالت کچھ تیز و درہم گئی، تو حکومتِ بولی نے ان کا ۶۰ روپے ماہانہ

قیس کوٹوی، نور محمد

کوٹہ دراجستان کے ایک غریب گھرانے میں ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئے۔ گھر کے حالات بہت نامتلی بخش تھے۔ ان کے والد نے جب دیکھا کہ کوٹہ میں ذرائع بسر اوقات کی بہتری کا امکان نہیں تو ہجرت کر کے موضع "بوڑادیت" چلے گئے، جو کوٹہ سے ۳۴ میل دور نسبتاً خوشحال جگہ ہے، یہی اپنے چاروں بچوں کے ساتھ کوٹہ ہی میں مقیم رہیں لیکن بد قسمتی گھات میں تھی۔ کوٹہ میں بیضہ دہائی صورت میں بھوٹ پڑا۔ اس میں قیس کی والدہ اور دو بھائی رحلت کر گئے۔ اس وقت قیس بشکل دس برس کے ہو گئے۔

اس حادثہ کی خبر بوڑادیت پہنچی، تو ان کے والد کوٹہ آئے اور بقیہ سیف خاندان کو اپنے ساتھ لے گئے۔ یہاں قیس کو ایک مقامی سرکاری ہندی اسکول میں داخل کیا گیا، جہاں انھوں نے ہندی میں کچھ سیکھ کر باقی تعلیم کر لی۔ اس کے بعد وہ ہندی میں دوپے، چوپائیاں وغیرہ کھنے لگے۔ اس زمانے میں وہ نو تخلص کرتے تھے۔ اسی زمانے میں انھوں نے اپنے طور پر اردو پڑھنے کا کچھ انتظام کر لیا۔ اسی دوران میں شادی بھی ہو گئی۔

وہ ۲۰ برس کے تھے کہ بوڑادیت سے اپنے مستطال اس کوٹہ واپس چلے آئے۔ لیکن اصلی مسئلہ وہ لگا دکا تھا، یہ نہ بوڑادیت میں ملا، نہ کوٹہ میں۔

۱۹۳۲ء میں فضل حسین شاہ کوٹوی کے حلقہ آئندہ میں شامل ہو گئے۔ ثابت الخ زبان اور صاحب فن استاد تھے۔ انھوں نے ان کا تخلص نور بدل کر قیس کر دیا۔ قیس کو ان سے مشورہ کرنے سے بہت فائدہ ہوا۔ ان کی تعلیم ناقص تھی، اور شاعری علم فن

کے بغیر ناممکن ہے۔ ثابت نے قیس کی یہ کمی پوری کرنے میں جو محنت کی، اس سے انکار ممکن نہیں۔ ۱۹۴۱ء میں ثابت کا انتقال ہو گیا، فروری ۱۹۴۲ء میں قیس نے سیاب اکبر آباد کا دامن تھاں اور ان کی وفات (جنوری ۱۹۵۱ء) تک انھیں سے وابستہ رہے۔ ان اساتذہ کی تربیت پھل لائی۔ ۲۸۔۲۹ اپریل ۱۹۶۵ء کو مقامی ارباب اُردو نے کوٹہ میں شاندار ہمارے پر جشن قیس منایا، اُردو کے مشہور و معروف شاعرین و ادیبان نے مل کر ملنے اس تقریب کی صدارت کی۔ اس موقع پر گیارہ سو روپے کی پھیلی بھی قیس کی خدمت میں پیش کی گئی تھی۔

میر و دھما رہی بدستور قائم رہی۔ اس پر راجہ جتھان۔ ماہیتیہ اکاڈمی نے ان کا وکیل مقرر کر دیا۔ یہ بھی صرف دو تین برس ملا۔

آخری قیام میں کوٹہ سے ۴۰۔۴۵ میل دور ایک مقام سکیٹ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ وہیں بروز جمعہ ۲۶ جنوری ۱۹۷۲ء (دسمبر ۱۳۹۲ھ) کو پیام مرگ آپہنچا۔ ان کے استاد بھائی مفتوں کوٹوی نے قطعہ تاریخ وفات کہا۔

ہوا ہے دل کو بہت بھر قیس کا صدرا
بھجے جو یہ خبر مرگ بہر طال ملی
شہید عشق خدا "ما غمزن" تو افسوس بھی
صفات قیس سے تاریخ انتقال ملی
(۱۳۹۴ھ) (۱۹۷۲ء)

خانگی زندگی بھی کچھ اطمینان بخش نہ تھی، بلکہ ایک مرتبہ انھوں نے اسے "نبات تلخ" کہا تھا۔ اولاد میں تین بیٹے (محمد اسحاق، نسیم احمد فیض، ریاض احمد ریاض) اور ایک بیٹی اپنی جہانی یادگار چھوڑے۔

قیس خالصاً غزل کے شاعر تھے۔ اگرچہ انھوں نے کچھ نظمیں بھی کہی ہیں، لیکن سچ یہ ہے کہ ان میں وہ کیف نہیں جو ان کی غزل کا حصہ ہے۔ انھوں نے ان کا مجموعہ کلام شائع نہیں ہوا۔ بعض رسائل میں جو کچھ طلاس کا انتخاب پیش کر دیا ہوں وہ

قیس میر کی زندگی و موت بھی، ہے اک مراب

بیتے جیتے، مرتے مرتے، ہی پریشاں ہو گیا

سجود و شوق میں دیر و حرم کے ہیں فانی در

تر ہے قسمت کہ میرا ایک سر ہے، آستلہ نو

قیام ختم ہوگا وعدہ: فردا پہل اپنا قضاے مانگھائی کو ابھی دودن تک ہے

نیشیں میں کیا تھا کہ برقی محبت گوی، اور پھر آسمان تک نہ پہنچی

ختم ہے قیس! جنوں! دخت و سودا چھوڑ کون بوجھنا مرے بعد بیا باؤں کو!

دیکھا، قیس بھی جنوں نہ کہیں سو جائیں اس کے کوچے میں پھرا کرتے ہیں دوانے سے

جدھر جاتے ہو تم اے قیس بہت جنوں سمجھتے ہیں

زرا اپنی نظر کی قدزدانی دیکھتے جاؤ

سوز غم حیات سے اپنا پستا ملا دل کیا ملا کہ محرم را نہ بقا ملا

انہما عشق بھی رہی، انجام عشق بھی رہی پہلے بھی انتظار تھا، اب بھی ہوں انتظار اس

آہیں نکلتی کبھی پھر اس گشتاں میں بہار جو حجازاں آنے سے پہلے ہی بیا یاں ہو چکا

عش و قریب ہو، تو کوئے بھرے کاٹھا تھا خوشدلگ بود، خاک نشین ہے

یہی اظہار محبت کا ہے انداز عجیب میرا دھر خاوش ہوں اور وہ دھر خاوش

نقش قدم، نقش جیس کا ہے اتیاد اب کیا بتاؤں، کون تری رنگد میں ہے

کوئے کے انوار اب بھی ہیں نگاہ حسن میں جس طرف دیکھا نظر بھر کر، چراغاں ہو گیا

نہ جانے کیا تھا مرے بعد، جیس میں تیراں

ہو تو دیکھ رہے ہیں وہ آستانے کو

لحوظ بعد مرنے کے پہنچا آنے قدموں سے یہاں بھی کا شہر مرے ساتھ محبت نادر سا ہوتا

بکھرے جاتے ہیں جب آیینہ تصویر کے ٹکڑے تو چن لیتا ہے گردوں سخن کی تنویر کے کٹے

میں جیلاں ہوں کہ نیجا کس طرح کروں سیر عقل

ادھر ہیں دل کے ٹکڑے، اور ادھر تیشہ کے ٹکڑے

یہ جن سے گزرتا ایام ہی ہے، بگڑاتی ہے دھنشاں میں خاک پر وہ مری تقدیر کے ٹکڑے

امجد خمی، محمد امجد، شیخ

کنک کے ایک اسودہ حال خاندان کے فرد تھے۔ ان کے والد محمد یوسف صاحب کا لینے زمانے کے عمارتیں شمار ہوتا تھا پہلے وہ یکے بعد دیگرے اڑیسہ کی تین ریاستوں نیلگری، ڈھکا، مال، تالچر میں نائب دوران کے عہدے پر فائز رہے۔ تالچر کے بعد ریاست پال کھڑا میں مقرر ہوئے تھے کہ ڈیڑھ ایک سال بعد فوج کا حملہ ہوا جس سے جسم کا بایاں حصہ بیکار ہو گیا، اور دو کام کاج سے محروم ہو گئے۔ بارہ برس بسترِ عیلا پر رہنے کے بعد ان کا ۱۹۲۲ء میں انتقال ہوا۔

محمد یوسف صاحب آڑیک کے علاوہ اُردو، فارسی اور انگریزی میں بھی اچھی استعداد کے مالک تھے۔ اُردو میں شعر بھی کہتے اور یوسف تخلص کرتے تھے۔ وہ داغ اور اس کے طرزِ کلام کے عاشق رہا کرتے۔ تذکرات ان کا کلام دامنِ گلچیں ”اور پیام یار“ میں چھپا رہا مجموعہ بھی ”کہت یوسف“ کے نام سے مرتب کیا تھا۔ لیکن آخری آیام کی طویل علالت اور ہجرت کے دوران میں یہ ضائع ہو گیا۔

خمی انھیں محمد یوسف کے دوسرے بیٹے تھے۔ ان کے بڑے بھائی کا نام محمد احمد تھا۔ جنہیں ۲۹ اکتوبر ۱۸۹۹ء کو کنک میں اپنے آبائی مکان (مکہ بخش بازار) میں پیدا ہوا، جو بعد کو ان کے والد کی علالت کے زمانے میں خالصے لگ گیا۔ جب سنی شعور کو پہنچے تو حسبِ معمول بڑے لاڈ چاؤ سے لسم لٹھ ہوئی۔ پھر مدرسہ اسلامیہ میں گئے اور اس کے بعد مقامی مدرسہ کیتھولک میں داخلے کیا۔

دوسرے کے امتحان کے لیے پیروی مومن اکیڈمی کنک میں داخل ہو گئے۔ اسی زمانے میں

طبیعت شعر گوئی کی طرف مائل مولیٰ غاویٰ زیادہ تر توجہ غزل پر مرکوز رہی اور اس میں اپنے حلقے کی پلٹیں مسجد کے پیش امام محمد حبیب اللہ تیسیم جیلوہی سے مشورہ کرنے کے شہر فرج میں غفلت اجمہد تھا، اب تیسیم کے کہنے پر اسے ترک کر کے نہیں دیکھ دیا۔ کوئی سال بھر بعد تیسیم نے پیش امامت چھوڑ دی اور تجارت کا پیشہ اختیار کر لیا اور اسی سلسلے میں دنگوی پہلے گئے۔ انہیں کو اقبال سے بڑی عقیدت تھی۔ وہ جانتے تھے کہ بزرگ خط و کتابت ان سے اپنے کلام پر اصلاح لیں۔ لیکن اقبال نے حسب معمول مال دیا اور دیکھا کہ سب سے بہتر استاد اساتذہ کے کلام کا مطالعہ ہے، آپ بھی یہی کریں۔ اب انہیں نے اپنا نام حیدر آباد میں دیکھ کر اپنے والد سے اصلاح لینا شروع کی۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اسی زمانے میں انہوں نے مولوی رحمت علی رحمت (والد کرامت علی کرامت، ف: ۱۹۶۳ء) سے بھی کچھ استفادہ کیا۔ بعد کو جب فارسی میں کچھ کا شوق ہوا، اس کو اس میں حافظ شمس الدین احمد منیری شمس (ف: ۱۹۷۵ء) سے مشورہ رہا، جو اس زمانے میں راجشا کا لائبریری، کتب گاہ میں قانون کے مدرس تھے۔

ان کی تعلیم متورک مکمل نہیں ہوئی تھی کہ ترک ہوا لٹ اور سرکاری اسکولوں اور کالجوں کے بائیکاٹ اور ہڑتالوں کا دور شروع ہوا۔ یہ بھی اسی دہائی میں ہو گئے اور جلسوں میں اپنی اور دوسروں کی سیاسی نظمیں منانے لگے۔ بکرے کی بان کتب تک خیر منافی، آخر گر قابل ہوئے اور جیل کی موکھا ناہنری۔ جب رہا ہوئے تو ان کے والد نے انہیں اپنے چھوٹے چھائی شیخ محمد محمود شریف کے پاس رائج بھیج دیا، جو وہاں کسی دفتر میں ہیڈ کلرک تھے۔ اس کے علاوہ ان کی پیشہ شہزادی کی دکان بھی تھی۔

۱۹۲۲ء میں رائج سے واپس آئے تو انہیں سنگ میں ریلوے کے محکمے میں ملازمت مل گئی۔ یہاں انہوں نے بزم ادب کی تشکیل کی اور اس کا تمام میں شاعر کرتے رہے۔ پھر دو کو موڈ دفتر خود مدود، جس میں تبادلہ ہو گیا، یہاں جنگ مسلم کلب، تمام کی، اور ڈرامے پیش کرنے کی طرح ڈالی۔ اس فلسفہ میں آغا شہر کا طوطی لایا تھا۔ چنانچہ پہلے انہوں نے شہر کے متعدد ڈرامے ایلیج کیے، ان میں اداکاری بھی کرتے اور کھیل میں

ہوا۔ بکاری کے خرافے بھی انجام دیتے۔ پھر خود دوائے نکلنے لگے۔ انھوں نے چار ڈواے
نکھے، دو اور انھیں ایچ بھی کیا تھا۔ یہ نصیب بادشاہ کا کیا ہوا، کشتورکانتا،
انصاف کا کوڑا ہر سب نوز غیر مطبوعہ ہیں

ریلوے کی ملازمت کے سلسلے میں ان کا قیام ۱۹۲۲ء میں گورنمنٹ ایس بی ایم بھی رہا۔ اس آج
کل گورنمنٹ ہی چھانسیا کہتے ہیں) اور ۱۹۲۶ء میں راج آٹھ گھر میں ۱۹۲۷ء میں ان کا دفتر
(کو کوٹ) آٹھ گھر منتقل ہو گیا، اور یوں وہ ڈاکٹر بن گئے۔ یہاں بھی انھوں نے
بعض اصحاب کے تعاون سے 'ہرم ادب' قائم کی جس کا نام بعد کو بدل کر 'اردو مجلس'
ہو گیا (یہ آج تک قائم ہے) وہ ۱۹۳۱ء سے ۱۹۵۴ء تک اس کے صدر رہے۔ اس مجلس
کے زیرِ اہتمام باقاعدہ مشاعرے ہوا کیے، بلکہ انھوں نے کل چند اردو کانفرنس بھی کی
ڈاکٹر کے قیام کے دوران ہی ہیں انھیں ناٹکی میں شعر کہنے کا شوق پیدا ہوا، اس نے
بھی لکھے اور نثری مضمون بھی۔ ان کا ڈاکٹر کے قیام کا زمانہ ان کی ادبی تربیت اور کثرت
و کثافت، غرض ہر پہلو سے بہت اہم ہے۔ اکتوبر ۱۹۵۴ء میں ملازمت سے انچسپریسکڈ
ہوئے، انچسپریسکڈ تھے؛ اس لیے حکومت اڑیسہ نے انھیں ۵۰ روپے ماہانہ کا ادبی وظیفہ
عطا کیا۔ اسی زمانے میں انھوں نے ٹائپ اور رائٹنگ گرائی سکھانے کا ایک اسکول جاری
کیا جس کا نام سٹی کرشیل کالج رکھا تھا۔ اس سے بھی کچھ آمدنی ہوجاتی تھی۔ تنگی ترشی
سے گروہ ہو جاتی تھی۔ لیکن اس صورت میں بھی قناعت اور خود ادبی کارہیہ عالم تھا کہ کبھی
کبھی عزیز سے مدد لینا گوارا نہ کیا۔

جیسا کہ بیان ہوا ان کی تعلیم ناقص رہ گئی تھی۔ لیکن انھوں نے محنت اور مطالعے سے اس
کمی کے پورا کرنے کی کوشش کی بعض بزرگوں کی صحبت سے بھی مدد ملی۔ مشق و مزاحمت
سے انھوں نے اپنی ترقی کر لی کہ بالآخر ان کا اردو کے قادیان کلام شاعروں میں شمار ہونے
لگا۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ وہ اس قدر اس ادیب کے مسلم اثبات استاد تھے
ان کے کلام کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں، 'طلوعِ بحرِ رنگ' ۱۹۶۱ء جو ۷۰ کہکشاں،
(دکک ۱۹۶۶ء) نظم و نثر کا بہت سراہا غیر مطبوعہ رہ گیا۔ وہ مدتوں کلکتہ کے 'ہائی ٹیچنگ'

کے مدیر بھی رہے تھے انھوں نے ۱۹۶۵ء میں جاری کیا تھا۔

انھیں ۱۹۷۱ء سے شوقِ انفس کی شکایت تھی، یہ بڑی گھلا دینے والی بیماری ہے۔ اس سے بہت نحیف و نزار ہو گئے تھے۔ ۲۱ جنوری ۱۹۷۱ء کی شب میں ایک شاعر سے واپس آتے ہوئے سردی لگ گئی۔ جاڑوں کا زائادہ دم کے مریض اور اس پر انظرِ نثر اور دردِ بحر۔ اکیس برس بعد جمعہ کیم فردی ۱۹۷۴ء میں کے ٹھیک ایک بچے داغی اجل کو بیک کہا۔ جمعہ کی نماز شروع ہونے سے پہلے عطیہ حاضرین سے ان کی صحت کے لیے درخواست کی تھی۔ اتنے میں یہ اپنے اللہ کے حضور حاضر ہو گئے، تو نماز کے بعد ان کی منفرد کی دعا کے لیے کہا گیا۔ ۱۔ اللہ ذاتا الیہ راجعون۔ جمعہ کی فیضیت سے فیضیاب ہونے کے لیے خودی تجیز و کلین کا انتظام کیا گیا، ان کے سب احباب کو اطلاع بھی نہیں دیا جاسکی۔ اس کے باوجود خانہ کے ساتھ بہت بڑا مجمع تھا قدم رسول (دو گاہ بازار) لنگ میں قبل مغرب دفن ہوئے

ان کے کئی احباب نے تاریخ وفات کہیں۔ انیس ام کے قلمے کا آخری شعر ہے

انیس کیا کہوں تاریخ پر دہ داری دوست
بڑا ستم ہے حجابِ دل و قلمس ہونا

(۱۹۷۴)

فیاض گواہی دے رہے ہیں:

ہے دعاے منفرد فیاض! تاریخ وفات
ابھیر گئی ہو جہز و شاخارِ خلد کہ

علامہ جمیل نظری کا قلم ہے:

نہی خوشنشاں! آخر مطلع کس شک
جس سے افتخار تھا بانگ کل زشتانِ ماجنوب
کہتی ہے اس کی موت پر تیرگی دیا رفت
کیجیے کہ "آہ آہ آج نیم وطن ہوا غروب"

(۱۳۹۴)

ان کی شادی اپنے منہجے حماد شیخ محمد یعقوب کی صاحبزادی (زریب النسا) سے ہوئی تھی (اولاد
میں تین بیٹے اور چار بیٹیاں ہوئیں۔ رد جھوٹے بیٹے (محمد رفیع اود محمد وسیع) ان کی
زندگی ہی میں انتقال کر گئے تھے۔ سب سے بڑے محمد رفیع اور چاروں بڑیاں (نجمہ، زینب
سیدہ، شامہ) اماں اللہ حیات ہیں۔

نومنے کے چند شعر ملاحظہ ہوں :-

تھی جنوں آگیں بہار دہری، کل رات کو
کر دی تھی آسمان سے مہری کل رات کو
بے حقیقت تھے تباہ آذری کل رات کو
ہو گیا تھا جامع سحر سامری کل رات کو
بھاگتی تھی آسمان سے شہری کل رات کو
اد و زبائن برہیں پر ہے ہری کل رات کو
لکشاں تھی صورت ہمار زری کل رات کو
بن گیا تھا آسمان ظلم پری، کل رات کو
مٹ گئی تھی میری تیرا اختر کل رات کو
صحن تھا آئینہ اسکندری کل رات کو
عین ایام بن گئی تھی کاری کل رات کو
کچھ نہ تھا "من دیگرم" آؤ دیگری کل رات کو
تھامے تھامیں چرخ چہری، کل رات کو
مے رہے تھے مجھ کو تاب قیسری کل رات کو

پایے، اس ہوش کی جلوہ گسری کل رات کو
اس کے حسن فنو فلک ہر آئی نازاں تھی زمیں
پایے، وہ قور سے تر شاہ اس کا بدن
اس کی آنکھوں میں وہ جادو، اس کی پرتو
اس کے تھے غلستاں سے لالہ سرد دامن
نقاب ز اطر پر شور و درداہم العبد
عقل انجم میں ڈھلتی تھی شراب رنگہ فود
اس کے نیلے جسم پر وہ چودھویں کا چاند
کلبہ اجڑاں مرا، تھا خیرت بزم طرب
ہو دی تھی فود کی بادشہ درد دوار پر
پایے، نازک پر تھیں سجدہ و زریاں تھک طرح
جذبہ یوں، ہیں میراں کر ہو گئے تھے سن مشق
ورگھی تھی اس کی خوردش، بھگ گئی تھی اس گل
صاف میرے کر دیا انکار دینے سے اسے

عز مجھ وہ کے یاد آئیگی، لے نہیں اچھے

میری قسمت نے جو کی تھی یادری کل رات کو

کچھ گزشتہ راحت و آرام کی باتیں کریں
آؤ، پھر گریے ہوئے ایام کی باتیں کریں

آؤ کیوں بچا نہیں کام کی باتیں کریں
یہ اگرچہ ہو کہ دوا بعیش نصفت بعیش ہے

ابتداءے عشق کی وہ سلسلہ جنبا نسیاں
 اک ذرا انحاء زلف سلسل چھڑ کر
 وہ کسی کے وعدہ جاں بخش بر بختیاں
 وہ دنور اشتیاق دید، وہ نودق نظر
 یاد تو کر لیں ذرا سنجھتیں کی دھنیں
 دمعہ رنگیں، وہ بزم کیف، وہ سرشاں
 جذبات شوق شہادت کی سنائیں مگر شفا
 اجرا کچھ کہے اپنے عشق کے آغا کا
 کس طرح ہم نے جلانی تھی یہاں سبب
 آؤ، پھر اس نامہ و پیغام کی باتیں کریں
 آؤ، پھر قید دل ناکام کی باتیں کریں
 آؤ، پھر اس انتظارِ شام کی باتیں کریں
 آؤ، پھر ان جلوہ ہائے بام کی باتیں کریں
 آؤ، پھر رنگ فریب دام کی باتیں کریں
 آؤ، پھر اس ماتی غلام کی باتیں کریں
 آؤ، پھر اس تیغ خون آشام کی باتیں کریں
 آؤ، پھر اس عشق کے انجام کی باتیں کریں
 آؤ، پھر اس آرزوے خام کی باتیں کریں

یہ جان غافل ہے، بھی بے باں کس کو شائبہ

آؤ، کچھ اپنے نمود نام کی باتیں کریں

جب دل ہی نہیں ہے چلو میں، پھر عشق کا سودا کون کرے

اب ان سے محبت کون کرے، اب ان کی تمنا کون کرے

اب بھر کے صدے پہنے کو، پھر کاکلیما کون کرے

ان بی بی راتوں کو رور کے سویرا کون کرے

ہم رسم دغا کو مانتے ہیں، آؤ اب محبت جانتے ہیں

ہم بات کی تر پہ جانتے ہیں، پھر آپ کو رسو اکون کرے

لے جذبہ الفت، تو ہی بتا، کچھ حد بھی ہے اس ناکامی کی

ایوں نگاہوں سے ان کا محفل میں نظار اکون کرے

ہم دیکھ چکے، ہاں دیکھ چکے، دستور تمھاری محفل کا

سب شکوہ یہ پابندی ہے، پھر جرات کوہ اکون

بھگدیا ہے تو بندوں کو بے باں نبھو

تو کیوں نہ عطف خالی جویر الطیف کو

ہیں ترے واسطے شیش جہاز جلوہ کیف

بے ترے واسطے نظرت بھی گرم دھن سرد

تو کہہ رہا ہے یہاں کہ جس کو جیت لا حاصل
بلند ہوئی تھی جس قدر نگاہِ لبشہر
دیکھ لکھا گئی انسان کو زہا حریف کہو
تاسے ادھ بھی ہوتے۔ جیسے غرقِ آلود
گر تو دیکھا ہے اسے کو قطرہ بے لود
جو یہ نہیں، تو سرا سر عدم ہے تیرا وجود
کہ ترے آگے یہ دنیا ہے تو ذہِ بارود
سمجھ نہا نے کو ہرگز ایسا بے محمود
دگر نہ ہے کوئی فرعون، تو کوئی نرود
ہمہ از دست، سمجھ اس کو، بجی دیا تیرا دست
سوا خدا کے یہاں، جو ہے وہ ہے لاموجود

جھکتا ہی نہ تھا پھر ایسا جھکا، نام اٹھنے کا لیتا ہی نہیں
معلوم نہیں اس کہنے کیا اس شگِ دو میں دیکھ لیا
استغاثہِ اولیٰ کی بات ہی کچھ اذہ ہے
بھڑکنا کی بزم میں اب ورجام آیا تو کیا

کیوں یہ کہتے ہو، کوئی چاہنے والا ہی نہیں

چاہنے والوں کو تم نے ابھی دیکھا ہی نہیں
جگہ ہے فرط جنوں نے ہمیں کیا رہنموا
بحال بارہیں آخر یہ لکشی کیا ہے
جہاں نہ کچھ ہو، یہ صحتِ ایں بری کیا ہے

عزیز جھالا واڑی، محمد عزیز الرحمن قریشی

ان کا خاندان ریاست جھالا داڑ کے باعزت ملازموں میں شمار ہوتا رہا ہے۔ ان کے دادا اٹلی علی بابا درنصرم کوکھی دکار خاندان جات تھے۔ ان کے بعد عزیز کے والد اٹلی علی بابا بھی دکار خاندان جات کے منصرم رہے۔ عزیز یہیں جھالا داڑ میں بسنت بھجی کے دن جبرائیل ۱۹ فروری ۱۸۸۵ء کو پیدا ہوئے۔

خاندان میں تمام سہولتیں دسترس تھیں، لہذا تعلیم مناسب طریقے پر لگ رہی ہوئی، اور اس کی تکمیل کے بعد یہ بھی ریاست کی ملازمت میں بے یے گئے۔ ترقی کونے کرتے بالآخر وہ بھی منصرم کے درجے تک پہنچے، جو انگریزی علاقے کے مکشتر کے مساوی رہا ہوگا۔ عزیز نے جھالا داڑ کے چار حکمرانوں کا ہندو حکومت دیکھا: (۱) راج رانا رام سنگھ، ان زمانے میں ان کا شایب تھا۔ (۲) ہارانا بھوانی سنگھ؛ (۳) ہارانا راجندر سنگھ۔ ان دونوں حکمرانوں کے زمانے میں عزیز معرب خاص رہے۔ (۴) راج رانا ہریش سنگھ یہاں کے آخری رئیس تھے۔ جب راجستھان کی ریاستیں جمہوریہ ہند میں ضم ہو گئیں تو ابتدائی زمانے میں رانا ہریش چندر راجستھان میں وزیر بھی رہے تھے۔ ہارانا بھوانی سنگھ خود صاحب علم اور قدردان علم و ادب تھے۔ ان کا انتقال ۱۳ اپریل ۱۹۲۹ء کو جہاز پر ہوا جب وہ علاج کے لیے لندن جا رہے تھے۔ مکش عدن میں سپرد خاک ہوئی، اور پھول جھالا داڑ آئے، جہاں بقیہ رسوم ادا ہوئیں۔ ان کے زمانے میں ادبی اور ثقافتی قسم کی تمام سرگرمیوں کا اہتمام عزیز کے قوتے ہوتا تھا۔ عزیز

کے کلام میں جو متعدد نظمیں ساگرہ کی مہاوکاوا، ہولی، اجن غسل صحت وغیرہ کے عنوان سے ملتی ہیں، وہ انھوں نے اسی عہد میں کہیں تھیں۔

ہمارا نا بھوانی سنگھ نے بھوانی ناٹھ شالہ، ایک ادارہ قائم کیا تھا، جہاں ڈرامے اور ناٹک اور اسی طرح کی دوسری تفریحی اور کھیل تقاریر منعقد ہوتی تھیں۔ یہاں اس کے بہتم بھی عزیز ہی تھے۔ ان تقریبوں میں داخلہ بہت محدود ہوتا تھا۔ ان کے جانشین ہمارا ناراجند سنگھ کے تودہ صاحب خاص اور ہر وقت کے ندیم حاضر باش تھے۔ ہمارا ناراجند سنگھ شعر بھی کہتے، اور محمود تخلص کرتے تھے۔ عزیز جب چمکے پرستے تھے، تو ان دونوں حکمرانوں کے عہد کے قہقہے بیان کرتے اور ان کی علم پروردی اور ادب نوادی کے واقعات شایا کرتے تھے؛ وہ ان دونوں کے ہمیشہ مداح رہے۔

عزیز کے کئی زمانے کے ایک استاد قاضی قطب الدین تھے۔ وہ کبھی کبھی نعت کہتے تھے۔ انھیں کی دیکھا دیگھی عزیز کو کبھی شرگوئی کا شوق پیدا ہوا۔ وہ شعر کہنے لگے۔ لیکن قاضی صاحب بوضوح سے کبھی اس کا ذکر نہیں کیا۔ سب سے پہلے انھوں نے حکیم عبدالقادر شوق سے اصلاح لی اور انھیں کے کہنے پر شاعرے میں اپنا کلام سنایا۔ یہ سلسلہ کافی دن تک رہا۔ بعد کو عزیز درباری شاعر خراب قنار الشیرا مولوی عبدالوحید نرنگ کا کوردی کے شاگرد ہو گئے۔ یہ تلمذ انھوں نے ہمارا نا بھوانی سنگھ کے ایسا پر اختیار کیا تھا۔ نرنگ خود مٹی عبدالجید سحر (ابن غلام ساحر علوی) کے بیٹے اور مشہور نعت گو مولوی محمد حسن کا کوردی (ف: ۱۹۰۵ء) کے شاگرد تھے۔ نرنگ ۲۷ ستمبر ۱۸۵۶ء کو کوردی میں پیدا ہوئے تھے۔ راجستھان میں اردو کے فروغ میں ان کی خدمت بہت قابل قدر رہی۔ بہت ذہین اور طبائع آدمی تھے۔ ملائکہ کی کثیر تعداد نے ان سے کسب فرمایا۔

عزیز قدیم وضع کے بہت اچھے سننگو تھے۔ ان کا کوئی مجموعہ حین حیات شائع نہیں ہوا۔ دو دیوان غیر مطبوعہ موجود ہیں۔ ایک میں غزلیات ہیں؛ دوسرے میں رباعیات، قطعات

نظریں وغیرہ ۔

عزیز بہت وضعدارانہ دکھ دکھاؤ کے آدمی تھے۔ مثلاً گھر سے کبھی شہر والی کے بغیر باہر نہیں نکلے۔ پان کی ڈبیہ اور بٹوہ ہمیشہ ساتھ رہتا۔ آخر تک پرانی وضع کا قلمدان استعمال کیا اور نزع کے قلم سے نکلتے رہے۔ وہاں نواز اور دوسرے چشم آدمی تھے۔ لیکن بہت محتاط زندگی بسر کی ہمیشہ اپنی آمدنی اور خرچ کا حساب رکھتے۔ باغبانی کا شوق تھا۔ بھالاداسے باہر سات آٹھ میل دور دیکھتے کے مقام پر ان کا باغیچہ آج بھی موجود ہے۔ اپنے شہر کے مکان میں بھی ایک بھلاواری لگا رکھی تھی۔

ان کا بدھ ۶ فروری ۱۹۷۳ء (۱۲ محرم ۱۳۹۴ھ) کو انتقال ہوا۔ ۸۹ برس کی عمر پائی۔ بیوی سے والہانہ محبت تھی۔ ان کا پانچ چھ سال قبل انتقال ہو گیا اور وہ کچھ سے غمے، اس کے بعد عزیز نے متعدد نظموں میں ان سے اپنی شیغلی اور جدائی پر رنج و غم کا اظہار کیا۔ دہلوی کے (ڈاکٹر محفوظ الرحمن اور محبوب الرحمان) اور دو لڑکیاں یاد کا دھجورہ سب اشعار اٹھا اپنے اپنے گھر بار والے، بلکہ بیٹوں، پوتوں والے اور خوش و خرم ہیں۔

مفتوں کو قوی نے تاریخ وفات کہی :

کرمگن ذیر و ذہر بر زم خیاں	اطلاع انتقال پڑ ملا
وہ عزیمت خوشنوا درخصت ہوا	تھے جو بزم دوتاں میں خوش مقام
جنت الفردوس ان کو ہونصیب	مغفرت فرمائے رب ذوالجلال
ہے یہ مفتوں ان کی تاریخ وفات	ترب سحباں "اگیا نیکس خیال"

(۲۲۳ + ۹۷۱ : ۱۳۹۴)

انہوں نے ان کے کلام کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا۔ رسائل میں بھی زیادہ نہیں ملتا کیونکہ انہیں اپنی درباری مصروفیتوں سے اتنی فرصت ہی کہاں تھی کہ اسے چھپنے کے لیے بھیجتے۔ چند شعر بعض رسائل سے لیے گئے ہیں جو ہدیہ ناظرین ہیں :

تری نظر سے نظر مل گئی ہے کیا میری بلا ہی ہے اشاد سے اب قضا میری

عزیز! مرد روزہ کئے نہ راحت سے تو پھر بقایاں ہے یہ بھی کوئی بقا میرا!

ہاں کا جس طرح سے کرے میزبان لفظ ہے لطف اسی طرح سے کرے یہاں لفظ

بگولوں سے تھی دشت بجز میں امید مجھوں کو کاب لیلیٰ کا چہرہ بردہ محل سے نکلیگا
ہیں وہ لطف بزم یاد حاصل ہو کر جیتے جی محفل دل سے نکلیگا بردہ محل سے نکلیگا

ساتھ لایا نہ کہ وغیرہ کو تم محفل میں روز اک روز یہ جھگڑا اس محفل ہو گا

تری تصدیق بری آنکھوں میں ہر دم پھرتی کچھ عجب لطف ترا دردمجدانی دیتا

دل میں رہ رہ کے یادِ مرثاں ہے بسلام ہیں در دیہہ سہم میں

جب قلمزلفت اُڑا یا شبِ معراج

محبوب کو خاقانی نے بلا یا شبِ معراج

قدسی بھی کہتے تھے، عجب شانِ خدا ہے

یکس کا قدم عرش پہ آیا شبِ معراج

مستم کا ایک بند

حضرت یوسف دیمقوب و سہجہ مریم

حضرت الیاس تھے خوش اسوا، آدم

ہو دو ایوب تھے اموی بھی تھے شاد و خرم

لوط و اویس خوشی سے نئے بھل گئے سہم

انیا سب ہی کہتے تھے خوشی سے سہم

خوش پر آئیے محبوبِ خدا آج کی دنیا

ہجور شمس، سید عبدالقیوم

ضلع روتھاس (دہراد) کے تاریخی شہر سہرام کے رہنے والے تھے جسے شیر شاہ سوہی
کامقسط الراس ہونے کا فخر حاصل ہے۔ ملازمت کی اسناد کے مطابق وہیں ۱۸ اپریل
۱۹۱۵ء کو پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد ”مولوی“ محمد ادیس (ف: ۱۹۳۸ء تا ۱۹۳۹ء)
ریلوے پولیس میں داروغہ تھے۔

ابتدائی تعلیم مدرسہ خانقاہ کبیرہ، سہرام میں ہوئی؛ ثانوی مدرسہ حنفیہ، آرمہ
اور اعلیٰ کی تکمیل مدرسہ شمس اہدیٰ، پٹنہ میں کی یہ مدرسہ شمس اہدیٰ کا تعلق ہی تھا
جس کے باعث بعد کو شرگوئی کے زمانے میں انھوں نے اپنے تخلص ”ہجور“ کے ساتھ
شمس کا اضافہ کیا؛ بلکہ بعض خرواں میں تو انھوں نے ”شمس“ بطور تخلص بھی
استعمال کیا ہے۔

آخر میں پٹنہ یونیورسٹی سے صرف اردو کے مضمون میں امتحان مے کر لی مے کی سند
حاصل کر لی تھی۔ اس کے بعد مدرسہ کا پیشہ اختیار کر لیا۔ ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۸ء
تک ضلع اسکول، گیامپن تارسی اور اردو پڑھاتے رہے۔ اوائل ۱۹۴۸ء میں پلاٹو
ضلع اسکول، ڈالٹن گینج میں تبادلہ ہو گیا؛ بقیہ ملازمت کا سارا زمانہ یہیں گزرا،
اور یہیں سے اوائل ۱۹۷۳ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ اس کے بعد
مشکل سے ہدیہ بھر گورادھوگا کر تجدید ۸ فروری ۱۹۷۴ء کو دایم اجل کو لبیک کہا۔
فنا دم کا عارضہ پرانا تھا، لیکن موت حرکت بطلب بند ہو جانے سے ہوئی قیمت

کی تمام نظریاتی دیکھیے کہ اکی دن پلامون نٹ رائج کیندران کے امور اذ میں شب غزل سنانے والا تھا کہ بعد نماز جمعہ عین بجے سر پہر کو اچانک قلب کا دورہ پڑا اور آنا نانا جان بحق ہو گئے۔ "جنش غزل" مجلس عزائیں تبدیل ہو گیا۔ وہ ہزاروں بارغ اسکول کے نگران مقرر ہوئے تھے۔ سالانہ بندہ چکا تھا، اور دو تین دن بعد روانگی ملے تھے کہ سفر آخرت پیش آگیا۔ فاعتر یا ادلی اہل ہمار۔ ڈالٹن تینج کے قبرستان میں آخری آدا نگاہ نصیب ہوئی۔ ان کے شاعر و محیب نشر نے تاویج بھی :

حضرت بہور رخصت ہو گئے مرد کامل، صاحب فیاض لغو
روح دل پر کیوں نہ پھر ہر شخص کے "شاعر شیریں سخن کا نام ہو"

(۱۹۷۴ء)

بہت کم عمری میں شعر و سخن کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ کلام پر مختلف اوقات میں سیما ابکر آبادی (ف: جنوری ۱۹۵۱ء) ساغر نظامی (ولادت : دسمبر ۱۹۰۵ء) اور آرزو سکھونی (ف: اپریل ۱۹۵۱ء) سے مشورہ کرتے رہے۔ اگرچہ دوسری اصناف میں بھی کلام موجود ہے، لیکن دراصل غزل کے شاعر تھے، اور وہ بھی روایتی رنگ کے نقوش گلو ہونے کے باعث شاعروں میں بہت مقبول تھے۔ ان کی زندگی ہی میں ان کے شاگردوں نے "بزم بہبود" کے نام سے ایک انجمن قلم کی تھی۔ یہ آج بھی حتی المقدور اردو کی خدمت کو رہی ہے۔ اس کی طرف سے ان کے شاگردوں کا تذکرہ "نقوش بہبود" رچینہ ۱۹۷۵ء بھی چھپ چکا ہے۔

دو مجموعے : مردہ ساز (ڈالٹن تینج ۱۹۶۶ء) اور نوے راز (گیا ۱۹۷۳ء) ان کی زندگی میں شائع ہوئے تھے۔ دو اور مجموعے (گل آفر و کلام بہور) بھی مرتب تھے لیکن شائع نہیں ہوئے۔

اپنی عمر میں دو نکاح کیے۔ پہلی شادی سہسرح میں ہوئی۔ ان سے دو بیٹے ہوئے : ایک رفو کا محمد محمد ام اور بیٹی نرہت جاں۔ دونوں بچے فوت ہو گئے اور بیوی کا بھی انتقال ہو گیا۔ دوسری بیوی سے دو بیٹیاں زندہ ہیں۔

چشمہ کلام ہے مضمون آفرینی کی کوشش ہر ایک شعر سے ظاہر ہے۔ اگرچہ وہ کلاسیکی انداز کے سنواریں، لیکن انھوں نے جدید رنگ سے اجتناب کیا: ہمید ہیئت کو قائم رکھتے ہوئے عصر حاضر کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کی سعی کرتے ہیں۔ چند شعر ملاحظہ ہوں :

ہر چند دیکھتا ہوں بیاں بامِ دہ نہیں آگے چلے جنوں ہر اصغر ابھی گھر نہیں
خونِ دلِ نوحی چکرِ نوحی نظرِ سب بگھٹتے ہر ایک روتا آئے، میر کا روتاں بجا گھیا
برآشاں سے سینے تلے جہیں کو پیام پھل گھیا مرے سجدوں میں کس کا نام ابھی
یہ کیا جشنِ ربائی ہے، کیسے آزادی جانِ فکرِ نظر میں کر ہیں قلام ابھی
یہ کیا خبر تھی کہ دستِ وحشت لباسِ سستی پر جا پڑیگا

کچھ ایسے عالم میں ہوں کہ اکثر خیال آتا ہے پر میر کا
کچھ غم نہیں پہنچا رہا پتا نہیں کوئی معلوم ہے کیسے کا ہر حال خدا سے
دہو جو عشق، تو ڈرے میں آدمی ات چلے جو ہو، تو دستِ کوئین میں ساند کے
پھیلا ہی تری جفا کا قصہ بات ابھی گئی فری و فدا کی
کہنے کو ہے تبدلے الفت اس میں بھی تڑپ ہے انتہا کی
پہنچا روتا کا نام نکلا اللہ نے دندگ عطا کی
صبح نہ آیا، شام نہ آیا آج بھی کچھ پیام نہ آیا
ہفت آغاسی محبت پیشِ نظر انجام نہ آیا
سکوتِ افادہ جستجو کا، سکوتِ انجام گفتگو کا

حدودِ آدابِ بندگی میرا سکھاتا ہے، حکمران

نہ وہ رشکِ طلعت جو رہے، نہ جوابِ جلوہ طور ہے

گر ایک بات ضرور ہے، کوئی بات اُس میں ضرور ہے
یہ غار بھی ہیں متاعِ بادِ گل ہی نہیں نگاہِ چاہیے اسرارِ گلستاں کے لیے
جہاں جھکا کے لئے اور پایاں نہ کر جہیں کہ وہ تھک بھی کر ایک آخان کے لیے

دہر دانِ رحیم کی منزل ہے وہی — آپ کے گھر سے چلے، آپ کا گھر تک پہنچے
اب شکایتیں بجا، گردشِ مسئل کی — اس زمین پر خود ہم سے آسمان بجائیں
تو رہے رنگ پھر کا ترسے خونِ اکوڑ دے

مرے شادمانوں نے تری لطف کو سنو ادا
ہنر تمام ہوا تو زندگی بھی ہو نہیں سکتی — خدائی کرنے والے کر گئے، اہل ہنر ہو کر
جہد کے سیکھ لے، وقت کے طبعوں سے — زندگی کے اردوں کو موت کی دوا دی ہے
سوچا سمجھا کر، سیر چن کر — بھول گیا، تاریخ کا پتھر؟
پھر لیتا ہے ہاتھ میں ساغر! — بھول گیا، تاریخ کا پتھر؟

آپ کی بزم میں مستی سے دغہ ہی نہیں — وہ بھی ہیں، جو رُخِ دوا سے ہو گئے ہیں
خوش نصیبانِ کرم تھے کہ ملی جا بجا — ہم بھی اک سایہ دیا اسے جو گدہ ہے
تو کچھ اسے زندہ ہے، حق رہز کلام — وہ سادہ دل ہیں کہ مرنے ہیں گنگو کے لیے
اہلِ دل سے زندہ ہے، ہم نا صید سالی — درد کیا تعلق ہے ہر کو آستانے سے!
شرابِ دانشِ حاضر کی سرستی اسے تو بہا — نظر تک روشنی پہنچی، دونوں تک ترگ آئی
کچھ تو اہلِ وحشت کا حوصلہ ٹرھانا تھا — تم کو اک تبسم سے ایموں حجاب آتا ہے

الوداد منوہر سہاسی، ڈاکٹر

داغ کے مشہور شاگردوں میں پروفیسر نراین پرشاد ہرگواہیاری کا بھی شمار ہوتا ہے۔ قوم کے سکینہ کا ستھ تھے، قومی لقب و داء تھا جس زمانے میں بیاں دل کے مضافات لادراشاہدوں کے زمانے میں ایک مختصر کاؤسٹھول نام تھا، ان کا خاندان وہیں کا رہنے والا تھا، ان لیے یہ لوگ منحوس کہلاتے تھے۔

خاندان مغلیہ کے عروج کے زمانے میں ان کے بزرگ شاہی ملازم تھے۔ چنانچہ ان کے پوراٹا واسے پرائگ و اس اکبر کے عہد میں دیوان ہونات کے عہدے پر فائز تھے۔ محمد شاہ کے عہد تک ملازمت کا پلسلہ قائم رہا۔ جب سلطنت مغلیہ پر زوال آیا، تو اس خاندان کا شیرازہ بھی بکھرا اور یہ لوگ تلاش معاش میں یوپی کے مختلف شہروں میں منتشر ہو گئے۔ کچھ جا کے سہسوانی ضلع ہالیون کا واکبر آباد میں بس گئے، کچھ سرکارا دودھ اور حکومت انگریزی کے دامن سے وابستہ ہو گئے۔ ہر کے والد ششی کھیا لال بھی خبر دودھ گا میں سرگرداں تھے۔ ان کے خسر ششی چھپ لال ہریٹوی، اس وقت ہالیون کی کلگری میں ملازم تھے۔ بخدو کی افراتفری شروع ہوئی تو وہ اپنے مرشد چندت ہرنا تھ، نائب دیوان ریاست گوایار کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور بعد کوال کی واسطت سے وہاں مفت مالوہ میں اسٹا کے عہدے پر ممکن ہو گئے، ششی چھپ لال کے پائو جم گئے، تو انھوں نے اپنے دادا ششی کھیا لال کو بھی اپنے پاس بلایا، اور اپنے آخر سے انھیں ریاست گوایار کے ضلع شیل گڑھ (موجودہ عہد پریش) کی تحصیلداری دوا دی۔ اس کے بعد خاندان نے

یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ چنانچہ زائے پرشاد ۱۸۶۷ء میں کابل گڑھ میں پیدا ہوئے۔

اپنے خاندان کی روایت کے مطابق ہر کی تعلیم بھی فارسی اور عربی سے شروع ہوئی۔ پھر انڈیا یونیورسٹی کے تحت بریلی کالج سے دسویں درجہ کا امتحان اول درجے میں پاس کیا۔ برہمنی سے دور و شقیقہ کے مستقل عارضے کے باعث آگے تعلیم جاری رکھنے سے معذور رہے۔ لہذا انگریزی ٹیچر اسکول، گوالیار (پڑائی آبادی) میں مدرسہ اختیار کر لی مختلف جگہوں پر ملازمت کرنے کے بعد ۱۹۱۱ء تا ۱۹۱۲ء میں عارضی طور پر کنگز فیر مردہ شہادی، گوالیار کے نجی تعاون (پرنسپل اسسٹنٹ) مقرر ہو گئے۔ یہاں کی خدمات کے جلد میں کچھ انعام بھی ملا تھا۔ اس دفتر سے فارغ ہوئے تو ریاست کا سب سے معزز اسکول، وکٹوریہ کالج، ای اسکول میں اونچے درجوں کے پڑھانے پر مقرر ہو گئے۔ یہ اسکول ۱۹۲۵ء تک رہا۔ اس اثنا میں عارضی طور پر غالباً ۱۹۳۴ء میں پروفیسر حسن خان ثاقب کے انتقال پر انیس وکٹوریہ کالج، گوالیار میں انسٹرکٹر بن گئے۔ اس کے درجوں کو فارسی پڑھانے کا موقع ملا تھا۔ اسی باعث ان کے نام کے ساتھ پروفیسر کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ وہ بالآخر ۱۹۳۵ء میں محکمہ تعلیم کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ اس کے بعد زیادہ وقت مذہبی مطالعے میں گزرا۔

ہر کو شاہی کا شوق ۱۶۔ ۱۷ برس کی عمر میں ہوا۔ ضیاء امروہوی کی وساطت سے دہلی کی شاہروی اختیار کی، جو ان دنوں دایمور میں مقیم تھے۔ ہر کا دیوان (شعاع ہیر) ان کی زندگی میں چھپ گیا تھا۔ (مطبع محمدی، بمبئی، ۱۹۳۷ء) اس کے علاوہ بعض اور کتب

بھی موجود ہیں! اور دنیا بان ہند۔ یہ انگریزی کتاب (Prophets of India) کا ترجمہ ہے۔ اسے انجمن ترقی اُردو نے شائع کیا تھا؛ (۲) سفید جلی، معاشرتی ناول ہے؛ (۳) انگریزی! یہ چھ مضامین کا مجموعہ ہے؛ (۴) دیہر مضمون نگار ہی؛ دوسری کتاب ہے۔ اس نے ایک کتاب عبادیات ہیر بھی مرتب کی تھی۔ اس میں اُردو کے عبادات و دیف فار جمع کر کے ان پر بحث کی تھی۔ یہ ان کی زندگی میں نہیں چھپ سکی تھی۔ نہ جانے، اس کا نسخہ

بھی قبل مجھے یوسف زلیخا بجائی کے ابتدائی تین مشغلات زبانی حفظ کرادیے گئے تھے جب حرف شناس ہو گئے، تو گلستان سعدی سے لہجہ اشدہ پڑی پھر بوستان آڈوہی ابتدائی اور درمیانی کتابیں اسی طرح گھر پڑھیں۔ نانانا اور پرنانا ان کے استاد تھے پرنانہ کی وفات کے بعد نانانے اکیلے پوری قوت پر اور دوسو ذی سے نو اسے کی تعلیم کی نگرانی جاری رکھی۔

۱۹۱۱ء میں انور باقاعدہ اسکول بھیجے گئے۔ ان کی استعداد کے پیش نظر براہ راست ساتویں درجے میں داخلہ ملا۔ اسکول میں اردو اور انگریزی پڑھتے، اور گھر پر فارسی بہر حال فارسی کا درس ۱۳-۱۴ برس کی عمر تک ملا۔ اس وقت ہم انھوں نے فارسی کا بشیر کلاسیکی ادب ختم کر لیا تھا، اور اس سے مزید کد واقعاً ضرورت بھی نہیں تھی خصوصاً جب کہ اس سے اسکول کی تعلیم میں بھی حرج ہونے لگا تھا۔ لیکن یہ فارسی کی وسیع ذات بعد کے زمانے میں ان کے بہت کام آئی۔

۱۹۱۴ء میں اسکول سے فارغ ہوئے، تو نانانے اپنے احمد سوخ سے نہیں ریاست نونک کے ٹکڑے پائیس میں ملازمت، دواویا یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہاں انھوں نے جوانی کی ترنگ میں کسی موقع پر ریاست کے نظم و نسق کے بارے میں کچھ اعتراض کر دیے۔ اس زمانے میں اسی باتیں اور وہ بھی دہی ریاستوں میں بغاوت سے کم تصور نہیں کی جاتی تھیں۔ چنانچہ ۱۹۱۹ء میں بیکہ مینی دو گوش ملازمت سے برطرف کر دیے گئے۔ اس اثنا میں (۱۹۱۶ء) میں نانانا کا بھی انتقال ہو چکا تھا! جان کے حاجی اور سر پرست تھے۔ چونکہ اندیشہ تھا کہ مبادا ریاست نونک ان کے خلاف کوئی مقدمہ قائم کر دے، یہ اپنے والد کے پاس گوا لیار چلے آئے۔ انور کی والدہ کے انتقال کے بعد مہرنے دوسری شادی کر لی تھی۔ یہ خاتون بھی سہو ان کی تھیں۔ ان سے مہرنے چار بچے پیدا ہوئے۔ ایک بیٹی (برنارانی) اور تین بیٹے: جبری پرشاد سٹھوے (ولادت ۱۹۰۲ء) جگتا تھو پرشاد سٹھوے (ولادت ۱۹۰۵ء) اور سورج پرشاد سٹھوے پلیٹی انفر ضلع دتیا (ولادت ۱۹۱۶ء) تینوں بھائی بلفصلہ زندہ موجود ہیں (۱۹۷۷ء)

اور کو یہاں گویا راکا کا حول داس نہ آیا، اس لیے انھوں نے چندے بعد پھر رنجب سفر باندھا۔ ایک لاکھ پینچے اور رنجب محبوب عالم دفائی ۱۹۳۳ء کے شہر ریہہ اخبار میں مترجم کی حیثیت سے ملازم ہو گئے۔

اس زمانے کا لاہور صحیح معنوں میں اردو علم و ادب اور صحافت کا گہوارہ تھا۔ انور نے محسوس کیا کہ یہاں کے علمی حلقوں میں برابری کی سطح پر باوقار مقام حاصل کرنے کے لیے اشد ضرورت ہے کہ نہ صرف اپنی تعلیم کی تکمیل کریں بلکہ ریونیو رسی کی سند حاصل کریں۔ فائنل کی بنیاد اور وہ بھی خاص مقصود پہلے سے موجود تھی، انھوں نے دفتر رفتہ ایم اے اور ایم اے اول کی سند حاصل کر لیں۔ وہ غالباً واحد سندستانی تھے، جنھیں تعلیم ملک کے بددینی ۱۹۵۷ء میں پنجاب ریونیو رسی لاہور سے اپنے مقالے (انگریزی) : سرائے الدین علی خان آرزو، جیسا کہ تصانیف پر پی ایچ ڈی کی سند ملی۔

دعلاہور کے شاعر دل میں شریک ہوتے، شہر کی گونا گون ادبی سرگرمیوں میں حصہ لیتے اور مختلف اوقات میں بعض رسائل و جرائد کے دفتر میں بھی کام کرتے رہے۔ چندتہائی سے، دی کائنات، لاہور میں فارسی اور اردو کے مدرس (ریکٹر) بھی رہے تھے۔ اس طرح جہاں ان کا حلقہ احباب وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ وہیں وہ کئی ایسے اصحاب اثر و رسوخ سے بھی متعارف ہو گئے جو ان کے امداد اور فائز کے فاضل کی حیثیت سے معترف تھے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ لاہور میں جہاں اس وقت ان دونوں زبانوں کے عالمان اور استادوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ یہاں سرفضل حسین دفائی جولائی ۱۹۳۶ء ملے انھیں اپنے بیٹے میاں مطہر حسین دفائی، اسی کو امداد اور چودھری مرثیہ شہاب الدین نے اپنے مبتلی میاں ممتاز محمد خان دلدادا کو فائز پر جانے کے لیے مقرر کیا، یہ دونوں اس وقت ہی اسے کے طالب علم تھے۔

۱۹۳۵ء میں سر سکندر جیاح خان کے مشورہ سے انھوں نے پنجاب کے محکمہ تعلیم میں ملازمت قبول کر لی۔ اس زمانے میں سر شہاب الدین پنجاب کی مجلس وائٹ فرائز کے صدر تھے۔ ۱۹۳۷ء میں انھوں نے اور صاحب کو مجلس میں مترجم مقرر کر دیا، تین رات تک دعا ہوئی۔

کام کرتے رہے، بعد ۲۱ سالہ ملازمت کے بعد ۱۹۵۵ء میں سپرنٹنڈنٹ سائیکس کے عہدے سے سب سے پہلے ریٹائر ہوئے۔ ان کی تعلیمی صلاحیتوں کے پیش نظر اس کے بعد وہ پنجاب یونیورسٹی کیمپ کاؤج، نئی دہلی میں شعبہ اُردو، فارسی، عربی کے صدر بن گئے۔

صحت وقت سے خراب چلی آرہی تھی، نظرِ آدم (بائی بالیڈ پریش) کی شکایت تھی۔ مارچ ۱۹۷۲ء میں پہلی مرتبہ دل کا دورہ پڑا، بارے، دواؤں سے حالت کچھ سدھ گئی۔ خود ہی ۱۹۷۴ء میں دوسری مرتبہ بیمار ہوئے۔ ایک پھر چند دن اسپتال میں رہنے کے بعد کچھ فائدہ ہو گیا اور وہ مکان پر آ گئے۔ یہیں ۱۵ فروری کو طبیعت یکایک پھنسا، بو گئی، اور ۱۷ فروری بعد ۱۷ فروری ۱۹۷۴ء کو دیر کے وقت روحِ تعالیٰ منبری سے پردا کر گئی، اسی شام پورے نویں صید خاکی نذرِ آتش کر دیا گیا۔

ان کی پہلی شادی ٹوبہ کے شہر زنگی لال کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ یہ خاتون ایک بڑی اپنی یادگار چھوڑ کر ۳ مئی ۱۹۳۳ء کو وحلت کر گئیں۔ اس کے بعد دوسری شادی مارچ ۱۹۳۶ء میں شہرِ برج بون لال کی صاحبزادی شریستی جاندانی سے ہوئی۔ شہرِ صاحب مصروف میں پوری کے رہنے والے اور دیا ست چند میں تحصیلدار تھے، اور ان دنوں مگرہ میں تعینات تھے۔ ان کے بطن سے ماشاء اللہ پانچ بچے ہوئے: چار بیٹے اور ایک بیٹی۔ بفضلِ وہ خود بھی موجود ہیں اور سب اولاد بھی خوش و خرم ہے (۱۹۷۷ء)۔ ان کے شہر گوی بہت کم عمری میں شروع کی۔ اپنے گروہ پیش کے تقاضے سے ان کا سب سے پہلا شعر فارسی میں تھا:

چیزے ز حدیث تو بقرآن نفروم

کفرے کر بہت، بایساں نفروم

پھر اسی ذلے میں اُردو میں بھی کہنے لگے، تو کہا،

جواب نامہ کھا دو سٹے، لیکن خفا ہو کر

نویہ زندگی آئی ہے پیغامِ قضا ہو کر

ان کے نام کو منہم ہوا۔ تو فرمایا کہ فارسی کلام میں خود دیکھو گا، لیکن اُردو کلام اصلاً

کے لیے مولانا حالی کے پاس بھیج دو۔ مرقوم کہتے تھے کہ خانی نے مشک و دین غریب دیکھی ہوگی۔ پھر لکھا کہ ”مقدمہ شاعر“ کو بغور بادباد پڑھیے، اس سے خلاق سخن بھی دست ہوگا اور زبان و بیان کے حسن و قبح کی تریز بھی بدلا ہوگی۔ انیسویں صدی کا مہم جو کلام ان کی زندگی میں شائع نہیں ہو سکا۔ یوں بھی تقسیمِ ملک کا سارا کلام ضائع ہو گیا۔ یہ وہیں لاہور میں رہ گیا تھا۔ بعد کے کام میں سے آگے چل کر ادب و شعر کا انتخاب کیا تھا اور اس کی اشاعت کی فکر میں تھے کہ موت کا بلا دا اٹھ گیا۔

انھوں نے متعدد انگریزی کتابوں کے ترجمے بھی کیے تھے؛ یہ البتہ چھپ چکے ہیں بعض صائل میں شائع شدہ کچھ غزلوں سے چند شعروں کا کلام کے طور پر درج کر رہے ہیں۔ ان کو پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ شاعر دل سے کہیں دماغ سے کہہ رہے ہیں:

دہ کہتے ہیں کہی پر رے صدا کیوں دے کوئی

سمجھنے کے لیے اتنا اشارہ کم نہیں ہوتا

مگر کچھ کو طاقت، کوئی اپنے آپ سے نہ

گفتا رکنِ دلِ غم در غم نہیں ہوتا

بارِ جلوہ دار سے عبتِ نوب ہے شور و

جنوں شورِ سماں کا کوئی موسم نہیں ہوتا

غلامِ انگلی مری تبصرِ خوابِ آؤں سے آخر تک
دیں دیتا ہے جو شہِ اضطرابِ لب سے آخر تک
پند اور دلِ شکست کا سماں ہے آجکل
لیکن یہاں تو کفر ہی ایسا ہے آجکل
سب راؤ گدشِ دوراں ہے آجکل
وہ جو چاہیں کریں، بیجا ہی کیا ہے!
ہمارا آپ کا جھگڑا ہی کیا ہے!

وہ آئینے، انہیں کسے خط آئیگا، جس کا
محبت کی سکون نا آشنائی کم نہیں ہوتی
یادش بخیر، زاہدِ مزا میں کے لیے
گو کفر ہے پرستشِ خود بان خود پرست
دورانِ عیش و گدشِ ساغر، خوش نصیب
روایا نادر، ہوتا ہی کیا ہے!
جھگڑے میں بھی ہے اک لطف اور نہ

عسمِ اردو نہ ہی میں عمر گزری
وہ نہیں دیتے ہیں، میری بات سن کر
"ہنٹ" ہے ہر مری سی اک نظر بھی
"دو عالم کے رنے" ہیں یکدم سے میں
مرے اردو کا فردا ہی کیا ہے
نہ جو یہ بات، تو رونا ہی کیا ہے
یہ تھوڑا سا کرم "تھوڑا ہی کیا ہے
یہاں جنت بھی ہے، دنیا ہی کیا ہے

کرم ان کا امید افزا نہیں ہے
ہمارے پاس جب جوتے نہیں وہ
ادھر بھی کچھ نہ کچھ، ہے بیکراہی
کبھی جوتا، کبھی جوتا نہیں ہے
کوئی ان کے سوا جوتا نہیں ہے
مگر کچھ اس طرح، گویا نہیں ہے

لکھا نہیں نگاہ ملانے سے ڈر مجھے
دن تک سزاوارک اُمید سے گئی
نہ دستِ انتھاری عنایت کا شکر
دم بھر کو میری گزشتہ تقدیر گئی
اس رشک ہر دماہ کی زحمت گئی
میں خود کو ناز دہست کیوں بجز نمونہ؟
افو! اگرچہ عشق بہت کی نیاہ کی
مگ جائے، اے خدا! بتوں کی نظر مجھے
گھر ہی میں پیش آگئے کتنے سفر مجھے
کب تھے نصیب رنج و اہم، اس قدر مجھے
جب اک گئے وہ خاکِ بستر دیکھ کر مجھے
لگتا ہے اس کے نور سے معمور گھر مجھے
کیا کم ہے یہ فکر کہ نہیں کچھ خبر مجھے
پھر بھی بنا بنے کا نہ آیا ہنر مجھے

کس بوڈے گزارد ہاتھ انھیں خیال
خوش فہم کر دیا تری الفت اس قدر
مرد مرد کے دیکھتے تھے سر و گزر مجھے
آرام کا گمان ہے آزار پر مجھے

انظر، احمد الدین (اے، ڈی انظر)

سیالکوٹ (پاکستان) کے تاریخی شہر سے دس بارہ کلومیٹر دور ایک چھوٹا سا گاؤں ہے ڈگرا احمد نام۔ یہاں زمانہ قدیم سے کہاؤں کے بہت خاندان آباد ہیں (یا کم از کم۔۔۔ جس کو دھڑک تھے)؛ اسی لیے بغل اوقات اسے کوٹلی کہاواں بھی کہتے ہیں۔ حریر ۱۹۰۰ میں انکا گاؤں میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد کی تعلیم سے بہرہ ور نہیں تھے۔ لیکن اُن کے دن کا مشاہدہ ہے کہ بعض اوقات بالکل اُن پرچہ آدمی بھی علماء و فضلاء کی صحبت میں رہتے رہتے نہ صرف خود علمی اور دینی مسائل سے واقف ہو جاتا ہے، بلکہ اس میں زیادہ علم حاصل کرنے کی اور اپنی اولاد کو بھی تعلیم دلانے کی خواہش پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی صورت حال یہاں بھی پیش آئی۔

احمد الدین کی تعلیم کا آغاز محاذ کی مسجد سے ہوا کیونکہ یہاں کوئی مکتب نہ تھا، نہ انکو مسجد میں بھلا تعلیم کیا ہوتی؛ پیش امام صاحب کے نماز یاد کروادی۔ وضو اور طہارت کی کچھ ابتدائی باتیں بتا دیں۔ اور پھر ناظرہ قرآن پڑھانے لگے۔ البتہ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ وہ اُدو کے اتنے حرف شناس ہو گئے کہ جلد ہی اُدو درسم الخط میں بھی ہوئی پنجابی زبان کے منظوم قصے اور سی حرفیاں روایتی سے پڑھے لگے۔ اُن کے والد نے دیکھا کہ لڑکا ہونیا رہے۔ ڈگرا احمد سے چند کوس دور ایک دوسرے گاؤں میں ڈسٹرکٹ بورڈ کا برائری مدرسہ تھا؛ انھوں نے احمد الدین کو وہاں بھیج دیا۔ یہ اسی مکتب کے پہلے طالب علم تھے؛ جو کسی مدرسے میں داخل ہوئے؛ احوال کے بیضر اصحاب نے ان کا نام "احمد دین" رکھا ہے؛ ٹھیک اور پورا نام "احمد الدین" تھا۔

نے برائے فہم کے چاروں درجے کو مکمل کر لیا، لیکن اس کے بعد خدا معلوم کیا افتاد
پڑی کہ بھاگ نکلے۔ ڈیڑھ دو سال تک کھانا کھا کر چاروں میں تھکتے سناتے اور بہر پرستے
پھرتے پھر اپنے معصہ دل کے ساتھ کیل کے دو میں مصروف رہے۔ ان کے والدوں
میں سے کہہ جاتے کہ بیٹا کس راہ پر چل نکلا ہے۔ لیکن آدمی تھے بڑا بارادرسمجہ دار
انہوں نے ڈانٹ ڈپٹ کی جگہ نفسیاتی علاج کا راستہ اختیار کیا۔ ایک مرتبہ ان کا
کسی کام سے سیالکوٹ جانا ہوا۔ وہاں ہی پرہیز کے لیے گلستان سعدی اور عربی کی
کتاب تصوف اور کتاب انہو کا ایک ایک نسخہ لیتے آئے۔ احمد الدین بھانسی گئے
کہ والد کی کیا تمنا ہے۔ میں پھر کیا تھا۔ پڑھنے لکھنے میں محنت گئے؛ اور دم اس
وقت لیا، جب مرنے کاغ سیا لکھ سے لی اس کی سند لگی۔

انکول اور کانال میں ریاضی اور عربی ان کے خاص مضمون تھے۔ تعلیمی شاغل کے علاوہ
لڑنا بھڑنا اور اپنے احباب کے جھگڑاؤں میں ان کے لیے ہر موقع پر سینہ سپر ہو جانا
ان کا مزہ امتیاز تھا۔ اسی لیے اپنے بیشکلف دوستوں کے حلقے میں وہ جوئیل کے لقب
سے مشہور تھے (اور اس عرف سے وہ آخر تک پکارا رہے گئے)

مرنے کاغ سیا لکھ کی تعلیم کے زمانے میں انہوں نے شمس العلماء مولانا سید میر حسن (رحمہ
رف: خمر ۱۹۲۶ء) سے بھی استفادہ کیا تھا، جن کا نام علامہ اقبال (رحمہ: اپریل ۱۹۳۸ء)
کی سوانح عمری میں بہت نمایاں ہے۔

تعلیم کی تکمیل کے بعد اولاً چند سہ ماہی کا خفہ رہا۔ چونکہ ریاضی اور حساب کتاب سے
شفقت تھا، اس لیے انڈین اوٹ اینڈ اکاؤنٹ سرورس کے امتحان مقابلہ میں بیٹھا اور
کامیاب ہو گئے۔ اس کے بعد سب سے پہلا تقریر راولپنڈی کے لٹری اکاؤنٹس کے دفتر
میں ہوا۔ راولپنڈی کے زمانہ اقامت کا ایک لطیفہ قابل ذکر ہے:

شہر میں مسلمانوں کا خا صا ثرا جلسہ منعقد ہوا، جس میں تعلیمی، معاشی اور سماجی مسائل پر
غلف اصحاب نے تقریریں کیں۔ غفلے کی صلیت اپنی جوانی کے باوجود، (طرح صاحب
کے حلقے میں آئی۔ ایک پرانی وضع کے مقرر کی جو شامت آئی، انہوں نے اپنی تقریر

میں مختلف حاعتوں کی مجلسیں اذبحیسی براعتراض کرنا شروع کر دیے اور چونکہ خود عربی کے عالم تھے، جہاں تہاں اپنی جلالت کا سنگ جمانے کے لیے عربی کے حلقے اور انجاس بھی تفضیل کرتے گئے۔ انظر مقررہ کے لیے اذرا خاصہ از علماء کی تنک سے سخت منغض ہوئے۔ جب جلسے کے استقام پر وہ صدارتی تقریر کرنے کو گئے، تو انھوں نے موصوفہ کو آستہ تھوں لیا اور ان کی عربی دلی کی دھجیاں بکھیر دیں۔ انھوں نے جو عربی فقرے کہے تھے، اقباس سنائے تھے، ان میں صرف دھجی غلطیوں کی فنانذری کی اور یہاں کہ اگر دوسروں نے ملی تعلیم کی طرف سے غفلت برتی ہے، تو آپ نے جو تعلیم پائی ہے، اسی میں کوئسا سرخاب کا پڑ حاصل کر لیا۔

اس کے بعد تو شہر میں اظہر کی دھاک بیٹھ گئی۔ جدھر ٹیگٹا ناٹکیاں ٹھیس کر دیکھو یہ انگریز باس میں سوٹ بوٹ پہنے، اخر عربی کا اتنا بڑا عالم ہے کہ اس نے فلاں مولوی کی تقریر کی ہر سر جلسہ غلطیاں نکالیں۔

ماد لیسٹری سے تبدیلی ہوئی اور یہ حکم مسطند کے پہلائی اور ریلوے کے محکموں میں ڈپٹی سائنل میشر کے عہدے پر مقرر ہو کر رہ گئے۔ یہاں ان کی علمی اور ادبی سرگرمیاں المفاعف ہو گئیں۔ جب ملک تقیم ہوا ہے، تو یہ آٹریلیا میں سندتان کے ٹوڈ کسٹر دمنوب تھادی ہلی شیشیت سے شدائی میں مقیم تھے۔ انھوں نے اپنی خدمات حکومت پاکستان کو پیش کر دیں اور وہیں اس کے لیے سندب تھادی بنا دیے گئے۔ وہاں سے ۱۹۴۹ء میں وطن واپس آئے جو پہلے شہر پاکستان میں تعینات ہوئے، قیام جائگام میں رہا تھا۔ جن سال ۱۹۵۲ء میں حکومت پنجاب میں سکرٹال اور پھر عربی حکومت پاکستان میں جاسٹ سکرٹر مقرر ہوئے، جس کے آخر ۱۹۵۴ء میں پاکستان کے سفارتخانہ لندن میں میشر مایاات، وزیر اقتصادیات مقرر ہو کر لندن گئے۔ وہاں سے ۱۹۵۸ء میں کراچی آئے اور جلد بعد ہی یہاں ملازمت سے پیش پر سکد ویش ہو گئے۔ اس کے بعد کراچی کی ایک تھادی فرم ڈین اینڈ دیبر کے میٹنگ ڈائریکٹر مقرر ہو گئے تھے۔

بچپن کا ابتدائی زمانہ چھوڑ کر صحت ہمیشہ قابل رشک حد تک اچھی رہی۔ لیکن زندگی کی بے اختیار ایسوں نے کہیں کا نہ چھوڑا۔ عارضہ قلب کا پہلا حملہ سن ۱۹۵۹ء میں ہوا۔ بارہ علاج معالجے سے بچ نکلے۔ لیکن دل کی بیماری ایسی ہے کہ اگر اس میں پوری احتیاط نہ کی جائے، تو یہ بد بخت کام تمام ہی کر کے پھینچا چھوڑتی ہے۔ اپنی فطرتی لذت آوارگی اور لامبالیاؤں کے طویل اظہار سے یہ احتیاط ہر دسک ادب بالکل اسی میں ہوا، فردی ۱۹۷۴ء کو کراچی میں جان بحق ہو گئے۔ کراچی کے فوجیوں کے قبرستان میں آخری آرامگاہ نصیب ہوئی۔

اپنی عربی فادری کی تعلیم کی بدولت تہذیبوں اور زبان تحقیق کی طرف راہ۔ اس لئے میں انھوں نے بعض بلند پایہ علمی مضامین قلمبند کیے، جو مختلف مسائل میں بکھرے ہوئے ہیں۔ انھیں جمع کر دینے کی ضرورت ہے۔ لیکن بنیادی طور پر ان کا حراج دہان پر درادشا عرانت تھا۔ رہی سہی کسر ان کی عیش کوشی اور تن پردی نے پوری کر دی۔ ان کے کلام میں ان کے تعلقات حسن و عشق کی بعض تلکات موجود ہیں، جن سے واقفان حال بخیر نہیں۔ کلام کا مختصر مجموعہ "لذت آوارگی" ان کی زندگی میں پھینچا تھا (لاہور ۱۹۶۱ء) اس میں سب اصناف سخن کا کلام موجود ہے۔ اس کے بعد کلام بھی چھپ جانا چاہیے، تاکہ ضائع ہونے سے محفوظ رہے۔

عربی فادری کے بعد ان کا دوسرا موضوع مطالعہ مذہبیات تھا، اور اس میں بھی اسلام اور عیسائیت کا تقابلی مطالعہ عیسائیت پر ان کی بڑی گہری نظر تھی۔ اس کے مضامین سے کوئی شبہ نہیں کہ عیسائی سرگرمیوں اور دسیسہ کاریوں تک اس کی تاریخ کا کوئی گوشہ ان سے مخفی نہیں تھا۔ وہ جانتے تھے کہ ان اسلام کو ان کے ہر رنگ زمین و آسمان کی موجودگی اور اس کے دور رس نتائج سے خبردار ہوں۔ اسی مقصد سے انھوں نے

انگریزی میں ایک کتاب لکھنا شروع کی تھی: Christianity in History: خدا معلوم، وہ اسے مکمل کر سکے یا نہیں؟ اور اس کا مسودہ کہاں ہے؟ بڑے کلام کی چیز تھی!

نمود کے چند شعر دیکھیے :

اک تری ہے دخی سے دوست ! کہنے چوں بھی گئے
پھول میں رنگ ڈ بہاں ! جاندیں چاندنی کہاں !
حسن کی ساکھ عارضہ لطف ہی سے بیاں نہیں
لاکھ حسیں جاں میں ہوں تیری سی دہری کہاں !
تم نے تو جیسے عمر ہی بھر کی شب میں ڈھال دی
میری کبھی سنی کہاں ! اپنی کبھی کبھی کہاں !

چھوڑے جاتے ہو جسے دیرانہ پھر اسی دل میں بائٹے تھیں
کاش ! وہ بھی تو کہیں مجھ سے کبھی دودھ جاؤ ، تو سناٹے تھیں
ری عاشقی ہے اثر تری دہری نے بھی کیا کیا
دہی میں دہی ، دہی بیدی ، دہی رنگ یلہ ہمارے
نہیں خوب کچھ ، نہیں زشت کچھ ، نہ نگاہ ، نہ دل ، نہ نام
کبھی ہے چین کا چن خزاں ، کبھی ایک گل ہی ہمارے
ہے محبت بھی عجب کھیل کر آس باڑی میں
لطف سے ہے کبھی لذت ، کبھی دشنام سے ہے
راہِ الفت میں اک ایسا بھی مقام آتا ہے
کہ جہاں کام نہ آغاز ، نہ انجام سے ہے
میں وہ عشق میں پہنچا ہوں وہاں اب کہ جہاں
عاجز و الخود اپنے دل کا کام سے ہے

تھا جس پنہا کبھی اب وہ آلودہ دہی نیا دِ عشق کی پہلی سی آبرو دہی
تو ایک بار تو آؤں پھر میں تمنا کے مگر چہ اب وہ تمنا کی آبرو دہی
نہیں اپنا ہے پھر ہرق و باد سے سرشار نہی بیا د بھی کیا سا زکا و گز دی ہے
میں اپنے دعوئی الفت سے آج باز آیا گز گئی ہے ، مگر ترسا دگر دی ہے

وہ کہتے ہیں: اگر تجھ کو جفا راحت نہیں ملتی
تو الفت چھوڑ دے، اس رنگ سے الفت نہیں ملتی
اک دیا بھی مقام آتا ہے راہ عشق میں ظہر
جہاں انجام ہنی کے لیے فرصت نہیں ہوتی

اس سے تو ہمیں انکار نہیں دنیا کا ساکھ کرم سے ہے
لیکن اس اہل دنیا میں خود ساکھ کرم کی قسم سے ہے
تم حسن میں لاشائی ہو، تو کیا! سب چیز ہے ملک عشق میں
جس حسن کی شان دھاتے ہو، اس حسن کی آن تو ہم سے ہو
جب آس ہی ٹوٹ گئی اپنی پھر کون کرے گا شکوے اگلے!
اس کھیل کا سارا نطف ترے اکر نطف و کرم کے گلے سے
ہم دور نہ بات خستے ہیں تم دنیا ہمیں جھاتے ہو
تم دنیا والے کیا جانو، یہ دنیا دل کے دم سے ہے
اک عالم جب ہم دیکھ آئے، جب جا کے ہیں معلوم ہوا
سب رونق اپنے دم سے ہے، عالم کا عالم ہم سے ہے
ہم جن پر ہر دم مرتے ہیں وہ ہم کو دیکھ کے دوتے ہیں
ہے یہ بھی پیادہ کی صورت اس حسن کی شان ہی کرم سے ہے
تقدیر محبت علم ہی سہی تسلیم ہمیں، لیکن، افسوس
اس علم پر ہر او خوشی قربان، یہ غم ہے، تو سب کچھ غم سے ہے

انہ کو متحدہ مزاج کو بھی چیز معمولی قدرت حاصل تھی۔ بلکہ زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ ان کی
طبیعت کثیفگی اور جدت پسندی اور بزرگ بینی کے باوجود جوہر ان کے دکا ہی کلام ہی میں
کھلتے ہیں۔ ان کے مجموعہ کلام میں کئی منتظبات اس دوسری قبیل کی بھی ملتی ہیں۔ بخوشی
کے طور پر ایک نظم دیکھیے جس کا عنوان ہے: ایک وزیر کی دوسری شادی پر۔ یہاں
میں انشا کہ مشہور غزل کا نتیجہ کیا گیا ہے:

کراچی میں کمر باندھے ہوئے سب یاد رکھتے ہیں
 جو بیاد ہے جا چکا اک بار، پھر تیار بیٹھے ہیں
 جسے دیکھو، وہی ہے دوسری بیوی کے چکر میں
 غنیمت ہے، نو قد جو یہاں دو جا رہے ہیں
 یہ چھڑا ہے شیخ، ہم دینے بھلے چلے، لگا دینا
 تھے تو بیاں سو بھی ہیں، ہم بزار بیٹھے ہیں
 دکر لیں چار جب تک شیخ جی کیوں مگے لینے
 وہ دکر کے بھی کہتے ہیں کہ ہم بیکار بیٹھے ہیں
 کہاں اب چین گھر کا، رہے بیوی دوسری آئی
 "نظر آیا جہاں پر سایہ دیوار، بیٹھے ہیں"
 بلاے ناگہانی ہے، ہوا اب زرد جہاں ثانی
 جو بیوی جیت کر اٹھے، وزارت ہاں بیٹھی ہیں
 بھلا آؤ اکی لاشیں چین دیتی ہے کسے، انظر!
 بھی شوہر یہاں بھینیس بنے، الا چار۔ بیٹھے ہیں

ساگر نکو دری، بلونت گمار

جناب کے ضلع جالندھر میں ایک مختصر تحصیل نکو در ہے، وہیں کے رہنے والے تھے۔
 تاریخ ولادت ۲۲ دسمبر ۱۹۱۳ء ہے۔ ان کے والد مراد دلال نکو در منڈی میں چھٹا ہوتا
 کام کرتے تھے، چونکہ گھر کے حالات تسلی بخش نہیں تھے، اس لیے بلونت گمار کی تعلیم
 غاظر خواہ نہ ہو سکی؛ بیشکل برائری کے درجے پورے کر سکے۔

جوش بنجیالا کسی نہ کسی طرح گھر ہی سادی کا کام سمجھ لیا اور ماسی کو بسا وقت کا
 ذریعہ بنایا۔ اس سلسلے میں مختلف شہروں میں قیام رہا۔ جب ۱۹۳۰ء میں جہاتما گاندھی
 نے نلک ستیہ گرہ شروع کیا، تو یہ بھی میدان میں کود پڑے، پکڑے گئے اور جیل پہنچے۔
 یہ تجربہ بعد کو بھی دو ایک مرتبہ ہوا۔

جیل خانے کے زمانے میں انھیں دہاں کے کتابخانے سے استفادے کا موقع ملا، جس
 سے استعداد میں معتد بہ اضافہ ہوا۔ اب انھیں شعر گوئی کا شوق تجرایا سدا ہوئے
 تو اپنے بڑے میں روشن لال روشن نکو دری کی خدمت میں جانے لگے۔ ان سے شوق
 کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں شعر کے حسن و قبح کی تمیز ہونے لگی۔ اس پر روشن نے انھیں

اپنے استاد حضرت جوش لمبیانی (ف: جنوری ۱۹۷۶ء) کے حوالے کر دیا؛ یہ ۱۹۳۷ء
 کی بات ہے۔ جوش صاحب کے حلقہ تلمذ میں داخل ہونے کے بعد انھوں نے پھر
 کوئی اور ذریعہ نہیں دیکھا اور آخر تک انھیں کے دامن سے وابستہ رہے۔ انھیں
 جوش صاحب کے طویل استفادے کا موقع ملا۔ شاعری کے علاوہ جوش صاحب کے
 دہشوق اور تھے؛ حقاۃً بشرط پنج ساگر جب ان کی خدمت میں ہوتے، تو حقہ تازہ

کرنے کی خدمت اکثر ان کے حصے میں آتی۔ خود ایک شعر میں کہا ہے۔

مری آتش بیانی کیوں نہ پائے داد لے ساغر

بھری ہیں میں نے چلیں جوش سے کانِ خندگی

۲۵ فروری ۱۹۷۳ء کو حلق کے کینسر سے جان بحق ہوئے۔ اولادِ جسمانی سے کوئی نام نہ نہ آیا۔
اپنی یادگار نہیں چھوڑا۔

اُردو ادبِ ہندی دونوں زبانوں میں متعدد کلام موجود ہے۔ خورائے اور افانے بھی لکھے، ہندی میں رامین ڈراما کی شکل میں "زیلا" کے نام سے لکھی تھی، ہنگولکنا نامک بھی ہندی میں ہے۔ ایک سوشل ڈراما "سودا" نام کا بھی موجود ہے۔ انھیں کر جاتا کی ہمداد گاری کے باعث ان کی زندگی میں کوئی چیز شائع نہ ہو سکی۔ اُردو کلام کا انتخاب "مدح و مذمہ" عنوان سے ان کی خدمات کے بعد شائع ہوا (یکو دور ۱۹۷۳ء)۔ کلام بے عیب ہے جس کی حضرت جوش لسیا نے کسی شاگرد سے توقع ہو سکتی ہے، لیکن اس میں کوئی نمایاں خصوصیت نہیں پائی جاتی۔

چند شعر ملاحظہ ہوں:-

دنیا میں خوشی سے وہ بشر رہ نہیں سکتا دنیا کے جو آواز دستم بہ نہیں سکتا

جس کو نہیں کوئی بھی غم، اس کی ہے غمِ مرگ آرام سے دنیا میں کوئی وہ نہیں سکتا

مجھ کی سمجھانے سے باز آتا نہیں کیوں کوئی تاصح کہ سمجھا نہیں

زندہ سے کیا نسبت الے تاصح کتے وہ بہک جاتا ہے، بہکتا نہیں

کس سے پوچھیں حالِ یارانِ غم جو وہاں جاتا ہے وہ آتا نہیں

اب مصیبت سے غم ہے، نہ ہے شکلِ خون موت نے آکے دیا خوب سہارا بھر کو

چاہے سا ذولِ مضطر ہے ہی، الے تاصح! کس طرح ترکِ محبت ہو گوارا بھر کو

خود بھی کی تو جھکی ہی رہا وہ محبتیں مگر وہ لو آگے جھکی، تو وہ، منزل پہ جاگ

محبت باعثِ آرامِ جاں معلوم ہوتی تھی مگر اب باعثِ آزار کیوں ہے، ہم نہیں سمجھ

ذوقِ نظر میں ہے، اوسب کچھ جلیں ہے جب یہ نہیں، تو کوئی بھی موتِ حیات نہیں

جینا تے بغیر، تو زمانا تے حضور
آسان بھی نہیں مجھے دشوار بھی نہیں
میر جو محبت میں اگر جذبہ کمال
دکھ درد کو غم دعوں منزل منبر ہوتا
یہ آواز تھی کہ ہم شرح آواز کرتے
ذہان نہ چلتی، تو آنکھوں سے گفتگو کرتے
ہمیں قول و فعل کی موت بھی محبت میں
حیات کے لیے کیا خاک آواز کرتے
اس سے بھی آگے ہے کچھ منزل جہیں شوق کی

کعبہ ہی کافی نہیں ہے سر جھکانے کے لیے
دارِ لالہ، خونِ لیل، رنگِ گلِ نورِ شفق

نظر ہے، ہے جہن جہن جہاں ہے
نظر خیال آتی ہیں اک دل کے غلے کے لیے
یہ کم ہے کیا کہ ان سے ملاقات ہو گئی
ایسے میں آئینا زدہ جان بے آگیا
ہے تنہا ہی پہ موقوف مدارِ بستی
دلِ بدہ بات کرتے سرد نگہ آگیا
کچھ سستی، کچھ نشہ، کچھ شراب
نظر ہے ان کے پاؤں، سکت زبان میں
میری آنکھوں میں کھٹکتا ہے جن، تیرے بغیر

ہر گلی تر بجھے کا فاسا نظر آتا ہے
کیا کھلے مری قیمت میں، خدا خیر کرے

چہرہ اُترا ہوا قاصد کا نظر آتا ہے
آپ کرتے ہیں جو منہ پھیر کے اُترا ہوا
اس میں بھی صورتِ انکا نظر آتی ہے
موت کے ایک ہی جھونکے سے یہ گر حبا نیگی

زندگی ریت کی دیوار نظر آتی ہے
چوٹیں بھی سو طرح کی کھاتا چول
صدے بھی شبِ غم کے اٹھاتا چول
تنگن شیشے سے بھی آواز کرتے ہے
اک ٹھیس لگے، تو ٹوٹ جاتا ہے دل
حالِ دامن کی، اور مستقبل کی
رہتی ہے خبر اسے ہر اک منزل کی

دنیا کے خیالات کا مرکز دل ہے دنیا سے مگر جدا ہے دنیا دل کی
 آجائیکے جس وقت اجل کیا ہو گا! اس خدشہ بھیل کا حل کیا ہو گا!
 تو آج کی رات کو تو غم میں نہ بدل ناداں! کسے معلوم ہے کل کیا ہو گا!
 جب غنچہ سرشاخ چنگ جاتا ہے کاشا ساجنت کا کھٹک جاتا ہے
 جو دل پہ گزرتی ہے اندھ پو پھول ساگر! مفقود سردار لٹک جاتا ہے
 بدنام کی صحبت کا ہے انجام برا چوری سے بھی چوری کا ہے انجام برا
 یہ قول بھی کیا خوب ہے، داناؤں کا فرماتے ہیں: جدا چھا ہے بزمِ بُرا

محمود احمد عباسی، امروہوی

ان کے خاندان کا سلسلہ بواسطہ خلیفہ عباسی (بغداد) امین الرشید (خلفہ ہارونی) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباسؓ بن عبد المطلب تک پہنچتا ہے۔ خلیفہ امین الرشید (۸۰۹-۱۸۱۲) حضرت عباسؓ سے نوے پشتوں میں تھے جب ۱۲۵۸ء میں ہلاکو خان نے بغداد کو تاراج کیا اور آخری خلیفہ ابنی عباس متعصم بنند کو تہ تیغ کر دیا، تو اس خاندان کے اکثر اشخاص جان اور ناموس بچانے کی خاطر ترک دکن پر مجبور ہوئے۔ انھیں خلیفہ امین سے دسویں پشت میں مخدوم زادہ محمود یوسف بھی تھے، وہ ہندستان چلے آئے۔ یہ سلطان غیاث الدین بلبن کا عہد حکومت تھا۔ سلطان نے ان کی خاندانی عظمت اور علمی حیثیت کے پیش نظر انھیں بل تھوں بل تھو بیا، اور شاہان شان منصب اور عہدہ عطا کیا۔ یہ خاندان ایک صدی تک اہم و آسائش سے دکن میں مقیم رہا تھا کہ اپنے میں قبر خداوندی امیر تیمور کی شکل میں نازل ہوا۔ اب مخدوم زادہ محمد یوسف سے چوتھی پشت میں مولانا شمس الدین بیان سے نکل کر پنجاب چلے گئے اور زندگی کے بقیہ ایام انھوں نے وہیں بسر کیے۔ ان کے پوتے مولانا دکن الدین عباسی (ابن مولانا نظام الدین) سلطان سکندر لودی کے عہد میں پنجاب سے نقل مکان کر کے امروہہ آئے۔ عباسیان امروہہ انھیں مولانا دکن الدین کے اخلاف ہیں

مولانا دکن الدین کی نوے پشت میں مولانا تیر احمد علی شاہ عباسی پھلپلی صدی کے صاحبِ صورت و سیرتِ خرد گتھے۔ شہرہ سے خاندانی جاہ و خردت سے کناہ کش

اور یاد اللہ میں مشغول رہے۔ اگرچہ باقاعدہ حضرت حافظ موسیٰ چشتی قادری انجوری سے بیعت تھے، لیکن دوسرے سلاسل طریقت مثلاً صابریہ، سہروردیہ اور نقشبندیہ میں بھی خلافت و اجازت سے سرفراز ہوئے۔ تمام وقت مطالعہ کتب دینیہ میں صرف ہوتا یا عبادت الہی میں۔ پیر کے دن ۲۹ شوال ۱۲۹۷ھ (۳ اکتوبر ۱۸۸۰ء) کو اکیاسی سال کی عمر میں انتقال کیا۔ اردو میں شاہ علاؤل کی درگاہ میں، بلکہ انھیں کے پہلو میں دفن ہوئے۔

یہ احمد علی شاہ کے اکلوتے فرزند سید علی محمد عباسی ۱۲۴۷ھ (۱۸۳۱-۱۸۴۲ء) میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے دینی تعلیم اور درس نظامیہ کی تکمیل مختلف اساتذہ صے کی پھر حکومت انگریزی میں لازم ہو گئے۔ اسی اثنا میں وکالت کا امتحان پاس کر کے اسے بطور ویشہ اختیار کر لیا۔ پہلے مختلف مقامات پر کام کیا، لیکن بالآخر اردو میں مقیم ہو گئے۔ ان کا کاشہر کے اکابر میں شمار ہوتا تھا۔ یہیں ۱۸۹۷ء میں رحلت کی اور اپنے والد کے پہلو میں جو اب حضرت شاہ علاؤل میں دفن ہوئے۔

سید علی محمد عباسی نے اپنے زندگی میں دو نکاح کیے۔ پہلی بیوی سے دو بیٹیاں اور چار بیٹے ہوئے۔ سب کے نام کھنیا طوالت سے خالی نہیں۔ البتہ دو قابل ذکر ہیں: سب سے بڑے محمد داؤد عباسی جو کسی زمانے میں علی گڑھ میں طالب علم تھے اور جن کا حالی کے بعض اشعار کی تفسیر کے سلسلے میں بہت لوگوں نے ذکر کیا ہے، انھیں سید علی محمد عباسی کی پہلی بیوی کے بطن سے تھے۔ ۲۰۵۵ رمضان ۱۳۸۰ھ (۲۹ فروری ۱۸۶۳ء) کو اردو میں پیدا ہوئے۔ ان کا بھائی سید تپ دیتی ۲۷ جون کو فتح آباد علی گڑھ میں انتقال ہوا؛ اور وہیں احاطہ عید گاہ میں دفن ہوئے (ختمہ ایجاد بدو ۲) میں دونوں نام انھیں غلط ہیں)۔ ان کی شہزادی ”لکھن داؤدی“ محمد احمد عباسی نے شائع کی تھی۔ محمد داؤد کے چھوٹے بھائی حکیم نریمان محمد عباسی کا اپنے جد کے مشہور طبیبوں میں شمار تھا۔ وہ تینوں طبیبہ کا، دلی کے پرنسپل بھی رہے۔

سید علی محمد عباسی کی دوسری بیوی شیخ غلام محمد مدنی کی صاحبزادی (ضیاء النساء)

تھیں۔ ان بگم سے ایک میٹھی اور عمارتی ہوئے۔ محمود احمد عباسی بیٹوں میں سب سے بڑے تھے یہ گویا محمود اور عباسی ترکہ و ائندہ کے علاقائی بھائی تھے۔ وہ مشکل کے دن ۱۳ جمادی الثانی ۱۲۰۲ھ (۲۱ مارچ ۱۸۸۵ء) بوقت صبح امرورہ میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی سے ۵۰ اپنے نانا شیخ غلام محمد صدیقی کے زیر اثر آگئے، جو ان کے والد ہی کے ساتھ میغم تھے۔ ۱۵۰ انھیں ادویہ اللہ کے واقعات سناتے، اگر کسی درویش کی طافا یا بزرگ کی زیارت کو جاتے، تو انھیں ساتھ لے جاتے۔ اس سے ان کے دل میں تاریخ ادویہ اور تصوف کا شوق پیدا ہوا، جس سے گویا بعد کے زمانے کے مطالعے کا رخ متعین ہو گیا۔

تعلیم کا فائدہ آیا تو اردو سہائی اسکول میں داخلہ ملا۔ یہیں زیر تعلیم تھے کہ ۱۸۹۷ء میں والد کا انتقال ہو گیا۔ اب یہ اپنے دو سرے علاقائی بھائی ڈاکٹر محمد حسن عباسی کے پاس آتا اور رائے بریلی میں رہنے لگے۔ والد میڈیکل اسکرپشن کی حیثیت سے تعینات تھے۔ دو سو روپے تک تعلیم بھی دہاں پائی۔ اس کے بعد کھنڈوکان میں بھیج دیے گئے۔ وہاں یکایک افتاء نگاہ سے باہر ایک ذاتی مکان میں رہتے تھے۔ اور وہی ان کی تعلیم سے بے فوٹی کا باعث ثابت ہوا۔ نواب قادر الملک مولوی مشتاق حسین اردو ہو کر ان کو والد کے دوست بنے۔ اگرچہ انھوں نے کھنڈوکان میں اپنے ایک ممتاز دوست کو ان کے حالات کی خبر لائی اور تعلیمی رہنمائی پر متغیر کر دیا تھا، لیکن یہ صاحب اپنا فرض بوجہ احسن بجا نہ لے۔ غرض محمود احمد عباسی کی تعلیم نامکمل رہ گئی، لیکن ان نگران صاحب کی بدولت ان کا شہر کے متعدد اوسوں اور اکابر سے تعارف ہو گیا۔ انھیں میں شہل اور شہر بھی تھے، تعلیمی زمانے میں اگر کسی کو مجلس آرائی اور حکام پروردی کا چمکا ہٹ جائے، تو تعلیم کے لیے آمد سے زیادہ جہاک اور کوئی پُر نہیں ہو سکتی۔

مولانا شبلی اور شمس کے ذریعہ اٹھارہ کا زیادہ وقت تادمِ سخن و سیر کی کتابوں اور سیاسی بارے
قوی لٹریچر، رسائل و جرائد کے مطالعے میں صرف ہونے لگا، اور وہ نصاب کی نظر سے

پے پروا ہو گئے۔ چنانچہ امتحان میں بار بار ناکام رہے، اور سیاحت میں روز بروز زیادہ غور کرنے لگے۔

لکھنؤ میں مزید قیام بیکار بھی تھا اور ذریعہ معاش کے فقدان کے باعث تکلیف دہ بھی۔ چنانچہ مسلم اسکول، بریلی میں مدرس ہو کر چلے گئے۔ اتفاق سے یہی وہ زمانہ ہے جب مولانا حالی اپنے رگی کے رخصت فدا سے عبدالولی کے علاج کے لیے یہاں مقیم تھے۔ جس طرح قیام لکھنؤ کے زمانے میں ہشہلی اور شہر نے عمود احمد عباسی کی حوصلہ افزائی کی تھی، اسی طرح حالی بھی اسی کے علمی ذوق اور ادبی رجحان کو دیکھتے ہوئے، ان سے لطف و عنایت سے پیش آئے عباسی صاحب نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا، ان کے فضول نگاہی کا حقوق و اصل ان کی اسی حالی سے ملاقات کا مریہوں منت تھا۔ یوں رسمی تعلیم کا جو سلسلہ منقطع ہو گیا تھا، اس نقصان کی بھی کچھ ملائی ہو گئی۔

حالی ان سے بہت شفقت سے پیش آئے رہے۔ وہ دنوں میں خط و کتابت کا سلسلہ بھی تھا (جبکہ مکتوبات حالی میں شائع شدہ خطوط سے ظاہر ہے) مگر آخر کار انہیں کی سفاک شہ پر عباسی صاحب کو ۱۹۰۸ء میں آلی انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علیگز کے دفتر میں بطور نجی معاون (پرنسپل اسٹنٹ) ملازمت مل گئی۔ عباسی صاحب یہاں ۱۴ برس رہے۔ ان میں سے تقریباً دس برس انہوں نے صاحبزادہ آفتاب احمد خان حائٹ بکٹر (ف۔ جنوری ۱۹۳۰ء) کے ماتحت کام کیا۔ وہ ان سے بہت خوش اور مطمئن تھے۔ چنانچہ انہوں نے عباسی صاحب کو درجہ بدرجہ ترقی کر ادبی معاون اور پھر صدر دفتر کا قائم مقام سر ڈنٹ بنا دیا جب تک وہ ستمبر ۱۹۱۱ء میں وزیر سید کی کونسل کے رکن بن کر انگلستان تشریف نہیں لے گئے، یہ بے غش و غصہ سیماں کام کرتے رہے۔ اور اس زمانے کے تمام اصحاب مجاز نے بھی ان کے کام کی تحسین کی (صدر یار خانک) مولانا محمد حبیب الرحمان خان شروانی (ف۔ گیت ۱۹۵۰ء) بھی اسی زمانے میں حضور نظام دکن کی خواہش پر صدر القصد و امور ندہی ہو کر حیدر آباد چلے گئے۔ ان کے بعد جن اصحاب کے ہاتھ میں کانفرنس کی

باگ ڈور آئی، ان سے اختلافات پیدا ہو گئے۔ کانفرنس نے عاجز ماندہ صاحب موصوف کی سفارش پر انھیں انگلستان جاکر تعلیمی امور کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے چھ ہزار روپے وظیفہ دینا منظور کیا تھا۔ عباس صاحب نے سفر کے تمام انتظامات مکمل کر لیے تھے۔ لیکن غنائفین کی ریشہ داندیوں کے باعث نہ صرف یہ بل منڈھے نہ چڑھ کر بلکہ انھیں ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑا۔ اس کے بعد لمبی غیر حاضری کے بعد یہ اپنے وطن اردہ واپس آ گئے۔

یہ طویل قیام علی گڑھ ان کے دل و دماغ کی صلاحیتوں کی غنچگی کے لیے بہت مفید ثابت ہوا۔ کارمنہیں سے جو وقت بچا تو وہ اسے مطالعے میں صرف کرتے۔ کالج اور کانفرنس کے کتابخانوں میں کتابوں کی نگہبانی نہیں تھی۔ اس پر افسر ایسے لمبے کام اور علم کے قدردان تھے۔ عباسی صاحب کے دل میں بھی انگلستان اور کام کرنے کا دلورہ موجود تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے مختلف موضوعات کے بارے میں وسیع مطالعے سے اپنی معلومات اور یاقوت میں مقدرہ اضافہ کر لیا۔

اب اردہ میں مقیم ہوئے، تو دفاتر عام کے کاموں میں دلچسپی لینے لگے، لیکن اساتذہ وطن کے عدم تعاون، بلکہ عملی غفلت کے باعث اس میں کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہ کر سکے۔ اسی زمانے میں مولانا محمد علی جوہر مرحوم (ف، جنوری ۱۹۳۱ء) نے دلی سے اپنا مشہور روزنامہ ”سید رو“ جاری کیا۔ انھوں نے عباسی صاحب کو بھی اس کے حلیفہ ادارت میں کام کرنے کی دعوت دی، جو انھوں نے قبول کر لی۔ اس سلسلے میں کوئی سال بھر دلی میں قیام رہا تھا۔

اردہ کے قیام کے زمانے میں انھوں نے ”تاریخ اردہ“ (جلد اول) اور پھر ”تذکرۃ الکرام“ (دوسری جلد) اور تحقیق ”انساب“ تین کتابیں تصنیف کیں۔ انھوں نے جو کچھ لکھا تحقیق و تدقیق اور صداقت و درایت کی تمام شرائط کو ملحوظ رکھتے ہوئے، سختی پڑوسی اور حق گوئی میں کسی کی نگرہ رعایت ان کے سبب سے نہیں ہوئی۔ ”تاریخ اردہ“ میں اور پھر ”تحقیق انساب“ میں کئی خاندانوں کا کچا چٹھا تھا جس

سے قدر نامت لوگوں کو رنج ہوا اور انھوں نے سخت مخالفت کی عباسی صاحب نے ٹیکف برداشت کی، نقصان اٹھایا، لیکن جو بات صحیح سمجھی، اس کے اعلان سے باز نہ گئے۔ اس پر مقدمہ بازی ہوئی اور بحیثیت مدعی اور مدعا علیہ دونوں میدانوں میں وہ ہر طرح کامیاب رہے۔

انھوں نے ملکی سیاست میں بھی عملی حصہ لیا۔ ممکن ہے کوئی اور اثر بھی رہا ہو، لیکن وہ غالباً مولانا محمد علی کی صحبت میں کامیاب گزیریں میں شامل ہوئے۔ بعد کو امر و بھلا گزیریں کیسٹ کے صدر چنے گئے تھے۔ اور کچھ مدت وہاں کی میونسپل کمیٹی کے صدر اور انڈر سیکریٹری بھی رہے۔ ۱۹۲۶ء کے انتخاب کے سلسلے میں جب جو اہل لالہ مندوہ دوس پروردہ بن گئے، ہیں تو وہاں جلسے کا انتظام ہوا اور نظم و ضبط کا اہتمام عباسی صاحب ہی نے کیا تھا۔

۱۹۴۷ء میں جب ملک کی خفا مکدر ہو گئی اور امر و بے کا قیام غیر محفوظ ہونے لگا تو وہ عارضی طور پر پاکستان چلے گئے۔ لیکن ان کا ارادہ وہاں مستقل قیام کا نہیں تھا۔ خیامیہ بعد کو جب دونوں حکومتوں کی طرف سے اعلان ہوا کہ اب ہر مہاجرین کو اپنی مستقل جنسیت کا تعین کرنا پڑیگا، غلام ارتضیٰ کے بعد پاسپورٹ اور ملازمتی کے قواعد نافذ ہو جائینگے، تو وہ ہندستان واپس چلے آئے۔ یہاں ان کی خاصی بڑی جاداد وغیرہ بھی کچھ کتابیں بھی چھپ چکی تھیں۔ اس لیے معقول آمدنی تھی اور بسر وقات کے لیے کوئی تنویش نہیں تھی۔

ان کا نکاح ملا مان اللہ کے خاندان میں، ابراہیم علی صدیقی کی صاحبزادی (شکیلہ بیگم) سے ہوا تھا۔ اولاد میں صرف ایک صاحبزادی درجیس فاطمہ (ہوئی، جو جناب سبط رسول فاروقی کے برابر مقدس آئیں۔ پاکستان بننے پر بیٹی اور دادا وہاں چلے گئے تھے۔ جب عباسی صاحب تقاضا عمر سے زیادہ بیمار رہنے لگے، تو ان لوگوں نے اصرار کیا کہ آپ پاکستان چلے آئیے، تاکہ ہم آپ کی دیکھ بھال کر سکیں۔ یوں بھی اب امر و بے ہیں ان کا کون تھا! لہذا ہمیشہ کے بلاتے پردہ ۱۹۵۱ء میں ہجرت

کر کے مستقلاً کراچی چلے گئے۔ جانے سے پہلے انھوں نے یہاں کی بیشتر جاداد و زوخت کر دی تھی، بقیہ کے عوض میں شاید وہاں کچھ باغات وغیرہ مل گئے تھے فرض انھیں وہاں بھی مالی پہلو سے کئی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

کراچی کے زمانہ قیام میں ان کی متعدد کتابیں شائع ہوئیں۔ وہاں ہینس کے بعد سب سے پہلے "حقیقت خرم کبوتر" بھی جو اردو ہے ہی میں مکمل ہو چکی تھی، اور جس کا مسودہ وہ اپنے ساتھ لیتے گئے تھے۔ لیکن جس کتاب نے سب سے زیادہ شگامہ برپا کیا، وہ "خلافتِ معادیر و نیرید" ہے؛ یہ ۱۹۵۸ء میں شائع ہوئی۔ اس میں انھوں نے ابھر معادیر اور ان کے جانشین نیرید کو حق بجانب ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی ہے۔ قدرتی بات تھی، شیعی حضرات نے سخت احتجاج کیا۔ حکومت نے عافیت اسی میں دیکھی کہ کتاب کی اشاعت ممنوع قرار دے دی۔ لیکن وہ عباسی صاحب کا خاموش ذکر سکلی؛ انھوں نے دو سال بعد اپنے نظریے کی تائید میں دوسری کتاب "تحقیق مزید شائع کی (۱۹۶۰ء) فی الفاظ جیسے وغیرہ اب کے بھی ہوئے، لیکن چونکہ انھوں نے جو کچھ لکھا تھا، اس کی تردید محال تھی، اس لیے مخالفین نے خاموشی اختیار کی اور یہ کتاب قبیحا پھینک دی۔

انھوں نے شعرانے اردو ہکا ایک تذکرہ بھی مرتب کیا تھا۔ واصل یہ ان کی تاریخِ اردو بہر ہی کا ایک حصہ تھا۔ وہ یہ کام مکمل کر چکے تھے اور اس کا مسودہ بھی اپنے ساتھ لیتے گئے تھے لیکن یہ کتاب آج تک شائع نہیں ہوئی۔ اگر ان کے بھائی ان کے مسودات کی جھان بین کر کے اسے الگ کر لیں، اور شائع کر دیں، تو زیادہ کی مستقل خدمت ہوگی۔

۱۳ مارچ ۱۹۷۴ء کو کراچی میں انتقال ہوا۔ طالعِ ردد کراچی پرسوسائٹی کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

ہندو ناتھ

مشہور افسانہ نگار، قوم کے کھڑی (چوڑھ) تھے۔ ان کا خاندان درہل پنجاب میں زیر کلاہ ضلع گوجرانوالہ (پاکستان) کا رہنے والا تھا۔ ان کے والد گوردی شنکر صاحب بیٹے کے لحاظ سے ٹاکر تھے۔ ان کی اولاد میں پانچ بیٹے پیدا ہوئے: چار بیٹے اور ایک بیٹی۔ ایک بیٹا صغریٰ میں فوت ہو گیا تھا۔ ہادی زبان کے مشہور افسانہ نویس اور ناول نگار کرشن چندر (ف: مارچ ۱۹۷۷ء) ان کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔ ہندو ناتھ ان سے نو سال چھوٹے تھے۔ ان سے چھوٹے راجد ناتھ تھے، جن کا بچپن ہی انتقال ہو گیا۔ پھر بن سرلا دیوی (ف: ۸ مئی ۱۹۷۵ء) جو خود بہت اچھی افسانہ نگار تھیں۔ سب سے چھوٹے ایندنا تھا، انا اللہ سلامت ہیں۔

ڈاکٹر گوردی شنکر اس حیثیت سے دیاست بھرتور میں ملازم تھے۔ ۱۹۲۳ء میں وہ دہان کی کاراست ترک کر کے کشمیر چلے گئے۔ یہاں وہ کشمیر کی ذیلی دیاست پونچھ میں سرکاری اسپتال کے انچارج مقرر ہوئے تھے۔ ان کی عمر کا خاصا بڑا عقد پونچھ میں گزرا۔ انھیں اس دیاست کی ہر ایک تحصیل میں تین تین چار چار سال قیام کرنا پڑا تھا۔ ہندو ناتھ یہیں پونچھ میں ۱۹۲۳ء میں پیدا ہوئے۔ اس لیے ان کا بچپن بھی کشمیر کی دلفریب وادیوں اور جنگ بوس پہاڑیوں، دوح پرورد نظادوں اور خوبصورت جھیلوں میں گزرا۔ یہی حال بڑے بھائی کرشن چندر کا تھا۔ ان دونوں کی کہانیوں اور اداؤں میں جو منظر کی نقاشی اور قدردانی حسن کی بعض تصویریں ملتی ہیں، ان کا پس منظر ان کے بچپن کا ہی ماحول ہے۔

جب تعلیم کا زائد آیا تو کرشن چندر کی طرح انھیں بھی تعلیم دے کر اور یہ جو بی بی انکول میں بھیج دیا گیا۔ ہندو ماتھے نے انھوں کو رہے۔ کت ہیں تعلیم پائی۔ کرشن چندر ان سے پہلے دسویں درجے کی سند لے کر فور میں کرشن چندر کا لہور میں داخلہ لے چکے تھے ڈاکٹر گوہی ششگر نے خیال کیا کہ اگر ہندو ماتھے بھی لاہور چلے جائیں تو یہ نہ صرف ان کی تعلیم کے لیے بہتر ہوگا، بلکہ دونوں بھائی ایک ساتھ رہیں گے۔ چنانچہ ہندو ماتھے بھی لاہور آ گئے، اور ڈی ایس، وی بی انکول میں داخلہ لے لیا۔ دسویں کا امتحان انھوں نے اسی انکول سے پاس کیا۔ اعلیٰ تعلیم انھوں نے بھی فور میں کرشن چندر کا لہور میں پائی، جہاں سے انھوں نے بی، اے کی سند حاصل کی۔

کرشن چندر نے ایم اے کے بعد ایل ایل بی لکھنا بھی لی تھی۔ لیکن انھوں نے وکالت کا پیشہ اختیار نہیں کیا۔ بلکہ عمل سیاست در وہ بھی زیادتی مہتم کی (اور تصنیف سماجیات میں لگ گئے) سیاست کا خاذا داران کے بس کی بات نہیں تھا، اس لیے انھوں نے بھادی پھر حرم کر چھوڑ دیا، اور تصنیف و تالیف کو بقیہ زندگی کے لیے اپنا اور بھائی کا بنالیا۔

اس زمانے میں سید احمد شاہ بخاری (پطرس) آل انڈیا ریڈیو کے مدیر اعلیٰ ڈاکٹر کرشن چندر تھے اور وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر مستند اور موخا اور ہوں اور شاعروں کو ریڈیو میں جمع کر رہے تھے۔ جہاں کوئی جوہر قابل نظر آیا، انھوں نے اسے ریڈیو کی ملازمت کی پیشکش کر دی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ اس زمانے میں آل انڈیا ریڈیو واقعی کان ادب بن گیا، متعدد ادیب اس کے مختلف مراکز میں ملازم ہو گئے۔ کرشن چندر بھی اسی سلاطین پر گئے۔ اسی کا افسانہ (ریزان) ۱۹۳۶ء میں چھپا تھا، جس نے انھیں شہرت کی شاہراہ پر گھڑا کر دیا۔ ان کے بعد اور دو چار چیزیں بھی چھپیں۔ پطرس بڑے ذہین اور مردم شناس آدمی تھے۔ انھوں نے اس فوجانی مصیبت کو ریڈیو میں آنے کی دعوت دی۔ یہ اپنے سیاسی بلکہ انقلابی خیالات کے باعث کچھ دن مال منول کرتے رہے، لیکن تاکہ احتیاج نے تو بڑے بڑے شیروں کو دوبارہ مزاج بنادیا، بھلا کرشن چندر کب تک اپنے انکار پر قائم

رہ سکتے تھے :- القصد اوسر ۱۹۳۸ء میں وہ لاہور ریڈیو اسٹیشن میں ملازم ہو گئے۔ سال بھر سید تہادہ ہوا تو وہی پہنچ گئے۔ اور پھر کوئی سال بھر سید نکھنٹو۔۔۔

آخر میں چند جہاں بھی گئے، چند زمانہ تھانے کے ساتھ تھے۔ ملی کے قیام کے زمانے میں چند زمانہ تھانے کی شاخ احمد دہلی سے ملے اور ان کے افسانے بھی ساتھی میں شائع ہونے لگے۔ اگر کبھی اودھ افسانے کی تاریخ نکھی گئی، تو اس وقت کھیلگا کر ساتھی نے اودھ افسانے کے فروغ میں اور خود افسانہ نگاروں کی مدد اور ان کی شہرت میں اضافہ کرنے میں کیا اوجھار نمایاں کیے۔ خیر یہ دوسرا موضوع ہے۔ بہر حال چند زمانہ تھانے اس زمانے میں افسانہ نگاروں اور ساتھی کے علاوہ اب دوسرے رسالوں میں بھی چھپنے لگے۔

چند زمانہ تھانے میں کئی دہائی بھی نکھنٹے تھے، موجودہ ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہوئے ایک مرتبہ یہاں کے قیام کے دوران میں دوستوں کے کہنے سننے سے انھوں نے حکومت ہند کے حکم پر سلائی میں ملازمت کا امتحان دے دیا، اور اس میں پاس ہو گئے۔ لیکن جب واقعی حاضری کا سوال آیا تو انھوں نے جاننے سے انکار کر دیا۔

جب کرشن چندر ۱۹۴۱ء میں نکھنٹو گئے، تو چند زمانہ تھانے میں ان کے ساتھ گئے، کرشن چندر پروگرام اسٹنٹ مقرر ہوئے تھے، اور خاص طور پر ڈراما کا شعبہ ان کے ماتھے میں تھا۔ ان دنوں ان کے شوکت تھانے میں وہاں مضمون (سکرپٹ) لکھنے پر مقرر تھے، تھوڑے دن بعد انھوں نے بھولی آٹ پر دکھن، لاہور کی ڈسری قبول کر لی، تو ان کی جگہ پر چند زمانہ کا مقرر ہو گیا۔

اب دیکھیے، تقدیر کا کاشمیر، ایک بہن رجا تک کرشن چندر کو مشہور نظم سا رڈ بلو زڈ احمد آباد ناسرہ رٹاکا اگر آپ سہادی نفلوں کے لیے مکالمے لکھنے کی خدمت قبول کرنا چاہیں تو طے آئے۔ دوستوں نے انھیں کہا یا کہ جی جانی سرکاری نوکری چھوڑ کر شخصہ، ملازمت قبول کرنا نا اہمندی نہیں، لیکن وہ دہاتی اس سرکاری نوکری سے سزا دہو چکے تھے۔ انھوں نے مستغنی داخل کر دیا، اور پونا کی ریلوے۔ تصدیق کیا جاسکتا ہے کہ

اس سے اردو ادب کو کتنا خائندہ پہنچا۔ ہر حال، دونوں بھائی ۱۹۴۲ء میں پڑنا گئے اور دو سال احمد کے ساتھ رہے۔ ۱۹۴۴ء میں کرشن چندر نے سٹی ایمیز سے معاہدہ کر لیا۔ ۱۱ و ایک سال بعد (۱۹۴۵ء-۱۹۴۶ء) فیشنل تھئیٹر کے تعاون سے اپنی ایک پرانی کہانی پر مبنی فلم ”سرے کے باہر“ بنائی۔ اس میں ہندوستان نے ہر وکامیٹ کیا۔ پھر دوسری فلم ”دل کی آواز“ تیار کی، اس میں بھی ہندوستان بہتر رہے۔ (تینہ خاتون نے کسروین کا دل ادا کیا تھا)۔

اس کے بعد اس نے جب فلم کہنی قائم کی، تو ہندوستان کوئی چار برس تک اس میں مکالمہ نویس رہے۔ اس کہنی کی ایک فلم ”لڑا“ میں انھوں نے بطور اداکار بھی حصہ لیا تھا۔ خواجہ احمد عباس کی ایک فلم ”دھرق کے لال“ میں انھوں نے ”ساج سبک“ کا پارٹ ادا کیا تھا۔ اب ہندوستان کی بطور مکالمہ نویس اور فضاء نگار کے مسلمہ حیثیت تھی۔ لیکن وہ جو عام مشاہدہ ہے کہ بگڑے وقت کے نیچے اور کوئی چیز آگ یا پب نہیں سکتی، وہی حشر ہندوستان کو کرشن چندر کی وجہ سے ہوا۔ کرشن چندر کی شہرت اور غفلت کے باعث ہندوستان کو احساس ہو گیا تھا کہ لوگ مجھے میرا جائز حق دینے کو تیار نہیں، اس لیے وہ کچھ بے پردہ سے ہو گئے۔ ان کے بعض افسانوں میں زبان و بیان کچھ نمایاں نظر آتی ہیں، ان کا اہل صیب یہی ہے۔

ان کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ”فلم رائٹنگ سوسائٹی“ کی بنیاد رکھی اور جلسہ ان کی فلم تھکنے والوں کے حقوق منوانے اور ان کا حق دلایا۔ وہ زندگی بھر بلا مقابلہ ان کے بھن کے سحر چنے گئے۔ وہ تو ترقی پسند مصنفین کی تحریک سے بھی وابستہ رہے۔ ہندوستان کے افسانوں کے دس مجموعے چھپ چکے ہیں: (۱) چاندی کے تار، (۲) کہانی، (۳) دارلک چوٹ، (۴) گالی، (۵) یہاں سے وہاں تک، (۶) پاکستان سے ہندوستان تک، (۷) چاں میں رہتا ہوں، (۸) بیات، (۹) نئی پیاد، (۱۰) تہنا، تہنا، (۱۱) مانگا میری، ذکر تیرا۔

ان افسانوں کے مجموعوں کے علاوہ ہندوستان میں: (۱) آدمی اور گئے، (۲) رات انجیری

ہے؛ (۳) سورج، ریت اور گناہ؛ (۴) دھواں؛ (۵) پیاد کا موسم؛ (۶) ایک شیخ، ہزار
پر دانے؛ (۷) خزل ایک، مافرودہ تیری صورت، میری آنکھیں؛ (۸) لیلہ؛ (۹)
رد پا؛ (۱۰) بچن؛ (۱۱) زبرد سے پیرو؛ (۱۲) درد کا دشت؛ (۱۳) ٹھوکر؛ (۱۴)

ارازوں کی سچ۔

ان کی متعدد کہانیوں کے تراجم ہندستان کی مختلف زبانوں کے علاوہ روسی اور رومانی
زبانوں میں ہوئے ہیں۔ ان کی کہانیوں پر گو دکی (روس)، اور مو پاساں (فرانسیسی)
افسانہ نویسوں کا بہت اثر ہے۔ اور ان ہی کی طرح بھوک اور جنس ان کے خاص
موضوع ہیں۔

۲۰ مارچ ۱۹۷۲ء کو بھی میں بجا افسانہ قلب انتقال کیا۔ لاہور فوت ہوئے۔

حمید احمد خان، پروفیسر

اردو صحافت کا ادراجہ ملک کی تحریک آزادی کی کوئی تاریخ، لاہور کے روزنامہ زمیندار اور اس کے مدیر بشیر مولانا ظفر علی خان (ف: نومبر ۱۹۵۶ء) کے تذکرے کے بغیر ممکن نہیں ہو سکتی۔ زمیندار دراصل مولانا ظفر علی خان کے والد مولوی سراج الدین احمد خان (ف: دسمبر ۱۹۰۹ء) نے مفتاد ذرا کی شکل میں جاری کیا تھا۔ ان کے زمانے میں یہ واقعی زمینداروں اور کسانوں کے کام کا ذراعتی پرچہ تھا۔ اسے سیاسی اور علمی روزنامہ قرار دینا کی وجہ سے بعد مولانا ظفر علی خان نے بنایا۔ لیکن اس وقت مجھے زمیندار کی تاریخ نگہنا منظور نہیں۔

مولوی سراج الدین احمد خان کی ساری اولاد اشعار و اشعار ایک سے ایک بڑھ کر ہوئی۔ انھوں نے اپنی زندگی میں دو کاغذ کیے۔ بڑی بیگم کے بطن سے تین بیٹے پیدا ہوئے؛ ظفر علی خان، غلام حیدر خان اور محمد اکبر خان؛ کھوٹی سے بھی تین ہوئے؛ محمود احمد خان، حامد علی خان اور حمید احمد خان۔ ہر ایک نے اپنے اپنے میدان میں نمایاں خدمات سر انجام دی ہیں اور ہمارے نثر، بیرونی علم و ادب کو مال کیا ہے۔

یہ خاندان دراصل کرم آباد تحصیل وزیر آباد، ضلع گوجرانوالہ، پنجاب محال پکھان، کاربن والا تھا، لیکن حمید احمد خان یکم نومبر ۱۹۰۲ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ درجہ تک ان کی تعلیم چرچ آف اسکالرشپ ہائی اسکول، وزیر آباد میں ہوئی۔ ایک بات قابل ذکر ہے کہ ان کی طالب علمی کے زمانے میں تاریخ ادب اردو (انگریزی) کے مشہور مصنف اور اہرانیات ریورنڈ ڈاکٹر ٹامس گلاہم بیلی (ف: ۱۹۴۱ء)

اس اسکول کے منبجرتھے اور طلبہ کو انگریزی بھی پڑھاتے تھے۔ چنانچہ حیدر احمد خان بھی ان کے شاگردوں میں سے ہے، بلکہ اپنی انگریزی کی قابلیت کے باعث یہاں کے چینیے شاگردوں میں سے تھے۔

۱۹۲۳ء سے ۱۹۲۴ء تک میں بھی وزیر آباد کے وکٹوریہ ڈائمنڈ جوبلی ہائی اسکول کا معلم رہا ہوں۔ میں نے اسی زمانے میں ڈاکٹر دیلی کو دیکھا تھا۔ چونکہ ذکر آگیا ہے، اس لیے غالباً دیلی نہیں ہوگا، اگر ہاں بطور طلبہ، محترمہ ڈاکٹر دیلی کا ایک لطیفہ محفوظ کر دوں:

ڈاکٹر دیلی اپنے طویل قیام پنجاب کے باعث بہت اچھی پنجابی سمجھتے اور بولتے تھے۔ اور انھیں اپنے ملنے والوں اور طلبہ اور طلبہ کے والدین کے ساتھ پنجابی میں گفتگو کرنے میں خاص لطف آتا تھا، بلکہ وہ اس زبان میں بہت کامیاب و مہرور تھے، چنانچہ عموماً کہتے تھے۔ بعد کو انھوں نے ولایت دہلی پر پنجابی زبان سے متعلق متعدد کتابیں شائع کی تھیں۔ اس میں کوئی شہر نہیں کہ مسلسل مشق اور زراعت سے ان کی پنجابی سے واقفیت حیرتناک حد تک وسیع ہو گئی تھی، اور وہ اس کے خاص کامیاب استاد اور بے بہہ مہربان تھے۔

ایک مرتبہ کیا ہوا کہ وزیر آباد کے مصافحات سے ایک دیہاتی اپنے بیٹے کو مشن اسکول میں داخلہ دلانے کو لایا۔ داخلے کی آخری تاریخ نکل چکی تھی اور درجے میں چھٹی جگہیں ختم تھیں، وہ پوچھی، نہیں۔ حال علم کے والد نے بہت منت سماجت کی، لیکن ڈاکٹر دیلی ہنس سے ہنس نہ ہوئے۔ ان کا کہنا تھا کہ درجے میں جگہ ہی نہیں رہی، ہم داخلہ کیسے منظور کر دیں، لیکن دیہاتی اس کے باوجود اصرار کیے جا رہا تھا۔ اس پر ڈاکٹر دیلی کو مذاق کی سوجھی۔ فرمایا: اچھا، اگر آپ مجھ سے پنجابی میں کوئی بات ایسی کہیں، جو میری سمجھ میں نہ آئے تو میں لڑکے کو داخلے کی اجازت دے دوں گا، یہ گویا ان کا اپنے پنجابی کے علم پر اعتقاد کا اظہار تھا، اس پر لڑکے کے والد کی باچھس کھل گئی۔ اس نے براۓ کہا: اوسے تو توں کون ہونا، ایس جھوٹے نوں داخل ناکرن آلا، میں گھٹتی مادیرا تھیں بھنن دیو، گھا (اوسے) تم کون ہوئے ہو اس لڑکے کو داخل نہ کرنے والے! میں گھو (نا) مار کر تھا اوسے سنے کا چیز (توڑ دوں گا) اس فقرے کا پہلا حصہ ایسا مشکل نہیں

لیکن آخری حصہ واقعی مشکل ہے اور جس شخص کو دیہاتوں کے ساتھ رہنے اور ان سے مقامی روزمرے میں بااحتیاط کرنے کا موقع نہ ملا ہو، اس کے لیے یہ عیسایانہ ہے۔ پہلی نے جو یہ فقرہ سنا، تو ان کا منہ کھلے کا کھلا ہو گیا۔ لیکن زبان دے چکے تھے اب وعدہ خلافی کیسے کرنے! کہنے لگے، اچھا صاحب، اردو کا تو داخل ہو گیا، لیکن جو کچھ آپ نے کہا، اب اس کا مطلب بتا دیجئے۔ سب دیہاتی نے معنی بتائے، تو بہت دیر بہہ سلتے رہے (یاد رہے کہ یہ ساری گفتگو پنجابی میں ہوئی تھی)۔

تو خیر، دشمن کی سند لینے کے بعد حمید احمد خان، جید و آباد (دکھی) چلے گئے، جہاں ان کے بھائی جناب محمود احمد خان عثمانیہ یونیورسٹی میں کیمسٹری ڈپارٹمنٹ کے صدر تھے (بعد کو وہ چندے اسی یونیورسٹی میں رجسٹر اور بھی رہے) حمید احمد خان نے عثمانیہ میں داخلہ لے لیا اور تین سال بعد ہی اے آئز کی پڑھیں سے سند لی۔ وہ اس سال اپنے درجے میں پوری یونیورسٹی میں اول آئے اور انھوں نے اول ڈیوٹن حاصل کی تھی۔ ایم اے (انگریزی) کا امتحان انھوں نے بعد کو گورنمنٹ کالج، لاہور کے طالب علم کی حیثیت سے جناب یونیورسٹی سے لیا۔

حمید احمد خان بعد کے زمانے میں عام طور پر کہا کرتے تھے کہ میں حضرت مولانا عبد الباقی دہلوی کا بیٹا ہوں۔ مولانا عبد الباقی دہلوی (فدوی دہلوی) اس زمانے میں جامعہ عثمانیہ میں فلسفے کے پروفیسر تھے اور حمید احمد خان کے استاد۔ ان کے دل و دماغ کی فتوحات اس وقت بھی نمایاں تھیں، اور بعد کو وہ جس مقام پر پہنچے، وہ تو ہم طالبوں کی بردائیاں سے بھی کچھ بلند تھا۔

حمید احمد خان نے ملازمت کا آغاز اسلام آباد کالج لاہور سے کیا، وہ جنوری ۱۹۳۲ء میں یہاں انگریزی کے مدرس (پروفیسر) مقرر ہو گئے۔ بہت کامیاب معلم ثابت ہوئے۔ اپنے ہیکل و قد میں اور سائنز اور طلبہ میں، وہ یکساں ہر دو عزیز تھے مگر چہ وہ انگریزی پڑھاتے تھے، لیکن اُن سے محبت اور اس کی ترقی اور ترویج کا جذبہ انہیں ورثے میں ملا تھا۔ چنانچہ انھوں نے یہاں کالج میں بنیم فردغ اُردو کا نام لگی، اور کالج کے رسالے کریٹسٹ

کے ذریعہ اعلیٰ بھی رہے ۔

اکتوبر ۱۹۴۴ء میں اذہاریت تعلیم، حکومت ہند ڈائریکٹریٹ آف ایجوکیشن کے ادارہ دہلی پالیٹکنک میں انگریزی کے مدرس مقرر ہو گئے۔ اگلے تین سال ان کا قیام دہلی میں رہا جب آغا دی کے ساتھ پاکستان وجود میں آیا، تو اگست ۱۹۴۷ء میں وہ دہلی تعلیم حکومت پاکستان سے وابستہ ہو گئے لیکن یہاں ۳۳ زیادہ دن نہیں رہے؛ فروری ۱۹۴۸ء میں اسلامیہ کالج، لاہور میں انگریزی کے پروفیسر مقرر ہو گئے۔ جلد ہی انھوں نے ٹرکی کیا کہ ڈاکٹریٹ کی سند دہمنے کے باعث ان کی آئندہ ترقی مشتبہ ہے۔ اس پر وہ ۱۹۵۲ء میں کیمبرج راجستھان گئے اور وہاں سے ایم، ایل، ڈاسٹریٹ آف لٹریچر، ٹرکی سند حاصل کر کے وطن آئے۔ ان کے مقالے کا موضوع تھا؛ درٹا سوتھ کی شاعری میں شہوانی اور روحانی تصورات۔ پروفیسر آربری مرحوم (دف اکتوبر ۱۹۶۹ء) جو ان کے یو ٹی بی تھے اور ایک محسن بھی، چاہتے تھے کہ وہ سال بھر ادورک جائیں اور اپنے مقالے کا دائرہ وسیع کر کے اسے از سر نو قلبند کریں، تاکہ انھیں پی ایچ ڈی کی سند دی جاسکے لیکن حیدر احمد خان کے خانگی حالات ان کے مزید قیام انگلستان کے لیے سازگار نہیں تھے؛ انھیں بادل ناخواستہ واپس آنا پڑا۔ وہ اسی پر وہ اپنے اصلی کالج میں شعبہ انگریزی کے صدر مقرر ہوئے اور چار سال بعد ۱۹۵۶ء میں کالج کے پرنسپل بنا دیے گئے۔ ان کا پانچ سالہ عہد اذہاریت اس کالج کی تاریخ کا زورین دور ہے۔

ستمبر ۱۹۶۳ء میں انھیں پنجاب یونیورسٹی کا ڈانس جاسٹریٹ (شیخ الجامعہ) بنایا گیا انھوں نے اپنے زمانہ اقتدار میں پنجاب یونیورسٹی کی کاپی لٹریچر جس بچہ انگریزی کے سوس کوئی اور آواز نہیں سنانی دیتی تھی، وہاں ایک سسٹم سے دوسرے سے تک سب کام اردو میں ہونے لگا۔ وہ خود اپنا فرائض کام اردو میں کرتے، مسلوں پر اپنی یادداشتیں اور حکم احکام اردو میں لکھتے، اور دوسروں کو بھی اسی کی ترغیب دیتے۔ اس مزہ کو عام اجازت تھی کہ وہ تمام مضامین اردو میں پڑھائیں طلبہ کو کھلی چھٹی تھی کہ قبائے،

بی کہیں ہی ایم لے سکتا تھا۔ تمام امتحانات کے پرچوں کے جواب اُردو میں لکھیں۔ اور تو اور تمام امتحانات کی اسناد بھی اُردو میں پھینے لگیں۔ وہ سادہ زندگی انگریزی پڑھاتے رہے اور یہاں سے دلا سیت تک سب معترف میں کہ وہ بہت اچھی انگریزی بولتے اور لکھتے تھے۔ لیکن اپنی گفتگو یا اُردو تحریر میں اصطلاحات کے اسودا، وہ بھی انگریزی کا لفظ استعمال نہیں کرتے تھے۔ ان کے دماغ میں دونوں زبانوں کے خانے الگ الگ تھے جب تک بند ہو جاتا، تو دوسرا کھلتا: وہ دونوں کو آپس میں گڈ بند نہیں کرتے تھے۔

یہ پاکستان کی سیاست کا دہرایا تو بی تھا، اور وہاں ایک نئی قسم کی نوکر شاہی عالم وجود میں آگئی تھی۔ ہر سرکاری دفتر اور ایئر افسر ہر والے میں داخلہ و معقولات دنیا اپنا پیدائشی حق سمجھتا، ادھر حیدر احمد خان ضابطہ قانون کے صدر رہے پابند۔ ان کا اصول یہ تھا کہ تعلیم کا درجہ سب سے بلند ہے، اور کسی بیرونی کسی بیوروکری کے معاملات میں ان کی اجازت کے بغیر دخل دینا کفر کے مراد ہے۔ وہ خود کسی وزیر یا تدبیر تک کی ملاقات کو تو جلتے نہیں تھے، سکرٹری، نائب سکرٹری کا کیا ذکر ہے! ابھی ضرورت پیش آگئی تو ضابطہ کا خط پرچہ لکھ کر متعلقہ دفتر میں بھیج دیا جہاں بنیادی اصولوں میں اور طریقہ کار میں یہ بعد المشرتہ تین ہوا وہاں بھٹلا کتنے دن عافیت سے گزار سکتی تھی۔ کمال تو یہ ہے کہ اس پر بھی انہوں نے خمیر کرسن گزار دیے۔ یہ حال اور باب کا مستحق ان کی آزادہ ادبی اور بقول شخصہ ”اکڑہ کھلنے لگی چٹانچو ان کے خلاف طرح طرح کی ایسے دواخیاں ہونے لگیں۔ اولاً طلبہ کو ان کے خلاف بھڑکانے کی کامیاب کوشش کی گئی۔ پھر ان سے کہا گیا کہ وہ طویل رخصت پر چلے جائیں۔ حیدر احمد خان نے دیکھا کہ اس ماحول میں عزت باقی اور خود ادبی کی قربانی دیے بغیر گزارا ممکن نہیں۔ اس پر انہوں نے ”مطلب تو، بقا ہے تو“ کہتے ہوئے۔ (خود ہی ۱۹۶۹ء میں استعفا دے دیا۔

ابھی وہ اسلامیہ کالج کے پرنسپل تھے کہ حکومت نے مارچ ۱۹۶۲ء میں ان کی نشی اور

تعلیمی خدمات کے اعزاز میں انھیں ستاؤ اہتمام کا اعزاز دیا۔ پھر یونیورسٹی کی خدمت کے دوران میں اگست ۱۹۶۸ء میں اس سے بھی اعلیٰ استاد پاکستان کا نشان عطا کیا۔ جون ۱۹۶۴ء میں حاکم ارتادار (خللاؤ) (اندونیشیا) میں ایک ایشیائی کونفرنسی اسلامی کانفرنس منعقد ہوئی تھی اس کے اگلے برس مارچ ۱۹۶۵ء میں باندنگ میں ملاوٹوں میں پاکستانی وفد کے سربراہ تھے۔ ۱۹۶۵ء میں اس کے مستقل ادارے کے نائب صدر بھی چنے گئے تھے۔ اکتوبر ۱۹۷۰ء کی باندنگ کانفرنس میں بھی شریک ہوئے۔

یہ حقیقت ہے کہ یونیورسٹی کی داس پائلری کے دوران میں انھوں نے جس فرض شناسی کا ثبوت دیا اور جس محنت اور دلسواکی سے دن رات کام کیا اس نے ان کی تندرستی کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔ ۱۹۶۹ء میں یہاں سے سکندرشہزہ کو ہٹائے گئے لیکن اس کے بعد صحت کے پہلو سے کبھی اطمینان نصیب نہ ہوا اس کے باوجود جب حکومت نے انھیں جولائی ۱۹۶۹ء میں ادارہ ثقافت اسلامیہ کا اضافی ڈیرہ (ایڈیشنل ڈائریکٹر) بنانے کی پیشکش کی تو انھوں نے اسے اس خیال سے قبول کر لیا کہ اس سے ملک و ملت اور زبان کی خدمت کا ایک موقع پیدا ہو گیا تھا۔ سال بھر بعد یہ امتیاز اعلیٰ تاج کی ذمہ داری پر ۱۹۷۰ء پروردہ جولائی ۱۹۷۰ء میں مجلس ترقی ادب کے ناظم مقرر ہو گئے۔ اپنی وفات پروردہ اسی جہد سے پر مشغول تھے

انھیں فشار دم کا عارضہ تھا۔ اس کا سب سے پہلا حملہ جون ۱۹۷۲ء میں ہوا۔ اس کے بعد طبی حمایت کے تحت وہ کچھ عرصہ تاؤ رہے لیکن کام کی وہ بھرا بھری کوششوں سے مستعد تھا۔ ۲۳ مارچ ۱۹۷۴ء صبح دفتر جانے کے لیے تیار ہوئے تھے کہ رکت ہوئی۔ جذبات آدم کرنے کے بعد پھر جانے کو اٹھے گھر کے لوگوں نے بہت منہ کیا کہ آج دفتر نہ جائے اور ڈاکٹر کو بلا کر اس سے مشورہ لیجیے۔ لیکن ان کا اصرار تھا کہ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ اتنے میں دوسری مرتبہ رکت ہوئی اور ساتھ ہی یہوش ہو گئے۔ ڈاکٹر آیا، معلوم ہوا کہ دماغ کی رگ پھٹ گئی ہے۔ اسی حالت میں انتقال پہنچائے گئے۔ جہاں اسی دن شام کے چھ ساڑھے چھ بجے اپنے خانی حقیقی سے جا ملے۔

اِنَّا شَرُّ ذَا اِيْمَانٍ رَا جَمْعُوْنِ . خالہ اگلے دن سہقہ ۲۳ ارج ۱۹۷۴ء کی صبح میں
اتھا اور انھیں مل جل کر قبرستان میں (غالب روڈ اور سرشید روڈ کے مابین) سپردِ خاک
کریا گیا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے مغفود کریم کا سلوک کرے، آمین !
ظاہر شادمانی نے آہ کے تخرجہ سے تارنگا بھی ہے :

ظاہر : اس کے سنِ رحلت پر کبھی کبھی کے آہ
"ہر درجہ حبیبِ ناز دوس ، حمید احمد خان"

(۱۹۸۰ء - ۶ - ۱۹۷۳ء)

ان کی شادی ۱۹۴۲ء میں ہوئی تھی۔ اولاد میں چھ بچے اپنی یادگاہ چھوڑے۔ سب سے
بڑے سعید احمد خان ایم، اےس سی اے ایم (اس (امریکہ) میٹیکل انجینئرز میں۔ اگلے سے چھوٹے
بیٹے خلیل احمد خان بھی انجینئرز ہیں، جیل میاں نیک میں ملازم ہیں، موقار، منصور اور
عناز بھی طالب علم ہیں۔ سلیم اللہ تعالیٰ۔

جس طرح وہ بات چیت میں بہت کم گو تھے، اسی طرح کھنے میں بھی بہت محتاط اور
سست رہتے تھے۔ انھوں نے بہت کم کھا ہے اور اس میں سے بھی بہت کم کئی صورت
میں جمع ہوا۔ لیکن یہاں سوائی مقدار کا نہیں، بلکہ معیار کا ہے۔ ۱۹۶۲ء میں انھوں نے
ایک انتخاب "سیفۃ ادب" دیکھ کر شائع کیا تھا، جو نصاب کے لیے بہت موزوں
ہے۔ لیکن وہ اصل ان کی اپنی سہ ماہی کتاب حضرت رسول کریم صلعم کی مختصر سوانح
ہے جو ۱۹۶۶ء میں شائع ہوئی تھی۔

ابنِ علم جانتے ہیں کہ دیوانِ غالب کا نسخہ بھوپال، جو بعد کو نسخہ حمید یہ کی بنیاد بنا، ایک
ترتیب سے غائب اور غلطی سے دنیا اس سے استفادہ کرنے سے محروم ہو گئی ہے۔ خوش قسمتی
سے حمید احمد خان نے اسے اگست ۱۹۳۸ء میں بالاستیحاب دیکھا تھا، اداس سے
یادداشت لے لی تھیں۔ انھیں کوترتیب کے غالب حمیدی کے رقعہ پر جولائی ۱۹۶۶ء
میں نسخہ حمید یہ شائع کر دیا اور اس طرح یہ دیوان دوبارہ بلکہ زیادہ محکم طور پر حمید
کے نام سے منسوب ہو گیا۔

ان کی تیسری کتاب ارمغانِ حالی ہے (لاہور، ۱۹۷۰ء) اس میں حالی کی نظم و نثر کا انتخاب ہے۔ اس کے دیباچے کا مطالعہ حالی کے سمجھنے اور اردو ادب میں ان کا مقام متعین کرنے کے لیے ناگزیر ہے۔ ان کی وفات کے وقت دو کتابیں زیرِ طبع تھیں: تعلیمِ تہذیب اور اقبال کی شخصیت اور شاعری؛ یہ بعد کو شائع ہوئیں۔

ان کی کئی کتابیں کم و بیش ترتیب و تدوین کے آخری مرحلوں پر تھیں۔ ان میں غالب اور اقبال کے بارے میں بہت کام ہو چکا تھا۔ غالب سے متعلق مضامین مختلف رسائل و جرائد میں منتشر ہیں، ان کا ایک مجلد شائع ہونا چاہیے۔ انھوں نے اپنے معصودوں اور نثرگوں کے حالات میں متعدد مضامین قلمبند کیے تھے، جو ۱۹۷۱ء میں چھپے تھے، انھیں بھی جمع کرنا چاہیے۔ غرض کہ غرض کر کے ان کی تمام اردو اور انگریزی تحریریں کو منظرِ عام پر لانے کی ضرورت ہے۔

افسر میرٹھی، حامد اللہ

میرٹھی میں مغیتوں کا خاندان بہت مشہور ہے، بلکہ وہ محلہ جہاں ان اصحاب کی سکونت ہے، "محلہ مفتی صاحبان" کے نام سے موسوم ہو گیا ہے۔

اس خاندان کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ شاہان مغلیہ کے عہد میں ان کے بزرگوں کو ضلع میرٹھ میں معافی کے چند ٹکڑے عطا ہوئے تھے جس سے انھوں نے میرٹھ میں سکونت اختیار کر لی۔ اس آخروانے میں ان کے ایک فرد مفتی محمد عصمت اللہ ہوئے ہیں۔ یہ بھی اپنی خاندانی روایات کے حامل اور نوریہ و علم و فضل سے آراستہ تھے۔ اور طویل مدت مقامی گورنمنٹ اسکول میں اردو فارسی کے مدرس رہے۔ ان کے چھ اولاد

ہوئیں: (۱) بقیس، شرعی کھیتی تھیں اور مقامی طور پر کافی مشہور ہوئیں؛ (۲) شفقت اللہ، (۳) حامد اللہ، (۴) مطیع اللہ۔ انھوں نے گورنمنٹ اسکول میرٹھ سے دسویں درجے کی سند حاصل کی اور اس کے بعد جیپو میں سکونت اختیار کر لی؛ دہلی اسکول میں معلم ہو گئے تھے۔ نبی سلطان سے بالآخر ایم اے پاس کر لیا اور اسی اسکول میں ہیڈ ماسٹر مقرر ہو گئے تھے۔ ۱۹۴۴ء میں پاکستان چلے گئے تھے؛ غالباً راولپنڈی میں مقیم ہیں۔ شرعی کھیتی ہیں؛ قریحہ میں ہے (۵) مبشرہ؛ (۶) ہوسہ۔

حامد اللہ ۲۹ نومبر ۱۸۹۶ء کو اپنے خاندانی مکان (محلہ مفتی صاحبان) میں پیدا ہوئے۔ تعلیم کھانا نہ آیا، نور الدین نے انھیں خود فارسی اور اردو پڑھانا شروع کی جب کافی استعداد ہو گئی، تو حکم ہوا کہ روزانہ کسی اپنی پسند کے موضوع پر ایک مضمون اردو میں لکھ کر دکھایا کرو۔ موضوع کی قید نہیں تھی؛ یہ کسی برتن، پھول، چارپائی، بکائے بھینس

پر ہو سکتا تھا۔ روزانہ نماز مغرب کے بعد وہ یہ مضمون دیکھتے، اپنی آواز سے اسے دہراتے اور ہمیشہ اس کی تریف کرتے۔ سال کے آخر میں یہ ۳۶۵ صفحات کا مبلکہ کرایا جاتے۔ اب آغاز سال سے دو کام ان کے ڈٹے ہو جاتے، ایک نیا مضمون حسب معمول لکھنا، اور دوسرے پہلے سال کے اسی تاریخ کے مضمون کی شرح دستاویزی سے اصلاح کرنا۔ مغرب کے بعد وہ یہ دونوں چیزیں والد کی خدمت میں پیش کر دیتے۔ وہ ہمیشہ کی طرح انھیں پڑھتے، تریف کرتے اور لوٹا دیتے۔ یہ سلسلہ برسوں تک رہا۔

جہاں ایک بات قابل ذکر ہے،

اگر کسی دن کسی وجہ سے مضمون نہیں لکھتے تھے، تو والد ناراض نہیں ہوتے تھے، مگر مزہ تو بیچ کرتے، بلکہ انھوں نے تنبیہ کا ایک اور کھا طریقہ اختیار کیا تھا شب کا کھانا باب بیٹے دونوں روزانہ دیا کرتے تھے، جس دن یہ مضمون نہ لکھتے، والد اندر کھلا بھیجتے کہ آج کھانا صرف والد اللہ کے لیے بھیجا جائے، ہم کھانا نہیں کھائیں گے اور کھانا آج آنے پر انھیں حکم ہوتا کہ کھانا کھاؤ۔ یہ ایسی سخت سزا تھی کہ ان کے لیے ناقابل برداشت ہو جاتی۔ یہی وجہ تھا کہ تیز سے تیز بخار تک کی حالت میں بھی وہ ایک صفحے کا یہ مضمون ضرور لکھ لیتے تھے۔

رات کو یہ اپنے والد کی پاس دیا کرتے تھے۔ سونے سے پہلے وہ انھیں ٹکوں ٹکوں کے بڑے بڑے ٹکوں کے، خاص طور پر تاریخ اسلام کی برگزیدہ اور ممتاز شخصیتوں کے حالات اور قصے سنایا کرتے تھے۔ جب تک یہ انگریزی اسکول میں داخل نہیں ہوئے، وہ پہلا دستہ ایک صفحہ روزانہ لکھنے کا جادوی رہا۔ اس کے بعد اس میں ترمیم ہو گئی کہ اب موضوع اپنی پسند کا نہیں بلکہ پچھلی رات جو مشاہیر کے واقعات سنائے گئے تھے، ان میں سے کوئی واقعہ ایک صفحے میں لکھا جائے۔

مفتی محمد عصمت اللہ بیٹے کو فارسی اور عربی کا عالم بنانا چاہتے تھے۔ چنانچہ انھیں مدرسہ اسلامیہ میرٹھ میں داخل کرایا گیا۔ لیکن جہاں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ سال بھر بعد امتحان ہوا تو کسی مضمون میں محنت نے انھیں پاس نمبر کے پرچہ میں پچیس نمبر دے دیے۔

جب یہ بات مفتی صاحب کے علم میں آئی تو بہت متعجب ہوئے۔ کہتے: بچا پس تک تو خیر غنیمت تھا، یہ بچپن کیسے ہو گئے؟ پانچ فاضل کہاں سے آئے؟ اس پر وہ کچھ مدظن ہو گئے؛ حامد اللہ کو در رسد عالیہ سے اٹھا کر دیوبند بھیج دیا، جہاں کے اکابر سے ان کے ذاتی تعلقات تھے۔ لیکن یہ وہاں سال بھر سے زیادہ نہ رہ سکے۔ ایسے ہمارے بڑے کہ سب کچھ چھوڑ چھاؤ کو علاج کے لیے میرٹھ آنا پڑا۔ علاج سے اچھے تو ہو گئے۔ لیکن پھر دیوبند واپس نہ جاسکے۔ اب مفتی صاحب نے خود ہی پڑھانا شروع کیا۔ فارسی کا لفظ اب ختم کیا، بلکہ اسی زمانے میں یہ فارسی شاعری کو سننے لگے۔ پھر ان کے دو بزرگوار نے یہ فیصلہ کیا کہ انھیں عربی کی اعلیٰ تعلیم کے لیے جامعہ اندھڑ، قاہرہ بھیج دیا جائے۔ چنانچہ اس کا خرچ پورا کرنے کے لیے اپنا ایک مکان بیچنے کی تیاریاں کرنے لگے۔ اور ساتھ ہی سفر کے لیے پاسپورٹ کی درخواست جمع دے دی۔ لیکن عربی کی تکمیل قسمت میں نہیں تھی تھی۔ پاسپورٹ کی درخواست منظور نہ ہوئی اور یہ مصر نہ جاسکے۔

اس اثنا میں ان کے ایک مکان میں آگ لگنے کے ایک نقشہ نویس کرایہ دار آگئے۔ ان کا ایک بیٹا اسکول کے ساتویں درجہ میں فارسی میں قیل ہو گیا۔ انھوں نے اسے بیٹے کو انگریزی اور ریاضی کے مضامین گھر پر ہی طور پر پڑھانے کا انتظام کر دکھا تھا، لیکن فارسی کا کوئی معقول انتظام نہیں ہو سکا تھا۔ انھوں نے مفتی صاحب سے مشورہ کیا، تو انھوں نے حامد اللہ کو بلوایا اور پوچھا کہ انھیں یشکول و پیش ہے، کیا آپ کوئی مدد کر سکتے ہیں؟ یہ اس لڑکے کو فارسی پڑھانے پر آمادہ ہو گئے۔ ایک دن اس لڑکے نے حامد اللہ صاحب سے پوچھا کہ کیا آپ انگریزی نہیں جانتے؟ ان کے نفی میں جواب دینے پر اس نے یشکول کی کہیں آپ کو انگریزی پڑھا دیا کر دے گا۔ مشکل یہ تھی کہ وہ خود ساتویں درجے میں پڑھتا تھا، اس لیے وہ زیادہ دن تک ان کا ساتھ نہ دے سکتا تھا۔ بہر حال یہ انگریزی پڑھنے لگے۔ جب ان کے والد مفتی مصطفیٰ اللہ کو ان کے نئے شوق کا علم ہوا، تو انھوں نے حوصلہ افزائی کی اور کچھ ابتدائی کتابیں بھی منگوادیں۔ استاد ی شاہزادی کا یہ

سلسلہ دوبرس تک جاری رہا۔ اس کے بعد بعض حریفوں سے اتفاق سے ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس سے ان کی زندگی کا رخ بدلا گیا۔ اپنے ڈپٹی نذیر احمد کے دل کا دل میں داخلے کا قصہ تو پڑھا ہو گا کہ کیونکر داخلے والے دن بھڑ میں ان کا بالوڑ پڑا تھا، جس سے وہ گر گئے، اور پرنسپل نے ایک کمر انھیں اٹھایا اور مفت صدماتین زدہ کے حوالے کر دیا اور مفتی صاحب نے ان کا امتحان لے کر انھیں کالج کے عربی درجے میں داخل کر لیا۔ اور یوں وہ کسی مسجد کی پیشوا امتحان سے بال بال بچ گئے۔ حامد اللہ کے ساتھ جو کچھ گزری وہ اس سے کم دلچسپ نہیں۔

اُن کا وہ خاص کام کا شاگرد اب انھوں نے امتحان پاس کر کے مقامی گورنمنٹ ہائی اسکول کے نویں درجے میں داخلہ لینا چاہتا تھا۔ جس دن داخلے کا فیصلہ ہوتا تھا، یہ بھی تقریباً ٹیلے تھیلے اس کے ساتھ اسکول چلے گئے۔ جس نے بتایا کہ ہیڈ ماسٹر صاحب سبابتو اور لاخود امتحان لینے، اور داخلے کا فیصلہ کرینگے۔ اسی سال نئے ہیڈ ماسٹر و فیروز صاحب ولایت سے تشریف لائے تھے۔ سبابتو داران کے کمرے کے باہر جمع ہو گئے۔ انھیں فیروز صاحب بنگلے سے برآمد ہوئے اور حکم دیا کہ سب طلباء ایک قطار میں کھڑے ہوجائیں۔ اس پر اسکول کے کوئی اور معلم آگے بڑھے، اور بچوں کی قطار بنونے لگے۔ جب میں نے حامد اللہ کو بھی قطار میں کھڑا کرنا چاہا تو انھوں نے کہا کہ میں داخل ہونے کو نہیں آیا۔ استاد نے ان سے بھڑک کر کہا: خاموش رہو اور چپ چاپ قطار میں کھڑے ہو جاؤ۔ اس معلم نے غالباً نا بھی نہیں تھا کہ حامد اللہ نے کیا کہا ہے۔ بلو غا دکر لایہ قطار میں کھڑے ہو گئے۔ اب ہیڈ ماسٹر صاحب نے آگے بڑھ کر قطار میں سے لڑکوں کا انتخاب شروع کیا۔ وہ جس لڑکے کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیتے تھے وہ قطار سے الگ ہو جاتا۔ یہ دونوں استاد شاگرد قطار میں ایک دوسرے کے برابر کھڑے تھے۔ پرنسپل صاحب نے حامد اللہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو ان کے شاگرد (یا استاد) کو چھوڑ دیا۔ اب اسکول کے اسی استاد نے ان سے نام، پتہ وغیرہ پوچھا شروع کیا۔ یہ پھر امتحان کوئے لگے کہ میں نویں درجے میں داخل نہیں چاہتا۔ میں اس کے لائق ہی نہیں۔ لیکن وہ استاد

ہوئے کہ جب نہ ویدیاشرما صاحب نے تھا اور اُنہیں کے لیے انتخاب کر لیا ہے، تو تم کو کون سمجھتے ہو ان کے دلوں نے دے تو صاحب، یہ گورنمنٹ ہائی اسکول کے نوں درجہ میں داخل ہو گئے، خیر یہ داخل ہونے کو تو ہو گئے، لیکن اس نعمت غیر مترقبہ کے باعث، ابھی خاص مصیبت میں بھی گرفتار ہو گئے۔ انھوں نے تارخ، جغرافیہ، ریاضی، حساب، الجبرا، اُپلیڈس، وغیرہ کا کبھی نام بھی نہیں سنا تھا۔ پہلی سلائی کے اخیر میں اُردو فارسی اور انگریزی میں تو کسی طرح پاس ہو گئے، بقیشہذا میں میں صفر۔ اس پر والد نے ان کے پڑھانے کے لیے خاص استاد کا انتظام کیا جسٹنٹا میں، ریاضی کے علاوہ دوسرے مضامین میں بھی بھلے بڑے پاس ہو گئے۔ پاس سے کچھ حوصلہ بڑھا، بہر حال سال کے آخر میں ششم پشتم چل نکلے۔ غرض انھوں نے ۱۹۲۰ء میں سرنہ کالج سے بی اے کی سند لی۔ اس کے بعد ایم اے اور دکالٹ کی تعلیم کے لیے علی گڑھ چلے گئے۔ لیکن میں امتحان کے زمانہ میں انھیں تب عرق نہ آدو جا۔ میرٹھ چلے آئے اور امتحان میں ٹریک نہ ہو سکے۔ اس کے بعد تعلیم کا مسئلہ ہمیشہ کے لیے منقطع ہو گیا۔

علی گڑھ کے قیام کے زمانے میں (۱۹۲۲ء) میں انھوں نے یونیورسٹی بورڈنگ ہاؤس میں رہنے کے بجائے شہر میں ایک کمرہ کر لیا۔ یہ کمرہ شہر بھر کے شاعروں کی آماجگاہ بن گیا۔ باہر کے شاعر بھی آکر ان کے وہاں قیام آداں دیتے، جھکو اور فانی کئی مرتبہ ان کے یہاں رہے۔ انھوں نے ایک پرچہ ”نوبہاد کے نام سے جاوی کر دیا جس کے لیے وہ غلط عنوان خود ہی تجویز کر کے دوستوں سے سفینوں لکھوائے وہ ہے۔ اس مسئلے کی ایک خط و کتابت یہی کہ اس کا ایک حصہ دوسرے مندی اور اُردو کے رسائل میں چھپنے والے تھا، مقالہ لاسا کے لیے وقف تھا۔ اس زمانے میں ڈائجسٹ کا یہ تصور بالکل نادر تھا۔

جب وہ علی گڑھ سے واپس آکر میرٹھ میں مقیم ہوئے، تو معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں انھوں نے ایک مقامی اخبار الفیل کی ادارت کے فراموش بھی انجام دیے۔

ان کے دوسری کی سند لینے کے بعد ہی سے والد ان کی ملازمت کے لیے کوششیں برسرِ شو کے پاس سفارشیں پہنچا رہے تھے۔ ان کا نتیجہ یہ ہوا کہ حامد اللہ صاحب نائب تحصیلدار

کے لیے نامزد ہو گئے۔ جب انھیں معلوم ہوا: انہوں نے والد سے احتجاج کیا کہ میں اپنی تعلیم جاری رکھنا چاہتا ہوں۔ اس وقت یہ میرٹھ کالج کے انٹر میڈیٹ کے متعلم تھے۔ والد نے ان کے شوق کے پیش نظر اصرار تو نہ کیا، لیکن یہ کہ اب ان کی مالی حالت اتنی اچھی نہیں تھی کہ وہ اتنے بڑے کپے کی پرویشن کے ساتھ ان کی تعلیم کا خرچ بھی برداشت کر سکتے۔ کالج کے پرنسپل مسٹر جیمز کو جب معلوم ہوا کہ اس طالب علم نے سرکاری ملازمت پر تعلیم کو ترجیح دی ہے، حالانکہ اس کے گھر کی مالی حالت کا تقاضا یہ تھا کہ وہ ملازمت قبول کر لیتا، تو وہ بہت خوش ہوئے۔ اس کا اظہار انھوں نے منجملہ اداسیوں کے اس طرح سے کیا کہ انھیں ایک انگریز مسٹر کننگھم کو اردو فاضل پڑھانے پر مقرر کر دیا۔ مشاہرہ چالیس روپے مقرر ہوئی۔ لیکن ایک مہینہ بھی شکل سے گزرا ہو گا کہ انھوں نے مسٹر کننگھم سے کہا کہ میں آپ کو اردو فاضل پڑھاؤں گا، آپ مجھے انگریزی پڑھا دیا کیجئے؛ اس صورت میں آپ کو مجھے تنخواہ دینے کی ضرورت نہیں۔ تھوڑی سی عرصہ میں کے بعد مسٹر کننگھم اس انتظام پر رضی ہو گئے، جس سے دونوں کو بہت فائدہ پہنچا۔ چنانچہ ہندوستان سے واپس جانے کے بعد کننگھم صاحب فائبرلڈ یونیورسٹی میں فاضل پڑھانے پر مقرر ہو گئے تھے۔ انھوں نے حامد اللہ افسر کی کئی نظموں کا انگریزی میں ترجمہ بھی کیا تھا۔

بی اے کا امتحان پاس کر لینے کے بعد ڈاکٹر ضیاء الدین (ف: دسمبر ۱۹۴۴ء) نے خوش حالی کی تھی کہ یہ سرکاری ملازمت میں بے لیے جائیں۔ لیکن افسر صاحب نے کہا کہ میں یا تو تمہارے کی اشاعت کا کام کروں گا، یا پھر تعلیمی محکمے میں پڑھانے کا۔ ۱۹۴۶ء میں ان کے والد مفتی محمد عصمت اللہ کا انتقال ہو گیا۔ تعزیت کے لیے آٹھ دنوں میں ان کے والد کے ایک دوست کا بیوی حکومت میں اچھا خاصا اثر و رسوخ تھا۔ ان کی وساطت سے دسمبر ۱۹۴۶ء میں وہ گورنمنٹ جوبلی کالج، لکھنؤ میں اردو پڑھانے پر مقرر ہو گئے، یہیں سے ۱۴ برس بعد ۱۹۵۰ء میں سبکدوش ہوئے۔ ملازمت کے آخری زمانے میں وہ کالج کے کانس پرنسپل کے عہدے پر فائز تھے۔

ان کے آخری ایام بہت تکلیف میں بسر ہوئے۔ آمدنی تقریباً مفقود، اسباب میشت کی دولت فروز دل گرانی، کبر سنا۔ ان کے نزدیک نے نہ حال کر دیا تھا جب وقت ہو گئی۔ یوپی حکومت اور یوپی اودو کا ڈپٹی نے کچھ مالی اسدادی، لیکن حالت خراب سے خواہتر ہوتی چل گئی۔ آخر کار بغرض علاج کھنڈنڈ کیل کامی کے تپ دن کے شعبے میں داخل ہو گئے تھے، لیکن اب حالت علاج کی حدود میں نہیں رہی تھی۔ وہیں ۱۹ اپریل ۱۹۱۷ء سرپرست شال ہو گیا۔ تجیز و تکفین اگلے دن ۲۰ اپریل کو ہوئی۔ قدیم اطباء نے لکھنؤ کے خاندانی قبرستان محلہ جھوائی ڈولک منی منمت میں بھی تھی۔

افسر نے شروگی بہت جلد شروع کر دی تھی۔ اول اول انھوں نے لوریان اور گیت لکھے۔ یہ آج سے ۶۰۔ ۷۰ سال پہلے کی بات ہو، جیسے وہ دواؤں کو ان باتوں کا علم بھی نہیں تھا۔ ان کی یہ لوریاں یوپی کے دیپاٹ میں لڈس اور بڑی بڑیاں آج بھی اپنے بچوں کو سناتی ہیں، اگرچہ یہ کسی کو معلوم نہیں کہ ان کا کہنے والا کون ہے۔ ان کا ایک مختصر مجموعہ "بچوں کے افسر کے عنوان سے لورائیں اٹھی نے چند سال پیش شائع کیا تھا۔ افسر کا نام خاص کر بچوں کے شاعر کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہوا، لیکن انھوں نے نظم و نثر میں خاصا بڑا ذخیرہ اپنی یادگار چھوڑا ہے۔ ان کی صحیح پہلی کتاب "چار چاند" ہے جس میں چار کہانیاں ہیں۔ یہ کتاب جوب پہلی مرتبہ چھپی ہے، تو وہ انٹر کے پہلے سال کے طالب علم تھے۔

اسی زمانے میں یہ گود کو ذیل انعام ملا، تو مسٹر کنسن نے انھیں مشورہ دیا کہ "یگور" کی کتاب کو اینٹ مون (کشتو) کا اردو ترجمہ کر دیں۔ چنانچہ انھوں نے ترجمہ کیا اور اس کا نام "ماوڑو" رکھا (مسٹر کنسن) نے "چھوٹی چھوٹی کہیں" نام تجویز کیا تھا یہ ترجمہ بہت مقبول ہوا اور اس کے ساتھ "چار چاند" بھی جو اب تک گناہم تھی، منظر عام پر آ گئی۔ دونوں کتابوں کے سال بھر میں کئی ایڈیشن نکل گئے اور ان سے افسر کا حساب ان وقت ہو گئی کہ وہ اپنے تعلیمی اخراجات کی طرف سے مفکر ہو گئے۔

ماوڑو کے ترجمہ کا شاخسانہ ایک اور طرح نمودار ہوا۔ انگریزی کتاب کے ناشر (ایکسپریس)

نے انہیں ہر حالے کا نوٹس دیا کہ تم نے مہادی اجازت کے بغیر مہادی "کا پی رائٹ" کیا ہے۔
 کا ترجمہ کیوں چھاپا ہے؟ یہ یہاں سے میدھے سادے آئی، بھلا ان قانونی موثر کاموں
 کو کیا جانیں؟ کھٹکے کا ٹکٹ لیا اور خود ہیگ روکی خدمت میں جا بیٹھے۔ ہیگ روکے انہیں اس
 ضابطے سے کھٹکے کی راہ بھجائی۔ کتاب کا ہندی ترجمہ بعنوان "ششوی" بھی چھپ چکا تھا
 اور اس کے جملہ حقوق خود ہیگ روکے پاس تھے۔ ہیگ روکے نے ان سے کہا کہ تم میک میلن کمپنی
 کے نوٹس کے جواب میں لکھ دو کہ میں نے اردو ترجمہ انگریزی سے نہیں بلکہ ہندی سے کیا
 ہے۔ یہی انہوں نے لکھ دیا، جس پر انگریزی ناشر خاموش ہو گئے اور یوں یہ بلا ٹل
 گئی۔ اس کے بعد ہیگ روکے سے عرب بھر کے بڑے ذاتی تعلقات قائم ہو گئے۔

ان کی تصانیف کی مختصر فہرست یہ ہے:

۱۔ نظم: پیام روح (الآباد ۱۹۲۷ء)؛ جوئے ڈان (لکھنؤ ۱۹۵۴ء) دونوں میں
 نظمیں اور غزلیں ہیں۔ دوسری کتاب پر حکومت ہونی نے ۵۰ روپے انعام دیا تھا۔ حق
 آواز (لکھنؤ ۱۹۴۲ء) دوسری جنگ عظیم سے متعلق نظمیں۔

۲۔ افسانہ: چار چاند (میرٹھ ۱۹۱۷ء)؛ ڈان کا جوگ (الآباد ۱۹۲۷ء)؛
 آنکھ کا نور (لکھنؤ ۱۹۴۰ء)؛ پرچھائیاں (لکھنؤ ۱۹۴۵ء)

۳۔ ڈراما: مفت منظر (لکھنؤ ۱۹۴۲ء) ایک ایکٹ کے ڈرامے۔

۴۔ تنقید: نقد الادب (لکھنؤ ۱۹۳۵ء) تنقید کی تاریخ اور اس کے اصول؛
 کتاب کی جنگ (لکھنؤ ۱۹۳۸ء)؛ نورس (لکھنؤ ۱۹۳۸ء) تنقیدی اصول
 اور نظریے (ادارہ فروغ اردو لکھنؤ)

۵۔ ترجمہ: ماموڈ (میرٹھ ۱۹۱۸ء) ہیگ روکے کریسٹ مونی کا ترجمہ

۶۔ قومیات: ہمارا بھنڈا (لکھنؤ ۱۹۵۸ء) پندرہ اگست (لکھنؤ ۱۹۴۷ء)

۱۰۔ تاریخ تحریک آزادی: گاندھی جی کے ساتھ (لکھنؤ ۱۹۶۰ء) گاندھی جی کے اقوال؛
 حکایات گاندھی کرسمس، دلی گاندھی جی کی روزمرہ کی زندگی کے سبق آموز واقعات۔

۷۔ مشق قافیات: آسمان کا مہایہ (الآباد ۱۹۵۴ء) ایڈیٹ کی کہانی؛ ترقی

کی رہیں، عملی نصیحتات (بچوں کے لیے) جانوروں کی عقلندی (کسنگم، دلی)؛ گلیلو، کاسفر، مارکس (بچوں کے لیے) سوفٹ کی مشہور کتاب کا ترجمہ؛ مکانوں کی کھانی۔ ان کے علاوہ انھوں نے بچوں کے نصاب کی متعدد کتابیں بھی لکھی تھیں۔ جو برسوں یوپی کے مدارس میں پڑھائی گئیں۔ غیر مطبوعہ کتابوں میں ایک طویل مشنری آدم نامہ اسے جس میں انسان کی آفرینش کا مقصد بیان کیا ہے۔ ایک مہم "ادب آفس" بھی ہے جس کا موضوع ادب تک زب۔ ادب اور اسکا شکوہ کی جنگ ہے۔ ایک اور کتاب "ذوق ادب کی تربیت" بھی لکھی تھی۔ ۱۹۶۷ء میں انھوں نے اپنی سوانح عمری لکھنا شروع کی تھی۔ خدا معلوم یہ ممکن ہوئی تھی یا نہیں۔

اب آخر میں چند شعر ملاحظہ کیجیے۔ بچپن کی ان کا طرہ امتیاز ہے۔ جن فطرت کے دلدادہ اور رجائیت کے علمبردار ہیں۔ عجب وطن اور نبی فوج انسان کے سہارا۔

ہزارین بچوں کے مالک! مجھے تمام سے کیا تم ہو
کہ تیرے کعبے میں رہنے والا ابھی خدا ہو، کبھی تم ہو
مجھے بتانا تھا حال کچھ تو وہ دیکھتے تھے کہ حال کیا ہے
مگر میں بے اختیار "افسردہ" رہا تھا، آپ کا کرم ہے۔

چاہتے ہیں اب تو یہ سودا یاں جستجو کاش، منزل پر کوئی کہہ دے کہ یہ منزل نہیں
ماروں کا گھوٹا رہیں آنا محال ہے۔ لیکن کسی کو نیند نہ آئے، ان کی کرے

جب دل پہ نہ ہو قابو اپنا، کیا ضبط کریں کیا صبر کریں !
بھر جیسے کاش، وہ ہو جائیں جو آکر کھاتے ہیں

بب خوشی کا خیال آتا ہے دل مایوس کا تب جاتا ہے
سدا میں آتی ہیں دھیمے نغمے میگلنے کی۔ ایسا نہ پھر نہیں امید نیند آنے کی
کیا پڑھتے ہو، کیا حالت ہے؟ جو بڑی ہے وہ سستے ہیں

پھر شام ہوئی، پھر رات ہوئی، یہ دن بھر دھڑک رہی تھی
فطری ہنس خاموشی لیکن کچھ چوٹ بھی دل پر کھائی ہے
یہیں لے کر دیکھا ہے، کچھ افسردہ چپ رہتے ہیں

یہ بھی اک نماشا ہے کا وہ بار الفت میں دل کسی کا ہوتا ہے، بس کسی کا جلتا ہے
اس قدر بھی الفت میں جو نہ کوئی بے قابو دل میں سوچتا کیا ہوں منہ سے کیا نکلتا ہے
انسان وہ ہے جو اے افسر! ٹھکرائے مصائب کو پیہم

سامل جبہ کہتی ہے دنیا، مہیا یہ ہے طوفانوں کا

حسن پہنچتی کے اندر نقاب حسن پھر بھی ہے حجاب اندر حجاب
دیر دم کعبہ پر حقیقت تو کھیلے اب الٹ ہی دیکھے رخ سے نقاب
جب سفر، افسر! کبھی کرتے نہیں دیکھتے پھر کیوں موقم منزل کے خواب
موت ہے وہ ماز جو آخر کھیل کا ایک دن زندگی ہے وہ معنا جس کا کوئی حل نہیں
جو چہاں موقم پہلے زندگی کا مدعا سمجھے خدا تو فیق ہے، تو آدمی خود کو خدا سمجھے
پس وہ، جس کی امیدیں ہیں خزاں پر موقوف

شاخ گل سوکھ کے گر جگ، تو کا شا دبے

کیف ماں کوئی بچہ سا بھی نہ ہو گا، افسر!

آنکھ جس پھول پڑا لی، وہی پیا نہ بنے

شعبے نہیں کم ہجر کے مادہ کی سحر بھی یعنی وہی فطرت ہے، وہی بھری ہے
اب آپ اسے دل کہیں، یا دل کی تشنا اگر آگ کسی افسر! مرے سینے میں بھری ہے
جو غم حد سے زیادہ ہو، خوشی نزدیک ہوتی ہے

چمکے ہیں ستارے رات جب تاویک ہوتی ہے

ہے زندگی عالم کی عمل ہی سے سرا فراز فطرت کے برانداستے اغشا ہے ہی راز
پردانہ سے مل جاتی ہے جگمگ کو ترے تاب تار ایک ہے جگمگ کا جہاں، مگر نہ ہو پرداز
بے روج س، بے جان سی پھر آج ہے دنیا دیران ہے، بر باد ہے، تار راج ہے دنیا
اب نہ نہیں یزدان سے تجھ سننے کا افسر! انسان سے کتنے سننے کی محتاج ہے دنیا

اثر حیدر آبادی، صدیق احمد

حضرت امیر مینائی (دف: اکتوبر ۱۹۰۷ء) کے شاگرد، شہید نفاحت جنگ جلیل مانچووی کے نام نہائی سے کون اور دودان واقف نہیں ہوگا۔ وہ امیر القلعات کی ترتیب تدریس میں استاد کے دست راست تھے۔ ۱۸۹۹ء میں جب نظام دکن میر محبوب علی خان شہائی قندھار کے لیے تشریف لائے، تو استاد داغ (دف: ۱۹۰۵ء) نے امیر مینائی کو اجنبی وہ اپنے قیام واپس لے گئے، نہ جانے تھے، نادان کے مقام پر حضور نظام کی خدمت میں پیش کیا۔ اعلیٰ حضرت نے ایمان فرمایا کہ امیر مینائی حیدر آبادی اور مانچووی کا صاحب چکا تھا، اور امیر بہت پریشان حال تھے۔ یہ تھوڑا سا سہارا ملنے پر انھوں نے پرانی اور گونا گونی جہانی عوارض کے باوجود طو عاؤ کرہ و نمین کا کالے کوٹوں کا سفر گوارا کر لیا۔ لیکن یہ سفر حیدر آباد کا نہیں بلکہ ان کا سفر آخرت ثابت ہوا۔ جہاں حیدر آباد سے ہو کر جانا ان کے مقدر میں لکھا تھا۔ دامن پھینکے چند ہی سہنے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔

امیر اس سفر میں اپنے چچے شاگرد جلیل مانچووی کو بھی ساتھ لیتے گئے تھے۔ استاد کی وفات کے بعد جلیل حیدر آبادی میں مقیم رہے، اور انھوں نے بقیۂ زندگی وہیں بسر کر دی۔ داغ نے ۱۹۰۵ء میں رحلت کیا، تو ان کے بعد میر محبوب علی خان مرحوم جلیل سے مشورہ کرنے لگے اور جب ۱۹۱۱ء میں خود ان کی رحلت کے بعد اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خان نظام مظفران کے جانشین ہوئے، تو انھوں نے بھی جلیل کی شاگردی اختیار کی۔ اس عہد میں جلیل کو بہت عروج حاصل ہوا۔ قدر دان شاگرد نے جاہ و منصب کے نوازے نہ

کوئی کمی نہیں بھڑی۔ جلیل نے یہیں حیدر آباد میں ۶ جنوری ۱۹۴۶ء کو سفر آخرت اختیار کیا۔ وصالہ تعالیٰ۔

صدیق احمد اثر انھیں جلیل کے سب سے بڑے صاحبزادے تھے۔ وہ ۲۲ اگست ۱۹۱۱ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی اور اس کی تکمیل دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ میں کی۔ یہ وہی زمانہ ہے، جب علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم (دفتر نمبر ۱۹۵۳ء) میں وہاں طالب علم تھے، ان دونوں کا یا زائد بھی تھا لکھنؤ سے فارغ ہوئے تو یہ بھی والد کے پاس حیدر آباد چلے گئے۔ وہاں وکالت اور عدلیہ کا امتحان دینے اور اس میں پاس کیا۔ (۱۹۱۹ء) ملا لکھنؤ میں پانچواں درجہ دارالامرا میں عہدہ دارالعدالت کے طور پر کام کیا، بعد کو ۱۹۱۵ء میں ریاست کے باقاعدہ ملازمت مل گئی اور منصف دیوانی مقرر ہوئے۔ بعد میں ترقی کر کے ناظم ضلع عدالت کے عہدے تک پہنچے اور بالآخر یہیں سے ۱۹۳۳ء میں ریٹائر ہوئے۔ (پنشن پر) سبکدوش ہوئے۔ وظیفہ پانے کے بعد حضور نظام نے اول ہجرت کو شہر خاں سفر کیا، پھر محکمہ صرف خاص (پریویجی پرسن) میں منصف بنا دیا۔ وہاں کی میعاد پوری کر کے بعد بھی فراغت اور فارغ البالی کی زندگی بسر کی۔ چونکہ لکھنے پڑھنے کا شوق تھا اور اب کوئی دوسری ذمہ داری حائل نہیں رہی تھی، اس زمانے میں انھوں نے ایک گلدستہ فصاحت و بلاغ جاری کیا۔ اس میں شاہیر عہد کا کلام شائع ہوتا تھا۔

جلیل کے انتقال (۱۹۴۶ء) کے بعد حضور نظام میر عثمان علی خان مرحوم اپنی وفات (۲۳ فروری ۱۹۶۷ء) تک اثر سے مشورہ سخن بھی کرتے رہے۔ انھوں نے اپنے کلام کی ترتیب و تدوین اور اشاعت کی نگرانی بھی ان کے سپرد کر دی تھی اور اس سلسلے میں احکام بھی جاری ہو گئے تھے۔ ان کی وفات کے بعد نظام ٹرسٹ قائم ہوا، تو محکمہ جاہ جہاد و نواب میر برکت علی خاں باقاعبہ نے اثر کو ادبی ٹرسٹ کا صدر نامزد کر دیا۔ چنانچہ نظام ہجرت مرحوم کا کلام مرتب ہو گیا اور اب شاید زیر طباعت ہے۔

وفات سے قبل دونوں آنکھوں میں بوجہ ابتداء ترایا تھا، اس کا آپریشن نہیں ہو سکا تھا۔

فہرستِ مبنائی بالکل زائل ہو گئی۔ اس کا اثر ان کے داغ پر پڑا اور توازن قائم نہ رہا؛ سوچھ بوجھ مطلق نہیں تھی۔ داغ کا علاج آخر وقت تک جاری رہا۔ اسی حالت میں اپنے مکان جلیل منزل، حیدر آباد میں بیٹے کے دن ۲۷ اپریل ۱۹۷۷ء (۱۴ جمادی الثانی ۱۴۰۲) فرسے پہلے چاہے انتقال کیا؛ عہد برس کی عمر پائی۔

خطا صالحین (نام پل) حیدر آباد میں ہیرد خاک ہوئے یہ سرکاری قبرستان ہے۔ اعلیٰ حضرت یرشٹان علی خان مرحوم کے عہد میں یرشٹان مخصوص بزرگ شخصیتوں اور عائد سلطنت کے دفن کرنے کو استواء ہوتا تھا، اب یہ بھی نظام چیرٹی ٹرسٹ کی نگرانی میں ہے۔ ان کے والد حضرت جلیل بھی اسی قبرستان میں آسودہ خواب میں

کتبہ نژاد کے لیے ان کے برادرِ خرد جناب علی احمد جلیل نے جیسوی میں تادخہ کیا؛
 وہ جو تھے صدیقی احمد خوش بسیر کر گئے اس دادِ خانی سے سف
 باے ہمس ازند سے مصرع ملا فاختہ ہر زہر و اثر کی قبر

(۶۱۹۷۲ + ۶۱۹۷۳)

مرحوم صاحب فن تھے جلیل کی قدرتِ کلام ادبِ اہل فن ان کے متعدد نظم و نثر کے مجموعوں سے عیاں ہے۔ انھیں اپنے والد کے شاگرد اور متبع تھے۔ انھیں کی طرح دوزخِ بشر اور نکاتِ عروض گویا ان کی گھٹی میں پڑے تھے جلیل کی وفات کے بعد ان کے اکثر کلاموں نے اثر سے رجوع کیا۔ اثر کا ضمیمہ دیوان ان کی زندگی میں مرتب ہو چکا تھا، لیکن انھوں نے اس کو آج تک اس کے شائع ہونے کی نوبت نہیں آئی۔ چند شعرا خط ہوں، جو ان کے برادرِ خرد جناب علی احمد جلیل نے عنایت فرمائے ہیں:

جان دیتا ہوں میں اس پر کہ مجھے یاد کیا	جمل منظور ہو یا نکل نہیں اس سے غرض
بال دہر با ندھ کے صیاد نے آزاد کیا	اس سے ظاہر ہے کہ بے شاق جدائی میری
نہ کوہ کوہا صفت نہکت ہر باد کی	یر سے دامن کی ہوا بھی کہ صبا کے جھونکے
ہجومِ حسرت در رخِ دالم میں دل نہیں	وہ دل لینے کو آئے ہیں، مگر طرہ تماشا ہے
ہر چپ زون ہو کہ کوئی بات کے قابل نہیں	تیری تصویر کا راز غموشی کہا کوئی جانتے!

کہاں کھویا کہاں بھولا، خدا جانے کہاں چھوٹا
 اٹرا اشعار تیرے سن کا اہل ذوق کہتے ہیں
 تجھے کوچے میں کب سے ڈھونڈتا ہوں دل نہیں لٹا
 غنیمت ہے یہ ناقص، جب کوئی کمال نہیں لٹتا
 شکر کا شکار کہتے ہیں مجھے
 گناہ کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے
 جو میکدے میں ہے دو با، جو شراب میں ہے
 کرا آئندہ بھی وہاں آج کل عتاب میں ہے
 جو میکدے میں ہے عالم، وہی خباب میں ہے
 آہ کی چنگاریاں شمع شیشاں بن گئیں
 پیاس میں وہ چند لونڈی آبِ حیاں ہو گئیں
 کیا دانگ ہے جو بن ہے عروسانِ چین کا
 ساغر جو عنایت کوئی صبا سے کہن کا
 ہر طرف خندہ گل، اخندہ پیمانہ ہے
 گل کا بلبل، نہ کسی شمع کا ہر دانہ ہے
 تھے اب تو قرار ملے دلِ ناخدا آگیا
 ہو گیا دل جو نفاذ، تو جگر یاد آگیا
 پیو، کی کے پیے ناوک جلا دیا
 میں ہوش میں کب ساقی بیگناہ نہیں ہوتا
 پرے سے عیاں رہے جا ناہ نہیں ہوتا
 نفس آباد، ویراں آسٹیاں گئے
 اندھیرے میں رواں یہ کارواں گئے
 زمیں نیچے ہے، اوپر آسماں ہے
 یہ تباہ دو، مری منزل کہاں ہے
 جہیں اس کی ہے، شگبستاناں ہے
 چمک اٹھیں اب قسمت آخر کی

نئے چائے نگہ بست . رہیں ہم بشار
 طرف اتنا ترے قربان کہاں سے لائیں !
 ہاں لی بات اُن کی دھوکا ہو گیا
 مکت میں خودِ تن ہو گھسیا
 حشر کا دن بھی 'ترے خوف کا دن ہے' لیکن

منہ دکھانا نہ ، الہی ! شب تنہائی کا
 حوصلہ دل کا ، نہ دل سے نہ جگر نے نکلا
 آنکھ بن بن کے مرے دید کا ترے نکلا
 پھاڑنا جیب و گریباں کا بھار کئے پر
 عاشقوں کا یہ طریقہ گل تر سے نکلا
 اتنی نسبت مری بخشش کو بہت کاں ہے
 تیرا بندہ ہوں ، تیرا نام بیا کرتا ہوں

حضرت عیسیٰ، مولانا بخش

کسی زمانے میں چیونٹ، ہضلع جھنگ، پاکستان میں قصا بوں کی بربادی بڑی با اثر اور متمول تھی، شاید اب بھی ہو۔ مولانا بخش اسی خاندان کے نورِ نظر تھے۔ چنانچہ وہ بھی کبھی الارا و تفسن کہا کرتے تھے۔

دولتِ دودمانِ قصا بیم

اگرچہ سرکاری اسناد اور کاغذات میں ان کی تاریخِ ولادت ۱۱ مارچ ۱۹۰۹ء درج ہے لیکن دراصل یہ یکم جنوری ۱۹۰۸ء تھی۔ خود بکھتے ہیں:

۱۲ مارچ پیدائش (دودخ، برگردن دادا) یکم جنوری ۱۹۰۸ء ہے باری

پیدائش کے موافق احترام میں اس روزہ کسی اور پارسی دنیا میں تعطیل

(شوالہ پنجاب ۲۵۰)

منان جاتی ہے۔

ابتدائی تعلیم اپنے وطن چیونٹ میں پائی۔ انٹر کا امتحان گورنمنٹ کالج، لائل پور میں

فیصل (ایم) اور بی اے کا امتحان کالج لاہور سے پاس کیا۔ چونکہ طبیعت میں شعر و ادب کا مذاق

تھا، اس کے بعد لاہور کے مختلف روزناموں اور ماہنامہ پرچوں میں لکھنے لگے۔ چنانچہ

اس زمانے میں انھوں نے روزنامہ احرام اور حریت (۱۹۲۹ء - ۱۹۳۱ء) اور

آخر شیرانی مرحوم کے ماہنامہ رسالوں خیالستان اور دودان میں کام کیا (۱۹۳۱ء - ۱۹۳۳ء)

اس کے بعد ۱۹۳۶ء میں ایم اے (فارسی) کر سند پرائیویٹ طور پر حاصل کی۔ اس زمانے

میں پنجاب یونیورسٹی میں شام کے وقت قافلان (دلا) کی تعلیم کا انتظام کیا گیا تھا۔ تاکہ

دفتران کے ملازم وغیرہ اپنے کام کاج سے فارغ ہو کر قافلان کے درجوں کی تعلیم

جیل کر سکیں۔ (خود میں نے وہاں سے ۱۹۳۲ء میں اسی طرح ایل ایل بی کا امتحان پاس کیا تھا) مولابخش نے بھی اسی سے فائیدہ اٹھایا اور یوں ایم اے ایل ایل بی ہو گئے، اب انھوں نے چیونٹ میں وکالت شروع کر دی۔ اور رفتہ رفتہ زیادہ تر ان کی مزدوری کی پشت پناہی اور ان کے دروغ سے، اور کچھ اپنی محنت اور دیانت کی بدولت، ان کا وہاں کے اچھے وکیلوں میں شمار ہونے لگا۔

چیونٹ کے اسی قیام کے دوران میں انھوں نے اپنا ذاتی مہقتہ دار پرچہ "جہاں نما" جاری کیا تھا۔ وکالت اور ادبی پرچے کی ادالت، دونوں ایک ساتھ نہیں چل سکتے۔ چنانچہ سال بھر کے اندر پرچہ بند کرنا پڑا۔ لیکن ہے یہ کہ درحقیقت کسی مرحلے پر جس وقت انھیں دس نہیں آئی، شاید چیونٹ کا دیہاتی ماحول بھی مسترد رہا ہو گا۔ کچھ ہو، ۱۹۳۶ء میں وہ گورنمنٹ کالج، دھرمسالہ میں اردو فارسی کے مدرس مقرر ہو گئے۔ شکل

سے سال بھر وہاں گزارا ہو گا کہ شعلی ہو کر اب کے لاہور میں وکالت شروع کر دی یہاں لاہور میں حکومت وقت اور ریڈیو نے ان کی صلاحیتوں کا بھرپور فائدہ اٹھایا، نگار دیہات سدھار و بنیاد نے انھیں اپنا تعلیمی امن مقرر کر دیا۔ اس میں جہاں انھیں پنجاب کے دیہاتی علاقے کی خاک چھانٹنا اور تقریباً ہی کرنا پڑا، وہیں نکلنے کے انبار و بنیاد کی ادالت بھی ان کے سپرد ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی وہ چراغ نصیر جیت دت (جون ۱۹۵۵ء) کے مہقتہ دائر شیرازہ "اور مجید لاہوری (د: جون ۱۹۵۷ء) کے "نگران" میں مزاحیہ مضامین اور نقیص بھی لکھتے رہے۔ سیاسی نوعیت کے مضمون "فائیدہ" کے قلمی نام سے "روزنامہ" "نواسے" دت میں لکھے جاتے تھے۔ یہ سلسلہ ۱۹۵۶ء تک رہا۔ اسی دوران میں ۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۷ء تک وہ مجوز ذوقی طور پر انیسویں کالج لاہور میں لکچرر بھی رہے۔

انہیں سب طرف سے فارغ ہو کر پھر لاہور ہائی کورٹ میں وکالت شروع کر دی تھی اور اچھے وکیلوں اور قانون دانوں میں گنے جاتے تھے۔

اپریل ۱۹۷۰ء لاہور میں انتقال ہوا۔

ادب اور موسیقی گویا ان کی گھنٹی میں چمکے تھے۔ اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ وہ طالب علم کے زمانے میں بھی طبلہ بجانے میں لا جو رستے چوں کے طبلہ ڈانڈوں میں سے تھے، یہ فن انھوں نے سبقتاً سبقتاً اساتذہٴ وقت سے سیکھا تھا۔ شعر میں زیادہ توجہ طنز و مزاح اور سپرد و ڈی پر مبذول رہی، مگر چمنبیدہ کلام بھی مقدار میں کچھ کم نہیں ہے۔ انھیں مکالمہ لکھنے میں خاص مہارت تھی۔

اسی انداز کی ایک نظم، مناظرہٴ سازنگی و طبلہ، ملاحظہ ہو، جس میں چودھری خوش بھٹناظر کی نظم، جوگی و شاعر کا اثر نمایاں ہے، بھر بھی دسی ہے:

دنیا بھر کے بیٹے گروں نے کل بزمِ سرور سہائی تھی

کیا دل کو سنا تھا طبلہ، کیا سازنگی رنگ لائی تھی

بس کی رنگ جان تھی تھیں طاؤس کی ماریں روض سے

جانے کا پیالہ دہریہ تھا، جتنے نے دھوم مچائی تھی

زندوں نے چھندے گاڑے تھے، ڈہانے دیرے لے تھے

اس دیر و حرم کی عقل میں، موسیقی سمانے آئی تھی

یاں شوکے سے پُرساؤنگی، واں بیچ و تاب میں تھا طبلہ

مگر بھر کی زباں یاں چلتی تھی، واں ہاتھوں کی بنائی تھی

واں تھا کچے اور جتنے تھے، ہنموں کی چھپا رہی تھی

یاں ہر دل پر موسیقی کے گہرے سے خوات، لگا ل تھی

اڑتی تھیں نضا بھر میں تائیں، تھی چال صبا کی ستا

اس حال میں بیچ میں دونوں کے جا بیٹھا شاعر مثلاً:

سازنگی بولی طبلے سے، تم یونہی شور مچاتے ہو

مے منہ پھٹ طبلے دیوانے، بیوں کا ہی پکارتے ہو

آواز تھا رہی کوڑے سی اور شکل چھلاوے سی تیری

ان پیش پیش مالوں سے، تم رنگ میں بھگ لاتے ہو

لغت ہے تمھارے بیٹے پر آرام نہیں عز کا بھی نہیں
 میں گو دوں شیشی پتی ہوں، تم سراپا پتو اتے ہو
 ہے خام بھی، تک عشق ترا، کچھ صبر نہیں کچھ تاب نہیں
 یاں تان اڑی اک شیشی سی، واں تمھام کے دل جاتے ہو
 میں واج دلا دی لیل نامی ہوں، پر ہم کھیا ہوں
 تم موٹھی کاٹے مردک ہو، ہر جا پردہ لگے کھاتے ہو
 تہذیب تمھیں منظور نہیں، اور عقل ترا دستور نہیں
 تم بھیم کتاؤں میں باہر کیوں آپے سے جوتے ہو
 ناؤں سے پلی شہزادی ہوں، میں ناری کلوں والی ہو
 تم جس ددام کے قیدی ہو، عند توں میں ٹٹ جاتے ہو
 جب سادگی نے طبلے سے یوں دھنکی کا کلام کیا
 کچھ دیر تو وہ خاموش رہا، پھر بھائی جان کو سلام کیا
 یوں کہنے لگا سادگی سے: جلتی پر تیل گھواقی ہو
 ہم رخ دالم کے مارے ہیں، تم آگرا و دستا تی ہو
 عشاق سے یوں منہ پھیر کیوں، پھر قے نہیں آگیر کیوں؟
 بنے ددا سے چپ، مجبور، کیوں میری زبان کھلاتی ہو
 میں زنجبار کا شہزادہ، میدان میں اگر خیفم سا
 جب ایک دہار لگا، ماما ہوں، تم پردوں میں جاتی ہو
 پیانو دفا جس سے باز محو ہیں پاس آئی کے بٹیاں
 تم ہر جاتی ہو، ہر اک کے پہلو میں دل بہلاتی ہو
 کچھ لطف ہے بیسہ کو بی میں سر پہوٹنے میں ہم سنتوں کو
 لی! یہ تو عشق کے دیور ہیں، تم یوہی ہمیں بناتی ہو
 عورت پر ہادی حرف لڑی؟ اللہ غنی، اللہ غنی

وہ وقت بڑی بی بھول گئیں، جبکہ انہیں کھواتی ہو
 تو پریم کنیا بھفل میں کس برباک سے حکاقت ہے
 گو یوں تم بھولی بھالی ہو، کچھ کہتے بھی شرمانی ہو
 میں میری شمیم نغمہ کو، مانند نسیم ادا کرتا ہوں
 یہ میری تھاپ کی برکت سے، دل بزم میں مٹے باقی ہو
 جب لڑکے کی کرکاتے ہیں، عرفان کی تائیں اُڑاتے ہیں
 ہاتھوں سے میز بجاتے ہیں، تم یاد کب ان کو آتی ہو
 میں آؤ عشق کی، آبش سے دل بھفل کے گھرا تا ہوں
 فادس کو، طنبورے کو، تجھے دل میں آئے دیکھتا ہوں
 یہ جس کو خمس الریح ڈرے، تلوار مبادا اجل چلے
 اور طبلہ مسکتا رہ جائے، سازنگی روتی رہ جائے
 چمکاے سازنگی سے: تم سیدھی سادی بھولی ہو
 زیبا نہیں، مگر منہ میں ترے گنواروں کی سی بولی ہے
 غلط کے دیکھل مطلق نے، داں ہاتھ سے اس کو سمجھایا
 اچھا نہیں، خوں کی ہنروں سے مگر محفل بھر میں بولی ہو
 تم زنجیبار کے شہزادے، سازنگی، سازنگی ٹھہری
 پھبتی نہیں، مگر شہزادوں کی ایسی بولی بھولی ہو
 خاموش ہو میں بی سازنگی، اور طبلہ صم بکرتا تھا
 یوں جیسے کسی نے زبان، اپنی آب کو خرمیں دھولی ہو
 انقصہ بھیرش دوسرے ملے، نہ جھگڑا تھا، نہ جگہ تھا
 نے تن تنائی، تن تن تھی، نے تاکڑ تاکڑ دھیا تھا

نشار (ٹاوی) 'نشار حسین

یکم مارچ ۱۹۱۴ء کو ٹاویہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد داد حسین صاحب عطر فروش تھے؛ ٹاویہ کے محلہ مقصود پورہ میں ان کا دکان تھی۔ اس سلسلے میں ایک لطیف بھی ہے۔ کیٹی کے رجسٹر میں ان کے نام کے ساتھ دلہنیت کے خانے میں کپہ راج (عرف پکھو) لکھا ہے۔ یوں یال ہوتا ہے کہ کوئی ان پر رحم عودت اندر راج کر لے گئی؛ اسے ان کے والد کا نام معلوم نہیں تھا، اس نے ماں کا نام لکھوا دیا۔ ترقیوں بعد خود شاد صاحب نے اس کی اصلاح کرانی۔

ابتدائی تعلیم انھیں ہدایت الاسلام جوینر ہائی اسکول میں پائی۔ آٹھویں درجے تک یہاں پڑھے۔ اس کے بعد چونکہ حالات کی عدم موافقت کے باعث مزید تعلیم ممکن نہیں تھی، اپنے اسکول ہی میں بارہ واپسے شاہرے پر مدد سے قبول کر لی۔ اسی زمانے میں انھوں نے شعر کہنا شروع کیا اور اسکول کے ہیڈ ماسٹر خیداد ٹاوی سے اصلاح لینے لگے۔ اکتوبر ۱۹۳۳ء میں مقامی اسلامیہ اسکول جمال انٹر کالج میں ایک کل ہند مشاعرہ ہوا تھا۔ حضرت سیاب اکبر آبادی (ف۔ جنوری ۱۹۵۱ء) بھی اس میں مدعو تھے۔ شاد نے بھی غزل پڑھی۔ سیاب مرحوم اسے سن کر چونکے۔ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ خیداکے شاگرد ہیں۔ انھوں نے شاد کو جو ہر قابل پاکر انھیں اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ اس کے بعد یہ آخر تک سیاب کے حلقہ تلامذہ میں شامل رہے۔ شاد نے بھی ان کی تہذیب تربیت میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کیا۔ ان کا شمار سیاب کے ممتاز فارغ التحصیل شاگردوں میں ہوتا تھا۔

اس واقعے کے تھوڑے ہی دن بعد وہ نوکری سے الگ ہو گئے۔ یوں معلوم ہو رہا ہے کہ چونکہ ان کے پاس ٹرننگ کی سند نہیں تھی، اس لیے جب اسکول کا سالانہ معائنہ ہوا تو سرکل انسپکٹر نے اس نے یہ بات اپنی رپورٹ میں درج کر دی۔ اس سے اسکول کی امدادی رقم میں تخفیف ہو جاتی۔ لہذا اسکول والوں نے انھیں نوکری سے برخواست کر دیا۔ اب یہ پریشان حال تھے۔ بارہ بیہوش شاہ دادلہ نے کچھ سہا دیا۔ وہ خود مفلوک لگا۔ غصے، کتنی حد تک تھے، بہر حال اس سے سر چھپانے کا آسرا ہو گیا۔ اس زمانے میں انھوں نے کچھ رقم حاصل کرنے کے لیے ایک ڈراما "سوداگر بچہ" لکھا اور اسے بیس روپے میں فروخت کر دیا۔ اس سے انھیں کچھ حرائث ہوئی اور انھوں نے ایک طویل نظم "سیر پرستان" بھی اس میں بازار حسن اور اس کے کیفیوں اور اس سے وابستہ لوگوں کا طنزیہ آغاز میں خاکا اٹایا گیا ہے۔ اس پر شہر کی طوائفوں نے بہت شگامہ برپا کیا جس سے واقعہ ہے کہ خدا صاحب کو لینے کے دینے پڑ گئے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ اس زمانے میں انھیں کچھ عشق بازی کا بھی تجربہ ہوا۔ تحصیل میں جانے کی ضرورت نہیں اگرچہ میں پورا واقعہ جانتا ہوں، ان کے زمانے کے کلام میں اس کے ۱۰ نمبر کی تلمیحات موجود ہیں۔ بہر حال یہ طوفان بحیرہ خوبی گزر گیا، بعد کے زمانے میں وہ اس پر توجہ کیا کرتے تھے۔

بیہوش دادلہ صاحب ان کے لیے کوشش کر رہے تھے۔ ان کی دس اطفال سے ہر مہینہ تحصیل میں زائما میں کی جگہ پر تقرر ہو گیا۔ لیکن چونکہ اس اسامی کے لیے کچھ زبردستی بطور ضمانت جمع کرنا پڑتا ہے، اور اس کا انتظام نہ ہو سکا، وہ اس موقع سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔ اس کے بعد بیہوش صاحب سب نے سفارش کی اور انھیں دوبارہ اپنے اسی پرانے انجمن ہدایت الاسلام اسکول میں عارضی جگہ مل گئی۔ آٹا دہ کا اسلامیہ ہائی اسکول اپنے زمانے میں بہت مشہور تھا۔ اس کے فادغ تحصیل طلبہ میں بعض مشاہیر کے نام ہیں۔ ذرا ذکر کریں مرحوم سابق صدر جمہوریہ ہند بھی ان میں سے تھے، یہاں کے ہڈا جاب الطاف حسین مرحوم، خدا بخش، بڑی خوبیوں کے لرشتہ صفت بزرگ تھے۔

انہوں نے شاد کی بے بس کا اندازہ لگایا کہ اگر انھیں سہارا نہ ملا تو بے با دبان کی کشتی کی طرح طوفان بھائب کا شکار ہو جائینگے۔ انہوں نے دستگیری کی اور انھیں اسے اسکول میں جگہ دے دی۔ یہ گویا ان کے لیے شاہراہِ ترقی پر پہلا قدم تھا۔ یہیں سے انہوں نے ملازمت کے دوران میں کچے بعد دیگرے انٹر اور بی اے، اور ایم اے اور اے کے امتحان ناگہور دیو نیوڈیسی سے پاس کیے۔ اسکول کے زمانے میں بھی وہ اردو کے صدر مدرس رہے اور جب یہ ترقی کر کے انٹر کالج بنا، تو صدر شعبہٴ اردو مقرر ہو گئے۔ اپنی وفات تک وہ اسی عہدے پر قائم رہے۔

انہوں نے ۶ مئی ۱۹۷۲ء کو گلے کے کینسر سے انتقال کیا۔ ایک مرحلے پر ان کے کانٹے کے فیضیوں اور دوستوں نے چندہ جمع کر کے ان کے علاج کی پیشکش کی، لیکن مرحوم نے اسے قبول نہ کیا۔ کہا: یہ مرض لاعلاج ہے صحت تو بچے اب نصیب ہو نہیں سکتی، آپ حضرات کیوں اپنے گناہ سے پسینے کی کٹائی برباد کریں! ڈیڑھ برس بیمار رہے اور آخر اس میں جان بحق ہو گئے۔ انہوں نے دیکھنا ہی کیے تھے پہلی بیوی موضعِ لہجور کی تھیں۔ ان سے ایک لڑکا ہوا لیکن یہ معلوم کس بات پر اختلاف ہو گیا اور انہوں نے اس بیگم سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اس کے بعد دوسرا نکاح ۱۹۳۳ء میں جالوں کے ایک معز نگہ کرنے میں ہوا۔ اس سے چھ بچے ہوئے: چار بیٹیاں اور دو بیٹے۔ ان میں سے صرف بڑی بیٹی (دراغہ) کی شادی اپنی زندگی میں کر سکے تھے۔ یہ بیگم اور ان کی اولاد ماٹارالشاہہ میں موجود ہے۔

اگرچہ خاں صاحب نے شاعری ۱۹۳۰ء میں شروع کی تھی، لیکن ان کا اصل دور شعر گوئی یہاں کے تلمذ کے بعد شروع ہوا۔ اب تک وہ صرف غزل کہتے تھے، اس کے بعد نادر کے کہنے پر انہوں نے نظم پر بھی توجہ کی۔ ہندی بھی اچھی جانتے تھے۔ انہوں نے ۱۹۳۵ء میں ہندی کا ویشیش یونیورسٹی امتحان پاس کیا تھا (اس لیے انہوں نے اردو میں ہندی ٹیٹل کے تجربے کیے۔ ان کا ایک مجموعہ ہندی میں دھرتی میرے پیار کی "شائع ہو چکا ہے۔ مدت ہوئی، اردو کلام کا ایک مختصر انتخاب" ماہِ دسمبر کے عنوان سے شائع ہوا تھا (دتی ۱۹۵۲)۔ یقیناً بہت کلام غیر مطبوعہ رہ گیا ہو گا۔ کس زمانے میں کلام

بڑے دلکش انداز میں بڑھا کرتے تھے۔ لذتِ لذت وہ پہلا اندازِ رخصت ہو گیا، جلد تھک جاتے تھے کسے معلوم تھا کہ یہ گلے کے کنیسر کا آغاز ہے۔

کلامِ پنجہ اور فنی پہلو سے بے عیب ہے، اور بیجا طور پر وہ سیما ب کے ارشدِ تلامذہ میں گنے جاتے تھے، مرنے کے چند شعرا نظر میں:

کس گوشہ خلعت میں ہاں ہے دنیا ہے بھی کہ فقط وہم و گماں ہے دنیا
چمائی میں تھوڑی سی جگہ ہے اب بھی لانا تو زور اکوئی کہاں ہے دنیا
زہاد کی تسبیح ریا چھوٹ بڑی آنکھوں سے امیدوں کی کرن چھوڑی
گھونگھٹ سے جو منکر کے جھانکا اس نے آلاش سے شرما کے دھاک ٹوٹ بڑی
سوچتے ہیں سبِ منزل، یہ منٹا کیا ہے! جس سے گزرتے تھے اسی راگنڈ رکے پیچھے
جو لوگ بیاں کچھ کر دے کے، دیکھ لگے وہاں کیا کرتے ہیں

امروز بہ جن کا زرد نہیں، اندیشہ افرا کرتے ہیں

ناہید و قرنے راتوں کے ماحول کو روشن سو تو دیا

وہ وہی کسی سے جل نہ سکے جو دل میں جا لاکرتے ہیں

بادِ عشق کو ہے جنتِ شرطا لم عقد اگر کا نپتا ہو، جامِ نلے

شوق کتنے فریب دیتا ہے مسکرا کر ہمارا نام نلے

یہ بھی بیا کر دردِ ترا کے تلاش یہ بھی ہوا کہ ہم ترے در سے گزرتے

مبتلا سنجس، عقل کی منزل فریادیں گمراہ بن گئے راگنڈ سے گزرتے

نالے مہاے عرش پہ پیچھے تو تھے، مگر نکج کر زرا مقامِ اثر سے گزرتے

رگِ رخسار میں ہے سرورِ محبت کا انبساط اب تم حدودِ قلب و نظر سے گزرتے

آنکھوں سے دل کا کام نہ لینا تھا، لے لیں جلوے تڑپ کے دامِ نظر سے گزرتے

سرورِ بڑھ رہی ہیں مرے دل کی دھڑکتی جیسے ابھی کہیں، وہ ادھر سے گزرتے

مریخ جانِ بہن دو، لیکن اس کا مارے کوئی کمر اس کی ڈی، دوستی معلوم ہوتی ہے

مٹا ہے دل کو تیری گل میں سگون سا کیا اس زمین پر غائب نیگیوں نہیں!

اے عقل! ساتھ رہ کہ پڑ چکا تھی سے کام
 بعد کو انشاء! ذخیرہ نظر نے کیا خواب
 میں بدل گئے ہیں کچھ کہ مہلتاں مل گیا
 جس سے وہی، شک وہی، مگر ساٹل گیا

موجِ نینل، گل کا تبسم، پر تو شبنم، بجلی کا سایہ

دھوکا ہے دھوکا عہدِ جوانی، اس کو جوانی کوئی نہ سمجھے

اُن کی ہیں منت، میری بھی منت، دونوں میں کیوں کتنا افتاد

ان کے اشارے دنیا سمجھے، میری کہانی کوئی نہ سمجھے

ماہیہ ہم نے دنیا ہے فانی، فانی سمجھنا ہے نادانی

بچنے کی دل میں گر جوتا، مہینا کو فانی کوئی نہ سمجھے

دامن تو یہ رہا، مگر اے موسمِ بہار! میں سوچتا یہ ہوں کہ مری آستیں بھی تھی

زندگی کی بارے وہ باتیں بھی کیا یاد آئیں ہوں

ان سے جب چپ چپکے کوٹھے پر ملاقاتیں ہوں

مگ گئی جب چپ تو گھنٹوں بت بنے میٹھے رہے

پھر عجیب باتیں، تو پھر وہ دہر پڑتیں ہوں

یاد ہے اب تک دھلتے کا پسینا، یاد ہے

ان سے جب پہلے پہل میری ملاقاتیں ہوں

وہ گئے وہ اپنے دانتوں میں دو چاداب کو

آنکھوں آنکھوں میں خدا معلوم، کیا باتیں ہوں

ایک بجلی آسمان پر ایک بجلی گود میں

زندگی میں بار بار ایسی بھی برساتیں ہوں

اے نثار! اب تک مرا ہر سانس ہے بکا ہوا

تو تو اس لطف کے سایے میں برساتیں ہوں

ہم کی بھی دیوانگی بھائی نہیں، پر کیا کریں ہاتھ اگر آجائیں خود اٹھ کر گریبانوں کی پٹی
 پھر دے گیا فریبِ تسلی کوئی مجھے اب صبر آچکا مجھے، موت آچکی مجھے
 تیسرے شیعہ دیر و چراغِ حرم نہیں پردہ اڑ ہوں، نہیں بھی لمحہ دشمنی مجھے
 صبح بچھڑ کر شام کا وعدہ، شام کا ہونا سہل نہیں

ان کی تنہا پھر کر لینا، صبح کو پہلے شام کر دو
 موسمِ گل ہے، بادل چھائے، کھٹک ہے ہیں پیمانے

کبھی تو بہ! تو بہ! تو بہ! تو بہ! تو بہ! تو بہ! تو بہ! تو بہ! تو بہ! تو بہ!
پوچھا کسی نے اسے نثار! مقصدِ شاعری ہے کیا؟

میں نے کہا حضورِ دوست ایک طریقِ احساس

امجد (مجید امجد) عبد المجید

۲۹ جولائی ۱۹۱۴ء کو پنجاب (پاکستان) کے شہر جھنگ گلیاں میں پیدا ہوئے۔ جب ان کے والد میاں گل محمد نے دوسری شادی کر لی، تو عبد المجید کی والدہ اپنے کسی بیٹے کو ساتھ لے کر چلے گئیں۔ ان کے ماما میاں تو محمد فاضل عربی کے عالم تھے۔ انہیں کی انگریزی میں ان کی تعلیم شروع ہوئی۔ فاضل عربی کے علاوہ کچھ طب بھی پڑھی۔ اس کے بعد دینی تعلیم شروع ہوئی۔ ۱۹۳۰ء میں مقامی اسلامیہ بائی اسکول سے دسویں کی سند لی۔ پھر گورنمنٹ انسٹرکٹنگ کالج، جھنگ میں داخلہ لیا، اور یہاں سے ۱۹۳۲ء میں انسٹرکٹنگ امتحان پاس کر کے لاہور چلے آئے۔ ۱۹۳۳ء میں اسلامیہ کالج، لاہور سے بی اے میں کامیابی حاصل کی۔ اس کے بعد تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

کسبِ روزگار کا مسئلہ پیش آیا، تو سب سے پہلے ایک قانون گو صاحب کی زیر نگرانی اسے دھندکان کی فہرٹیں بنانے کا کام ملا۔ جو ۱۹۳۵ء کے الیکشن کی دوسری انتخاب کے لیے تیار ہو رہی تھیں۔ یہ کام عارضی تھا، اور چند ہفتوں میں مکمل ہو گیا۔ اس کے بعد وہ لاہور آئے۔ انہیں انڈیا انشورنس کمپنی کے ایجنٹ بن گئے۔ لیکن اس کام کے لیے جس محنت و مشقت کی ضرورت ہے، وہ ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس میں متواتر سفر نامہ لکھنا۔ صبح کہیں، شام کہیں، غرض سال بھر کے اندر اندر وہ اپنی پیشہ سے دست بردار ہو گئے۔

کچھ پڑھنے کی عادت شروع سے تھی، اور جھنگ کے ادبی حلقوں میں بھی وہ غیر معروف نہیں رہتے۔ اسی زمانے میں دہلی ایک نیم سرکاری رسالہ "ترویج" جاری ہوا۔ اس کا بیجاڑ

کی نظر امجد صاحب پر پڑی اور وہ اس کے حیرت قرار ہو گئے۔ یہاں تقریباً دس برس ۱۹۳۵ء تک رہے۔ یہ دوسری جنگ عظیم کا زمانہ تھا۔ حکومت کسی تحریر پر عروج سے ناراض ہو گئی، نازک روایتی عضو ضعیف پر گرا، اور مجید امجد کو لاہوری سے جواب مل گیا۔

صحافت کے اس تلخ تجربے کے بعد قائد شریک بورڈ جنگ میں بطور وکیل ملازم ہو گئے۔ یہ تعلق چار برس تک رہا۔ ۱۹۳۹ء میں پاکستان کے محکمہ خودک (فوڈ ڈپارٹمنٹ) میں جگہ مل گئی۔ وہ ملازمت کے اختتام تک اس محکمے سے وابستہ رہے، اور ۱۹۷۲ء میں اسسٹنٹ فوڈ کنٹرولر کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔

ان کی زندگی کے آخری ۲۷-۲۸ سال مایوسانہ سابقاً منگوری میں بسر ہوئے۔ ملازمت کے اختتام کے بعد بھی انھوں نے یہاں کی سکونت ترک نہیں کی۔ ان کے والد کی دوسری شادی سے خاندان کا شیرازہ تو بکھرا ہی تھا، مجید امجد کی زندگی شفقت پروری کے فقدان کے باعث محرومی اور تلخی کا نمونہ بن گئی۔ بد قسمتی سے ان کی اپنی ازدواجی زندگی بھی بالکل ناکام رہی۔ ان کی شادی اپنے ۱۷ کی بیٹی سے ہوئی تھی، لیکن نبھ نہ سکی۔ اور وہ رطلاقی لیے بغیر ان سے الگ ہوئے گیئیں۔ ان سے کوئی اولاد بھی نہیں تھی۔ وہ محکمہ تعلیم میں ملازم تھیں اور کئی ہائی اسکول کی ہیڈ ماسٹری سے دیتا تر ہوئیں، آخری زمانے میں ان کی بنیادی بالکل ضائع ہو گئی تھی۔

مجید امجد بالکل اکیلے رہتے تھے۔ آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں تھا اور بڑی تنگی ترشی سے گزارا کر رہے تھے۔ ایسے جانگزا حالات میں کئی انھوں نے اپنی خودداری کی حفاظت کی، اور کبھی کے سامنے دست سوال دہرا نہیں کیا۔ جو روکھی سوکھی شیر آگئی، ہبشر کب سے اسی پر گزرا گیا۔ آخر ان کے بعض دوستوں کے توجہ دلانے پر حکومت پاکستان نے ۱۹۷۳ء میں ان کا پانچ سو روپے ماہانہ ادائیگی کا فیصلہ مقرر کر دیا، لیکن اب سب سے زیادہ آگیا تھا۔ دو مہینے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ یہ حادثہ بھی بڑے الٹا حالات میں

ان کے ساتھ ان کی ملازمت کے زمانے کا ایک پرانا چیراں (علی محمد) رہتا تھا۔ وہ بازار سے سودا سلفے آتا اور وقت بوقت ان کا چھوٹا موٹا کام بھی کر دیتا۔ صبح جب وہ اپنے کام پر جاتا، تو عیداً مجدد کی ہدایت کے مطابق باہر سے تالا وال دیتا اور واپس پر اسے کھول دیتا۔ ۱۳ مئی ۱۹۷۴ء کو بھی یہی ہوا۔ ۹ بجے صبح تالا بند کر کے وہ چلا گیا۔ لیکن صبح دو بجے واپس آیا، تو اسے ان کی جگہ مجدد کی لاکشس زمین پر چڑی ملی۔ لاش جھنگ ٹھنی اور اٹھلے دن درامنی (وہیں سپرد خاک ہوئی)۔

زمانے کی تسم ظریفی دیکھئے کہ زندگی میں تو کسی نے یہ تک نہ پوچھا کہ کہو بھی، کیسے بسر ہو رہی ہے؟ مرنے کے بعد ساہوال کے مشہور باغ "کستان پادک" اور شاہوال ہال کا نام بدل کر علی المرتب "ابجد پادک" اور "امجد ہال" رکھ دیا گیا۔ زمانے، اس زور و پشیمان کا پشیمان ہونا۔ مسکری مہناس نے قطعوں اور پنج وفات کہا۔

موت ہو چکا ہے، گراؤں جو ہر قابل کی موت	وہ بے عقل، مجاہد سے عیداً مجدد ہوئے
کیسے کیسے دوست کسری اچل جیے منہ پھر کر	دوستی کے جتنے دعوت تھے وہ سارے نہ پوئے
چن زیادہ ست قضائے ہر محل شاداب کو	زندگی پر اسے فلک ترے کرم بید ہوئے
عجز و انشاد و خلوص و بے ربائی کے تصور	ایک شخص ایسا تھا جس سے عمر بھر فرشتے
نغمہ میں کا ہر نفس، ہر بات تھی سحر حلال	وہ نشان زندگی بھی زینت مرقد ہوئے
ایک روشن طبع تھا جس کی بدولت کتنے دوست	محفل شعر و ادب میں زینت مسند ہوئے
جس کے لب میں دولت کے تے تول کی طرح نکلی	اس کے گیتوں میں ڈھلے جتنے بھی جہاد ہوئے

سیوی میں فرد نکلا مصرع سال وفات

"داخل باغِ جاں عبد الجید ابجد ہوئے"

(۲۱۹۷۴)

وہ بہت کم عمری میں شعر کہنے لگے تھے۔ لیکن حالات کی بھوری نے اشاعت سے محروم رکھا۔ ایک مختصر انتخاب شب رفتہ کے عنوان سے ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا تھا۔ بقیہ کلام کا مسموٹ مجموعہ اسی کی موت کے بعد ۱۹۷۶ء ۱۹۷۷ء میں منظر عام پر آیا۔

اگرچہ انھوں نے غزلیں بھی کہیں، لیکن وہ اصل وہ نظم کے شاعر ہیں۔ ان کا کلام بہت بڑا ہے۔ حزن و دلال کی زمیں بہر تو ہوتا ہی چاہیے کہ نوراں کی اپنی زندگی کہاں کی آدام آسائش اور شہد و سرور کی زندگی تھی! لیکن جس انداز سے وہ زندگی اور اس کے مسائل کو دیکھتے ہیں، وہ سراسر ان کا اپنا ہے۔ انھوں نے زبان اور اسلوب میں بھی کئی تجربے کیے۔ انھوں نے زندگی میں انھیں وہ مقام ملا، جس کے وہ بجا طور پر مستحق تھے۔ اب نمونہ کلام ملاحظہ ہو:-

حسین

وہ شام صبح وہ عالم تھی جب بسرِ حدشا
مر کا تھا آ کے ترقا قافلہ، ترے خیام
مناج کون دمکان تجھ شہید کا سجدہ
زمینِ کرب و دلا کے نمازیوں کے امام
نیکوئے قلم نے بتایا، جہانِ دالوں کو
کہ ہے فرات کے ساحل سے سلسیلِ کلام
سوارِ مرکب و دوشِ رسول، گو دہول
چراغِ عقلِ ایماں، ترا مقدس نام

زمین

وہ قتل گاہ، وہ لاشے، وہ بیکوں کے خیام
وہ مہات جب تری آنکھوں کے سامنے رہی
یہ کون جان سکے، ترے دل پہ کیا گزری
ستم کی رات کی کالی قنات کے ہتھے
تری ہی برقعِ صدا کی کوہِ کسے کا تھے
یہ ذریعہٴ مظلّا، شہنشاہوں کے خیام
جہاں پر سایہ کنجاں ہے ترے شرف کی بودا
اکھر دیکھے ہیں ترے خیمہ انگڑوں کے خیام
کیا کہیے کیا حجابِ جیا کا فساد تھا
سب کچھ بس اک نگاہِ کرم کا بہار تھا

یہ کون ادھر سے آ رہا، میں سمجھا حضور تھے
 اک چہرہ، اس پہ لاکھ سخن تاب نہ گئیں
 لے غم! میں، دل یہ تری دل لڑا لڑیاں
 لے، دھڑکنوں سے بھری راتیں بید
 اس جلتی دھوپ میں یہ گھنے سایہ مار پڑ
 ابدا طریقے میں ہے یہ احتیاء شرط۔
 اک بوڑا دروازے جو دیکھا، رانا تھا
 لے جرات نگہ! تری قسمت میں کیا تھا
 ہم کو تری خوشی کے لیے مسکراتا تھا
 میں ان کو دیکھتا تھا، کوئی دیکھتا تھا
 میں اپنی زندگی انہیں دے دیا جو ہر
 اک داغ بھی کہیں نہ سر پہ رہیں پڑے

بہار

ہر بار، اسی طرح سے دنیا
 سونے کی ڈال سے ڈھالتی ہے
 مسکوں کی کلی کی زرد موت
 تھا ہے جسے غم ہوانے

ہر بار، اسی طرح سے شاخیں
 کھلتی ہوئیں کوئلیں اٹھائے
 دستوں کے سلاخیوں سے لگ کر
 کیا سوچتی ہیں، یہ کون جانے!

ہر بار، اسی طرح سے بوندیں
 پھولوں بھری بدلیوں سے چھن کر
 آتی ہیں مانتوں پہ پھیلے
 مانے کے درق کو ٹھن ٹھنلے

ہر سال، اسی طرح کا موسم
 ہر بار، یہی جھکتی دودی
 ہر صبح، یہی کشور آسنو
 رونے کے کب آئینگے زمانے !

توسیع شہر

بیس برس سے کھڑے جو اس گھاتی نہر کے دواہ
 جھوٹے کھیتوں کی سرحد پر بانگے پہریدار
 گھنے، سہانے، چھانڈ پھرنے، پودوں سے چھنار
 بیس ہزار میں بک گئے سادے ہرے پھرے انجدار

جن کی سانس کا ہر جھونکا تھا ایک عجیب طلسم
 قاتل تیشے چیر گئے ان بادخون کے جسم

گڑی دھڑام سے گھائل پڑیوں کی نیل دیوار
 کٹے ہیکل، چھٹے پنجر، جھرمٹے برگ و بار
 بھئی دھوپ کے زرد گھٹن میں لاشوں کے انبار
 آج کھڑا میں سوچتا ہوں اس گھاتی نہر کے دواہ

اس عقل میں صرف اک میری سوچ ہلکتی ڈال
 اس پر بھی اب بکا دی ضرب اک المے آدم کی آل

اب یہ مسافت کیسے طے ہو، المے دل تو ہی بنا
 کتنی غراؤں گھٹنے نا صلی، پھر بھی وہی صرا
 چیت آیا، چیتا ڈلی بھی اپنا دھن بھنجا
 پت جھڑ آئی، پتر مٹکے، آجیوں بیت چلا

خوشیوں کا کچھ چوم کے دکھاء دنیا مان بھری
 اپنا پیکر، اپنا سایہ، تکانے کو سنبھل
 اپنے گرد، اب اپنے آپ میں گھلتی سوچ جھل
 کا پتے کی اک دیوار فنا، آنے سے سامنے ہم
 راہیں دھو کہیں شایفس کو کہیں اکا اک شعل
 دکھٹے کہتے لاکھوں ٹکڑے ہر کس کی تینے
 جنوں عشق کی رسم عجیب، کیا کہتے!

آخر کوئی کناوا، اس سیل پیکراں کا
 شاید دھر سے گزرتے پھر بھی ترا سینہ
 یہ کیا عجیب نا ہے، سمجھ سکوں تو بات ہے
 مری تباہیوں کا بھی فناء کیا فساد ہے!

چراغ بجھ چکا، پتنگے مل چکے، سحر مٹا
 دل سے، ہرگز وہی بات گزری ہے
 چاندنی، نیم وا در بچہ، سکوت

دکھ وہ، کچھ کٹھن کو جس کو روض کوئے سجدا
 دودی کی جب شگفتہ ٹوٹی، کوئی قریب تھا
 کس کے دست ادا کیسے دشمن، سب دکھایا
 نظروں سے نظروں کا بندھن، جسم سے جسم
 کتنی تیز چلی ہے اب کے دھول بھری دھوا
 بولی تو اکراک کی دیسی، ہانی سب کی جڑ
 میں ان سے دور وہ مجھ سے قریب، کیا کہنا
 آخر کوئی اداوا، اس دور زندگی کا!

بیٹھا ہوا ہوں ساحل پر نے بلب کھلی کا
 نہ اب وہ ان کی برقی، نہ اب وہ اتفاق
 دجیلیوں کا تذکرہ، نہ آئیاں کی بات ہے
 مگر ابھی مری جدائیوں کی رات رات ہے
 کس قیامت کی رات گزری ہے
 آنکھوں آنکھوں میں رات گزری ہے

ریاض الفزاری، ریاض الدین، قاضی

ان کا آبائی وطن ضلع بلندشہر (دہلی) کا قصبہ جیور تھا۔ انیسویں صدی میں اس علاقے میں نیل کی کاشت بڑے وسیع پیمانے پر ہوتی تھی، اور یہ بیت لفع مذہب کا رو بار تھا۔ وہاں کے قاضی رفیع الدین صاحب بھی نیل کی آٹھ کوٹلیوں کے مالک اور اپنے علاقے کے متولی زمیندار اور رئیس تھے۔ لیکن یورپ نے مصنوعی نیل کی دکان شروع ہوتی تو اس نے تجارت کو بھی گھن لگنا شروع ہو گیا۔ کسا و ہزاری کے باعث رفتہ رفتہ ان کی حالت خراب ہونے لگی۔ چنانچہ جب ان کے بیٹے قاضی حسام الدین ان کے وارث ہوئے تو خاندان کی شان و شوکت میں بہت کمی آچکی تھی۔ لیکن وہ منہ میں روایتی چاندی کا چھریے پیدا ہوتے تھے، اس لیے ان کے لیے بدلے حالات سے سمجھو سا کرنا ممکن نہ ہو سکا۔ رہی یہی کسر شاعری نے پوری کر دی، آزاد و تخلص کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حسام الدین کا سارا وقت یار باشی میں گزرتا اور ان کی اولاد نے خاندانی عظمت کے افسانوں کے سوانے اور کچھ نہ پایا۔

قاضی ریاض الدین انھیں قاضی حسام الدین کے دوسرے بیٹے تھے۔ یہ ۱۸۹۷ء میں جیور میں پیدا ہوئے۔ عربی اور فارسی کا ابتدائی نصاب وطن میں نجی طور پر پورا کیا۔ مگر کاجو رنگ سٹھا، اس میں ان کی مزید تعلیم کی طرف کسی کو توجہ نہیں تھی۔ خوش قسمتی سے ان کے بڑے بھائی قاضی عزیز الدین رشتاں جو پہلے سے نقل مکان کر کے اپنے ناموں کے پاس گوالیار چلے گئے تھے، جیور آئے اور چھوٹے بھائی کو اپنے

ساتھ بولے گئے۔ اس وقت ان کی عمر ۱۳-۱۴ برس کی ہوگی۔

گوالیار میں انھوں نے ۱۹۱۶ء میں دسویں کی اور ۱۹۱۸ء میں انٹر میڈیٹ حاصل کی۔ پہلی عالمی جنگ کے اختتام کے بعد ۱۹۱۸ء میں اس ملک میں انگریزوں نے واپسی کی شکل میں پھیل گیا تھا۔ بلا معاوضہ لاکھوں جاہل اس مرض کا شکار ہو گئے تھے۔ اسی میں انھیں عزیز الدین رشتاں بھی خدا کو پیارے ہو گئے۔ والد کا انتقال اس سے تین چار سال قبل ہو چکا تھا، اب بڑے لمبا فیملی دامن مفارقت کے بعد وہ بالکل بے یار و مددگار رہ گئے۔ اس لیے آگے تعلیم کا سلسلہ جاری رکھنے کا کیا امکان تھا، بلکہ مرحوم بھائی کے اہل و عیال کی دیکھ بھال کی ذمہ داری بھی ان کے ناتوان کندھوں پر آ پڑی، جس نے انھیں ملازمت تلاش کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس پر انھوں نے مقامی گورنمنٹ ہائی اسکول میں اردو فارسی پڑھانے کی ملازمت اختیار کر لی تین چار برس کے علاوہ ان کا سارا زمانہ ملازمت اسی اسکول میں گزرا۔ وہ ۱۹۵۴ء میں سبکدوش ہوئے۔

تعلیم کا سلسلہ انھوں نے حالات کی مجبوری سے منقطع کیا تھا، نہ کہ اپنی خوشی سے۔ جب حالات موافق ہوئے تو انھوں نے اس کی مکمل پورا کرنے کی از سر نو کوشش کی۔ ۱۹۳۰ء میں بلا تنخواہ رخصت لی اور چار سال علی گڑھ یونیورسٹی میں لکچرر بن گئے، اس سے لے کر ایم اے (اردو فارسی) اور بی اے تک کے امتحان پاس کئے۔

۱۷ برس کی عمر تھی، جب انھوں نے ۱۹۱۴ء میں شعر گوئی شروع کی۔ ان کا پہلا شعر تھا:

بوجھ قدم سے جب سنبھل سکتا نہیں تلوار کا

کیا کرو گے خون دم دس بیس کا، دو چار کا!

یہی زبان کی طرف رجحان ان کی شاعری کا طرہ امتیاز ہے۔ اسی نے انھیں نوح نادری (ف: ۱۹۶۲ء) کا نظم اختیار کرنے پر آمادہ کیا۔ ۴۰ برس کی مشق میں بہت کچھ کہا، لیکن کوئی مجموعہ کلام شائع نہیں ہوا۔

اردو کے عاشق تھے۔ ہزم اردو گوالیار گویا انھیں کے دم سے زندہ تھی، ۱۹۱۹ء

سے ۷۲ء ۱۹ء تک اس کے سکتر رہے۔ اس بزم کے اہتمام میں جو شاندار کل ہند مشاعرے ہوتے، وہ ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ ان کا انتظام مرحوم خود ہی کیا کرتے تھے۔ ان کی اردو دوستی کا ایک اور واقعہ قابل ذکر ہے۔ ان کی طویل اور کامیاب مدد سی کے اعتراف میں ۲۴ ۱۹ء میں ریاست نے انھیں انسپکٹر مدارس کی اسامی پیش کی مگر جن نے یہ پیشکش قبول کرنے سے اس لیے معذرت کر دی کہ ان کے چلے جانے سے گورنمنٹ اسکول میں اردو پڑھانے کا کوئی انتظام باقی نہیں رہے گا۔ اور ممکن ہے کہ اس پر یہ درجہ ہی بند کر دیا جائے۔

ان کی بیوی کا جو ان کے اپنے خاندان ہی کی تھیں، ۱۱ ۱۹ء میں انتقال ہو گیا۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے اولاد سے نہیں نوازا تھا، لیکن میاں چوری میں مثالی محبت تھی۔ ان کی دائمی جدائی کے بعد بچہ کے رہ گئے۔ مختلف امراض نے آگھیرا۔ دل کا پہلا دورہ ۷۲ ۱۹ء میں پڑا، اس سے توبیح نکلے، مگر تاجکے ۲ جون ۷۴ ۱۹ء کو اچانک تاراج کا حملہ ہوا، اور بایاں حصہ میکار ہو گیا۔ فشار دم کا عارضہ پہلے سے تھا، دماغ کی نس پھٹ گئی۔ بارہ دن تک مقامی بے آروغیہ اسپتال میں رہوش رہنے کے بعد ۹ جولائی ۷۴ ۱۹ء علی الصباح تین بجے جان بحق ہو گئے۔ اسی دن ظہر کے وقت کرخیل حسن خان دہلے قبرستان، کمپو لشکر گوالیار میں اپنی مرحومہ بیوی کے قریب دفن ہوئے۔

فیاض احمد خان فیاض گوالیار سی کے قلعے میں تاریخ کا شعر ہے :

کہا ہاتھ نے سینہ چاک کر کے
ریاض خلد ہے جاگسیر ان کی

(۱۹۷۶ - ۱ - ۷۴ - ۱۹۷۶)

ان کا کوئی مجموعہ ان کی زندگی میں شائع نہیں ہوا۔ یہ چند شعر مختلف رسالوں میں مطبوعہ غزلوں سے انتخاب کر کے دیے رہا ہوں۔ زبان کی شاعری ان کا طرہ امتیاز ہے۔

انہیں دیکھے زمانہ ہو گیا ہے یہ قصہ اب فائدہ ہو گیا ہے

محبت نے ہماری جان لے لی قضا کا تو بہانہ ہو گیا ہے

ہجوم غم نے یوں احساس کو میرے مٹا ڈالا

مصیبت بھی مصیبت اب نہیں معلوم ہوتی ہے

کہانہ سخاکہ محبت کا ہے بُرا انجام بس اب تو لے دل خانہ خراب! دیکھ لیا

نہ وہ میں، نہ دل ہے، نہ قسمت نہ دنیا محبت میں کوئی ہمارا نہیں ہے

خدا فی بھی ان کی، زمانہ بھی ان کا نہیں ہے تو کوئی ہمارا نہیں ہے

وہ ہوں نامراد فنا جہاں میں جیسے موت کا بھی سہارا نہیں ہے

کہاں کی دوستی کہیں کی محبت، کیسی غمخواری

یہ اندازِ غلو میں درد مندوں دیکھنے کیا ہوا!

نہ کیوں دیکھو غلو میں باہم اربابِ میخانہ

یہ ترسودہ نزاع کفر و ایمان دیکھنے کیا ہوا

حیاتِ غمگین کی تغویوں کو اسی طرح خوشگوار کروں

خوشی نہیں سازگار مجھ کو، تو غم ہی کو سازگار کروں

ارادۂ ترکِ عشق و الفت تو، ہمتیں امیں ہزار کروں

جو یہ میرے اختیار میں ہوا تو میں اسے اختیار کروں

آج یہ گھر سے مرے کون ہوا ہے رخصت! کیوں فسرہ درد و ہوار نظر آتے ہیں

حیرتِ جنت میں، نہ واعظ ہیں، نہ زہدیار! یہ تو دنیا کے گنہگار نظر آتے ہیں

کسی کا سنگدرد ہے، اور میں ہوں بہ میلہ دردِ دوسرے، اور میں ہوں

محبت دیکھ لی، اہلِ وطن کی ریاضی! اب اپنا گھر ہے اور میں ہوں

یہ دو جملوں میں ہے ردا و غم بیمارِ الفت کی

جودن ہے وہ مصیبت کا، جو قسب ہے، وہ قیامت کی

بجا ہے تو نے جو، اے ناصح مشفق! نصیحت کی
مگر جب چین بھی صے بیگلی، درو مجبشت کی
کوئی کبشت ہی اب رکھ سکے گا دل کو فنا ہو میں
جوانی، وہ بھی ان کی! اور وہ بھی اس قیامت کی!

ریاض! اس کا چہپا نامحال ہے کہ عیشِ شوق نہ رازِ بن کے رہیگا، نہ رازِ ہونے کے رہا

دنیا ہے الگ اوروں کی، مرے فن کا جہاں اور
رنگ اور روش اور، بیاں اور، زبان اور
بے اُن کے، نہ رُست وہ، نہ سماں وہ، نہ فضا وہ
وہ تھے تو فضا اور تھی، رُست اور، سماں اور
اقرار میں انکار ہے، انکار میں اقرار

ان شوقِ حسینوں کی نہیں اور ہے، ہاں اور
ویدان کی پہل ہی سہی ممکن مگر کہاں!

ذوقِ نظر بھی ہو، تو جمالِ نغمہ کہاں!
ہر چیز میں ہے پُر تو حسن و جمالِ دوست
لیکن ہر اک نگاہِ حقیقت نگر کہاں!
جا تو رہا ہوں جوشِ جنوں میں کہیں، مگر
لے جا رہا ہے جوشِ جنوں، کیا خبر، کہاں!
محوِ طلب کو جوشِ طلب میں کہاں یہ ہوش
منزل کہاں ہے، راہِ کدھر، راہِ ہر کہاں!

یہی دنیا یہی دنیا کے عیشِ بیکراں ہونگے
یہ سب ہوگا مگر اے عمرِ فانی! ہم کہاں ہونگے!
اب آئے ہو تو بیٹھو بھی ذرا، کل کی خبر کیا ہے
نہ جانے تم کہاں ہونگے! نہ جانے، ہم کہاں ہونگے

غم ہستی، غم الفت، غمِ دُورِاں ہو کر
 غم بہ ہر رنگ رہا، از لبت کا عنوان ہو کر
 کر لیا ضبط غمِ عشق بھی بالفرض، ریا من
 رہ سکو گے غمِ دُورِاں سے گریزاں ہو کر؟

غمِ دل کا نگہبان ہوا جاتا ہے ہر وقت کا مہمان ہوا جاتا ہے
 اس دور کی کشمکش! الہی! توبہ انسان، پریشان ہوا جاتا ہے

کوئی بہ دم نہ رہا کوئی یگا نہ رہا
 کوئی مسکن نہ رہا، کوئی ٹھکانہ نہ رہا
 دن وہی رات وہی صبح وہی شام وہی
 ہم وہی ہیں، مگر اپنا وہ زمانہ نہ رہا
 نہ انگلیں، نہ ترنگیں، نہ مسرت، نہ امید
 یہی جینا ہے، تو اس جینے میں کیا رکھا ہے!
 یہی کہنا ہے، ہر اک دیکھ کے صورت میری
 تو نے کجخت! یہ کیا حال بنا رکھا ہے!

محمد حسین حسان

ان کا خاندان دراصل مہسوان کا رہنے والا تھا، لیکن خود ان کی پیدائش ۱۹۰۷ء میں پہلی سمیت میں ہوئی۔ والدین کا بچپن میں انتقال ہو گیا تھا۔ والد کا نام محمد نبی جان تھا۔ اردو فارسی کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ پھر مدرسہ اسلامیہ بریلی میں عربی پڑھی اور اس کی تکمیل ورا العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں کی۔ ۱۹۲۷ء میں جامعہ قلیۃ اسلامیہ دہلی میں چلے آئے۔ اسی زمانے میں انگریزی کی طرف توجہ کی۔ لیکن ۱۹۳۰-۱۹۳۱ء میں کانگریس کی نمک سازی کی تحریک میں شرکت کے باعث جلد ہی یہ سلسلہ منقطع ہو گیا، اور پھر اس طرف توجہ نہ کر سکے بہر حال اتنی قابلیت پیدا کر لی تھی کہ انگریزی کتابوں سے باسانی استفادہ کر سکتے تھے۔ اسی زمانے میں دہلی کانگریس نے اردو، ہندی، انگریزی تینوں زبانوں میں خبر نامے شائع کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔ اردو کے نگران اور ذمہ دار شفیع الرحمن قدوائی مرحوم (فدہ پڑی ۱۹۵۳ء) تھے اور انگریزی کے رگھونندن مرین، بی اے (کینب) (ف: دسمبر ۱۹۵۳ء)۔ قدوائی مرحوم نے اردو خبر نامے کی ترتیب و تدوین میں محمد حسین حسان کو اپنا معاون مقرر کیا۔ یہ خبر نامہ کوئی سال بھر شائع ہوتا رہا تھا۔ جب قدوائی صاحب گرفتار ہوئے، اور قید خانے بھیج دیئے گئے، تو چندے بعد خود حسین حسان صاحب بھی گرفتار کر لیے گئے۔ حوالات کے زمانے میں پولیس نے ان پر بے پناہ مظالم توڑے۔ مطالبہ یہ تھا کہ بتاؤ، یہ خبر نامے کس چھاپے خانے

میں چھپتے ہیں ۹ (یہ ایک الگ دلچسپ داستان ہے کہ رگھوناتھ مرین صاحب ان کی طباعت کے لیے کیا کیا پاؤں پلٹے تھے۔ کیونکہ کوئی مطبع ان کے چھاپنے کا خطرہ مول لینے کو تیار نہیں تھا)۔ حسان صاحب نے سب سختیاں برداشت کیں، لیکن منہ سے ایک لفظ نہیں بولے۔ بالآخر قید کی سزا ہوئی۔

قید سے رہائی کے بعد وہ مکتبہ جامعہ میں ادبی معاون مقرر ہوئے اور بعد کو ”پیام تعلیم“ کی ترقیب ان کے سپرد کر دی گئی۔ ”پیام تعلیم“ شروع میں بچوں کا رسالہ نہیں تھا۔ اسے مسیح الملک حکیم اجمل خان (ف: دسمبر ۱۹۶۲ء) اور عبدالحمید خواجہ پیرسٹر (ف: دسمبر ۱۹۶۲ء) کے ایما پر ڈاکٹر صاحب مرحوم (ف: مئی ۱۹۶۶ء) اور ڈاکٹر سید عابد حسین مدظلہ نے ۱۹۶۶ء میں جاری کیا تھا۔ ڈاکٹر سید عابد حسین ہی اس کے اڈیٹر مقرر ہوئے تھے۔ اس کا مقصد عوام کو جامعہ قیہ کے کاموں سے باخبر رکھنا اور انہیں نئے نئے تعلیمی مسائل اور تجربات سے مانوس کرنا اور ان کی طرف توجہ دلاتا تھا۔

جب محمد حسین حسان مدیر معاون ہو کر آئے، تو انہوں نے بہت خاموشی سے اسے آہستہ آہستہ بچوں کا پرچہ بنا دیا۔ اس زمانے میں خالص بچوں کے لیے اچھے میاں کا قابل مطالعہ مواد بہت کم تھا۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم کو بچوں کی تربیت سے جو دلچسپی تھی، وہ کسی سے مخفی نہیں۔ حامد علی خان (ف: ۱۹۶۳ء) مکتبہ جامعہ کے نیچر تھے۔ ان کی تنہا قی سوجھ بوجھ بلا کی تھی۔ انہوں نے اس خوشگوار قید جلی کو مافی مفاہ کے پہلو سے جانچا۔ غرض دونوں نے محمد حسین حسان صاحب کے کام کی تحسین کی! اور ”پیام تعلیم“ نے بہت جلد اس صنف کے صفِ اول کے پرچوں میں اپنی جگہ بنائی۔ حیدر آباد اور کشمیر کے محکمہ تعلیم میں یہ منظور شدہ فہرست میں شامل ہو گیا، اور ان دونوں ریاستوں کے مدارس کے لیے اس کی سرکاری خریداری منظور ہو گئی۔ (۲۱) سے اس کی اشاعت کہیں سے کہیں پہنچ گئی! اسی کی حامد علی خان مرحوم کو توقع تھی۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس دور میں اس

کے مضمون نگاروں میں خود نوکر صاحب کے علاوہ پروفیسر محمد مجیب، پروفیسر رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر سید عابد حسین کے نام بھی ملتے ہیں۔ شفیع الدین نیز کاچوں کے شاعر کی حیثیت سے نام اسی زمانے میں چمکا۔ آج کے بعض مشہور لکھنے والوں نے مضمون نگاری کی ابتدا پیام تعلیم ہی سے کی تھی۔ اس کے سالناموں اور خاص نمبروں کا بھی اس دور میں بہت شہرہ تھا؛ بلکہ اس کی یہ خصوصیت تو آج تک قابلِ محال ہے۔

محمد حسین حسان صاحب نے لکھنا دارالعلوم ندوۃ العلماء کی طالب علمی کے زمانے میں شروع کیا، بلکہ شاید اس سے بھی کچھ پہلے۔ مدتوں ان کے مضامین الناظر (لکھنؤ)، نقیب (بدایون)، زمانہ (کانپور)، شمع (آگرہ) وغیرہ میں شائع ہوتے رہے شرمع میں زیادہ توجہ عربی مضامین کے تراجم پر رہی۔ ان کا ایک طویل مضمون ”عمود غزنوی کی ہزم ادب“ بالاقساط جامعہ میں شائع ہوا تھا۔ لیکن ان کے اصلی جوہر پیام تعلیم کی ادارت کے زمانے میں کھلے۔ انھیں پہلی متغیہ اور سلیس زبان اور روزمرہ پر حیرتناک قدرت حاصل تھی۔ بچوں کی نفسیات اور ان کی پسند اور ناپسند کا انھیں گہرا شعور تھا۔ اس لیے انھوں نے بچوں کے لیے معلوماتی مضامین اور کہانیاں لکھیں۔ یہ بہت مقبول ہوتیں۔ ان کی سب سے پہلی کتاب آنحضرت صلعم کی سوانح عمری ”سرکارِ دو عالم“ کے عنوان سے شائع ہوئی تھی۔ اس کی مقبولیت کا کچھ اندازہ اس سے لگا جیتے کہ اب تک اس کے ۱۸-۱۹ ایڈیشن چھپ چکے ہیں، یہ کسی زمانے میں ریاست میسور کے مدارس کے نصاب میں شامل تھی۔ ان کی دوسری کتاب ”دنیا کے بچے“ کا بھی یہی حال ہے، اس کے بھی ۱۵-۱۶ ایڈیشن کل چکے ہیں۔ ایک اور کتاب ”نامورانِ اسلام“ تھی؛ اس پر انھوں نے بہت محنت کی تھی اور اس کا مواد شرعی تحقیقی سے فراہم کیا تھا۔ چھپنے سے پہلے مسودہ ڈاکٹر نوکر صاحب مرحوم اور علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم (مذہب) کو دکھایا تھا، تاکہ اس میں کوئی قابلِ اعتراض بات نہ رہ جائے۔

یہ تقسیم سے کچھ قبل (غالباً ۱۹۲۵ء) میں پہلی بار شائع ہوئی تھی۔ میرے علم میں تقسیم کے بعد اس کا کوئی ایڈیشن شائع نہیں ہوا۔ وہ اس پر نظر ثانی کر رہے تھے۔ اس کا مسودہ یقیناً محفوظ ہو گا۔ یہ کتاب اس قابل ہے کہ اسے دوبارہ شائع کیا جائے۔ یا دیا، ان کی ایک اور مفید اور معلوماتی کتاب ”ہماری زمین“ بھی تھی۔ اس میں مختلف مآخذ سے سائنسی کرائف جمع کر کے یکجا کر دیے ہیں کہانی کے پیرایے میں؛ بڑے کام کی چیز ہے۔

تقسیم ملک کے ساتھ مکتبہ جامعہ پر بھی ابتلا آئی۔ پیامِ تعلیم بند ہو گیا جب جامعہ ملیہ کے دفاتر ادا کھلا آئے، تو انھوں نے کوشش کی کہ اسے دوبارہ جاری کیا جائے لیکن کامیاب نہ ہوئے۔ اسی زمانے میں جامعہ نے ایک ادارہ ”تعلیم و ترقی“ کے نام سے قائم کیا تھا۔ اس کا مقصد بالعموم کے لئے لٹریچر پیدا کرنا تھا۔ حسین حسان صاحب اس ادارے سے وابستہ ہو گئے۔ اس جگہ انھوں نے جہاں دوسروں کے مسودوں پر نظر ثانی کی اور انھیں اشاعت کے لیے تیار کیا، وہیں خود بھی بہت کچھ لکھا۔ اس میں سے کچھ چھپ گیا، کچھ مسودوں کی شکل میں رہ گیا (اور اب تک غالباً ویک کی نظر ہو چکا ہو گا)۔ ”ازم کس پر؟“ ”آستین کا سانپ“، ”اٹلی دوا“، ”برف کا گھر“، ”چاند“، ”تاؤ کے ایڈیشن“، ”زمین کے سجاوے بہن“، ”رامو نے پڑھنا سیکھا“، ”ویک“، ”کتنی زمین وغیرہ“ یہ کتابیں اسی زمانے میں شائع ہوئیں۔

۱۹۴۳ء میں پیامِ تعلیم دوبارہ شائع ہونا شروع ہوا، تو ترتیب کے لیے قرعہ قائل پھر ان کے نام پڑا۔ وہ آخر تک اس کے مدیر رہے۔

صحت بہت دن سے سقیم چلی آرہی تھی۔ وے کا عارضہ تھا۔ بہت ہی نحیف و نزار ہو کے رہ گئے تھے۔ اگر کثیر العیالی اور بچی مجبوریاں مانگیں نہ ہوتیں، تو وہ کہہ کے ان جھیلوں سے الگ ہو چکے ہوتے۔ لیکن ہندوستان کے ادیب کی قسمت میں آرام صرف کنارِ بحد میں لکھلے ہے۔ اسی حالت میں ۱۲ جولائی ۱۹۴۴ء

کو انہیں حبس بول کی تکلیف لاحق ہو گئی۔ اس پر وہ اسپتال میں داخل ہوئے۔
 نکلے دن ۱۳ جولائی ۱۹۷۷ء (دوہین مول چندا اسپتال میں) صبح ساڑھے چھ بجے
 کے قریب حرکت قلب بند ہو جانے سے رحلت کی۔ اسی دن ظہر کے بعد جامعہ
 لمیہ کے قبرستان میں سپرد خاک ہوئے۔ انا بئد وانا الیہ راجعون۔

میرا ذاتی تعلق ان سے ۱۹۳۶ء سے تھا۔ اور میں نے عربی کا پہلا سبق اسفین
 سے پڑھا تھا۔ اس زمانے میں جامعہ لمیہ کے دوسرے عملے کے ساتھ وہ سبھی
 قردل باغ میں رہتے تھے۔ حسن اتفاق سے میں نے بھی کرائے کا مکان اسی
 جگہ لے لیا۔ جب ان سے خاصا رابطہ مضبوط پیدا ہو گیا تو ایک دن میں نے ان
 سے عربی پڑھنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ وہ بے حد خدمہ پیشانی سے اس پر تیار
 ہو گئے۔ چنانچہ میں نے ممبئی سے ابتدائی نصاب کی کتابیں (القرأة الرشیدہ
 کے چاروں حصے) منگوا لیے۔ ان میں سے پہلے دو یاقین میں نے ۱۹۳۷ء-۱۹۳۸ء
 کے جاڑوں کے چار پارچ مہینوں میں سبقاً ان سے پڑھے تھے۔

پہلی بیوی سے ایک لڑکی یا دھکار تھی۔ دوسری بیگم سے چار بیٹے (حسیب،
 شعیب، نجیب، شکیب) اور تین بیٹیاں (صفیہ، ریحانہ، فرزانہ) ان کے
 سوگواروں میں ہیں۔

اب کہاں ملیں گے، اس محبت اور ذوقِ علم کے لوگ۔ اللہ تعالیٰ انہیں کر وٹ
 کر وٹ جنت نصیب کرے۔ آمین

ساغر صدیقی، محمد اختر

ساغر صدیقی نے ایک مرتبہ کہا تھا: "میری ماں دلی کی تھی، باپ پٹنایہ کا، پیدا لکسر میں ہوا، زندگی لاہور میں گزری، میں بھی عجیب چوں چوں کا مرتبہ ہوں، اس قول میں صرف ایک معمولی سی غلطی کے سواے اور سب سچ ہے۔

اصل ان کا خاندان انبالے کا تھا، اور وہ پیدا بھی انبالے میں ہوئے۔ سال ۱۹۲۸ء میں گھر میں ہر طرف افلاس و محبت کا دور دورہ تھا۔ ایسے میں تعلیم کا کیا سوال! محلے میں ایک بزرگ حبیب حسن رہتے تھے، انھیں کے پاس جانے آنے لگے۔ جو کچھ پڑھا انھیں سے۔ اس کے بعد شاید ورنیکلر ٹیچر کے کچھ ورہے بھی پاس کر لیے ہوں۔ ایک دن انھوں نے اس ماحول سے تنگ آ کر لکسر کی راہ لی، اور یہاں ہال بازار میں ایک دوکاندار کے وہاں ملازم ہو گئے، جو لکڑی کی کنگھیاں بنا کر فروخت کرتا تھا۔ انھوں نے بھی یہ کام سیکھ لیا۔ دن بھر کنگھیاں بناتے اور رات کو اسی دوکان کے کسی گوشے میں پڑھتے۔ لیکن شروع اس ۱۳-۱۵ برس کی عمر ہی میں کہنے لگے تھے، اور اپنے بیشکلف دوستوں کی محفل میں سناتے بھی تھے۔ شروع میں شعلیں ناصر حمازی تھا۔ لیکن جلد ہی اسے چھوڑ کر ساغر صدیقی جو گئے۔

ساغر کی شہرت ۱۹۴۴ء میں ہوئی۔ اس سال لکسر میں ایک اچھے بڑے پیمانے پر مشاعرہ قرا پایا۔ اس میں شرکت کے لیے لاہور کے بعض شاعر بھی مدعو تھے۔

ان میں سے ایک صاحب کو معلوم ہوا کہ یہ "لڑکا" (ساغر صدیقی) بھی شعر کہتا ہے۔ انہوں نے منتظمی سے کہہ کر اسے مشاعرہ میں پڑھنے کا موقع دلوادیا۔ ساغری آواز میں بلا کا سوز تھا اور وہ ترنم سے پڑھنے میں جواب نہیں رکھتا تھا۔ پس پھر کیا تھا، اس شب اس نے صبح معنوں میں مشاعرہ لوٹ لیا۔

قدتاً اس کے بعد اترسرا اور لاہور کے شاعروں میں اس کی مانگ بڑھ گئی۔ اب اس نے گنگھیاں بنانے کا کام چھوڑ دیا اور بعض سرپرست احباب کی مدد سے اپنا علم اور صلاحیت بڑھانے کی کوشش کی۔ شاعروں میں شرکت کے باعث اتنی یافت ہو جاتی تھی کہ اسے اپنا پیٹ پالنے کے لیے مزید تنگ و تنگ کی ضرورت نہ رہی۔ گھر والے بیشک ناراض تھے کہ لڑکا آوارہ ہو گیا ہے اور کوئی کام نہیں کرتا، لیکن اُسے اُن کی کیا پرواہ تھی؛ اس نے گھر آنا جانا ہی چھوڑ دیا۔ کلام پر اصلاح کے لیے لطیف انور گور و اسپوری مرحوم کا انتخاب کیا اور ان سے بہت فیض اٹھایا۔

۱۹۴۷ء میں پاکستان بنا، تو وہ اترسرا سے لاہور چلا گیا۔ یہاں دوستوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اُس کا کلام مختلف پرچوں میں چھپنے لگا۔ سینا فلم تیار کرنے والوں نے اس سے گیتوں کی فرمائش کی اور اس میں اسے جیتناک کامیابی حاصل ہوئی۔ اس دور کی متعدد فلموں کے گیت ساغر کے لکھے ہوئے ہوئے ہیں۔ اس زمانے میں اس کے سب سے بڑے سرپرست انور کمال پاشا و ایمن عظیم احمد شجاع مرحوم) تھے، جو پاکستان میں فلم سازی کی صنعت کے بانیوں میں ہیں۔ انہوں نے اپنی بیشتر فلموں کے گانے ساغر سے لکھوائے اور یہ بہت مقبول ہوئے۔

۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۲ء تک ساغری زندگی کا زہین دور کہا جاسکتا ہے۔ وہ لاہور کے کئی روزانہ اور ہفتہ وار پرچوں سے منسلک ہو گیا، بلکہ بعض جریدے تو اسی کی ادارت میں شائع ہوتے رہے۔ لیکن اس کے بعد شامت اہمال سے

حالات نے ایسا پٹا دکھایا کہ وہ کہیں کا نہ رہا اور آخر میں صحیح معنوں میں رقیعِ حبر ت بن گیا۔

۱۹۵۲ء کی بات ہے کہ وہ ایک ادبی ماہنامے کے دفتر میں بیٹھتے تھے۔ انہوں نے سرور وادراضمحلال کی شکایت کی۔ پاس ہی ایک اور شاعر دوست بھی بیٹھتے تھے۔ انہوں نے تعلقی خاطر کا اظہار کیا اور خاص ہمدردی سے انہیں مارفیا کا ٹیکہ لگا دیا۔ سرور وادراضمحلال تو درد ہو گیا، لیکن اس مملوۂِ اقصیٰ نے ان کے جسم کے اندر نشہ بازی کے تناور درخت کا بیج بو دیا۔ بد قسمتی سے ایک اور واقعے نے اس رجحان کو تقویت دی۔

اس زمانے میں وہ انارکلی لاہور میں ایک دوست کے والد کے (جو پیشہ کے لحاظ سے ڈاکٹر تھے) مطلب کی اوپر کی منزل میں رہتے تھے۔ اسی کمرے میں ان کے ساتھ ایک اور دوست بھی مقیم تھے (اب نام کیا لکھوں) ان صاحب کو ہر طرح کے نشوں کی عادت تھی۔ ہونی کو کون ناں سکتا ہے، ان کی صحبت میں ساغر بھی رفتہ رفتہ آلا بھنگ اور شراب ادا سے گزر کر ایون اور چرس کے عادی ہو گئے۔ اگر کوئی شخص راہِ راست سے بھٹک جائے اور توفیقِ ایزدی اس کی دستگیری نہ کرے، تو پھر اس کا تحتِ اشرافی سے اور کوئی ٹھکانہ نہیں رہتا۔

یہی ساغر کے ساتھ ہوا۔ اور افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ خود ان کے دوستوں میں سے بیشتر نے ان کے ساتھ ظلم کیا۔ یہ لوگ انہیں چرس کی پڑیا اور مارفیا کے میچکے شیشیاں دیتے اور ان سے غزلیں اور گیت لے جاتے، اپنے نام سے پڑھتے اور چھواتے اور بحیثیت شاعر اور گیت نگار اپنی شہرت میں اضافہ کرتے۔ اس کے بعد اس نے رسائل و جرائد کے دفتر اور فلموں کے اسٹوڈیو میں جانا آنا چھوڑ دیا۔ اس میں بھی کوئی مبالغہ نہیں کہ ان اداروں کے کزنادھر تا اس کے کام کی اجرت کے دس روپے بھی اس وقت تک ادا نہیں کرتے تھے، جب تک وہ ان کے ویر۔ دولت کی چوکھٹ پر دس سجدے نہ کرے۔ اس نے ساغر کے مزاج کی تلخی

اور دنیا بیزاری اور ہر وقت "نہود" رہنے کی خواہش میں اذعانہ کیا۔ اور وہ بالکل آوارہ ہو گیا۔ نوبت بایں جا رسید کہ کبھی وہ تنگ مرنگ ایک بلی کیلی چادر اوڑھے، اور کبھی چیخ و رعد میں ملبوس، بال بھرائے تنگ پاؤ — منہ میں بیڑی یا سگرٹے بے سڑکوں پر بھرتا رہتا اور رات کو نشتے میں ڈھتا، اور ہوش کہیں کسی سڑک کے کنارے کبھی دوکان کے تختے یا تخت کے اوپر یا نیچے پڑ رہتا۔

اب اس کی یہ عادت ہو گئی کہ کہیں کوئی اچھے وقتوں کا دوست مل جاتا، تو اس سے ایک چوتی طلب کرتا۔ اس کی یہ چونی مانگنے کی عادت سب کو معلوم تھی چنانچہ بار بار ایسا ہوا کہ کسی دوست نے اسے سامنے سے آتے دیکھا اور فوراً حیب سے چونی نکال کر ہاتھ میں لے لی۔ پاس پہنچے، اور علیک سلیک کے بعد مصافحہ کر لے وقت، چونی ساغر کے ہاتھ میں چھوڑ دی۔ وہ باغ باغ ہو جاتا۔ یوں شام تک جو دس بیس روپے جمع ہو جاتے، وہ اس دن کے چرس اور ماریفا کے کام آتے۔ فاعتر وایا ولی الابصار۔

جنوری ۱۹۷۲ء میں اس پر فالج کا حملہ ہوا۔ اس کا علاج بھی چرس اور ماریفا سے کیا گیا۔ فالج سے تو بیت حد تک نجات مل گئی، لیکن اس سے دایاں ہاتھ ہمیشہ کے لیے بیکار ہو گیا۔ پھر کچھ دن بعد منہ سے خون آنے لگا۔ اور بہ آخر تک دوسرے تیسرے چارے رہا۔ ان دنوں خوراک بالکل برائے نام تھی۔ جسم سوکھ کر ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا تھا۔ سب کو معلوم تھا کہ اب وہ دن دور نہیں بواب وہ کسی سے چونی نہیں مانگیگا۔ چنانچہ ۱۹ جولائی ۱۹۷۲ء صبح کے وقت اس کی لاش سڑک کے کنارے ملی، اور دوکھتوں نے لے جا کر اسے میانی صاحب کے قبرستان میں دفن کر دیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

یزدانی جاندھری نے قطعہ تاریخ وفات کہی :

ساغر نے رختِ زلیست جہاں سے اٹھایا افسرہ اس کے فم میں ہیں یا رانِ انجمن
وہ شہرِ پادشہ، وہ درویشِ بے ریا نعلیں نکلیں جس کی نظر ہر مراحِ فکر و فن

نعتوں میں جس کی جذبہ حب رسول تھا فزوں میں جس کی حس و جوانی کا باکھین
یزدانی حزیں نے لب جام رکھ کے ہاتھ تاریخ رحلت اس کی کہی ”ساغر سخن“

(۱۹۷۱ء تا ۱۹۷۳ء)

(۲)

اس نے غزل، نظم، قطعہ، رباعی ہر صنف سخن میں خاصا ذخیرہ چھوڑا ہے۔ وہ خود تو اسے کیا چھوڑا، ناشرین نے اپنے نفع کی خاطر اسے چھاپ لیا، اور اسے سناوتے میں ایک حبہ تک نہ دیا۔ چھوڑے اس کی زندگی میں لاہور سے مجھے وغیرہ بہارِ نہر آرزو (۱۹۶۴ء) لوحِ جنون (۱۹۷۱ء) اور سیرگنبد اور شبِ آہی (۱۹۷۲ء) یقین ہے کہ اگر کوشش کی جلتے، تو ایک اور مجموعے کا مواد آسانی سے ملتا ہے۔ ساغر کا کلام بہت چاندرا ہے اور زندہ رہے کاسخی۔

جی چاہتا ہے کہ یہاں اس کی زندگی کا ایک واقعہ قلمبند کروں، جس سے مشہور یونانی فلسفی دیوجانس کلیکی کی روایت تازہ ہوتی ہے :

اکتوبر ۱۹۵۸ء میں پاکستان میں فوجی انقلاب ہوا۔ جرنیل محمد ایوب (ف) اپریل ۱۹۷۲ء پر سر اقتدار آگئے اور تمام سیاسی پارٹیاں اور سیاست دان، جن کی باہمی چغٹاش اور رستہ کشی سے عوام تنگ آچکے تھے، حرفِ غلط کی طرح فراموش کر دیے گئے۔ لوگ اس تبدیلی پر واقعی خوش تھے۔ ساغر نے اسی جذبے کا اظہار ایک نظم میں کیا ہے۔ اس میں ایک مصرع تھا :

کیلے صبر جو ہم نے، ہیں ایوب ملا۔

یہ نظم جرنیل محمد ایوب کی نظر سے سچی گزری یا گزاری گئی۔ اس کے بعد جب وہ لاہور آئے، تو انہوں نے خواہش ظاہر کی کہ میں اس شاعر سے ملنا چاہتا ہوں جس نے یہ نظم لکھی تھی۔ اب کیا تھا! پولیس اور فقیہ پولیس اور نوکر شاہی کا پورا عملہ حرکت میں آگیا، اور ساغر کی تلاش ہونے لگی۔ لیکن صبح سے شام تک کی پوری کوشش کے باوجود وہ ہاتھ نہ لگا۔ اس کا کوئی سطور ٹھکانا تو تھا نہیں، جہاں سے وہ اسے پکڑ لیتے۔ پوچھ گچھ کرنے کرتے سرشام پولیس نے اسے

ایک پان والے کی دوکان کے سامنے کھڑے دیکھ لیا، وہ پان والے سے کہہ رہا تھا کہ پان میں تو ام زرا نیا وہ ڈالنا۔ پولیس افسر کی باجیہ کھل گئیں کہ شک ہے غلط سبانی کے حکم کی تعمیل ہو گئی۔ انھوں نے قریب جا کر ساغر سے کہا کہ آپ کے حضور صدر ملک نے یا فرمایا ہے۔ ساغر نے کہا: بابا، ہم فیروں کا صدر سے کیا کام! افسر نے اصرار کیا، ساغر نے انکار کی رٹ نہ چھوڑی۔ افسر بیچارہ پریشان کر کے تو کیا کیونکہ وہ ساغر کو گرفتار کر کے تو لے نہیں جاسکتا تھا کہ اس نے کوئی جرم نہیں کیا تھا، اور اسے کوئی دلی دلیت بھی نہیں ملی تھی، جرنیل صاحب تو محض اس سے لے کے خواہشمند تھے اور ادھر یہ پگلا شاعر، یہ عزت افزائی قبول کر کے کو تیار نہیں تھا۔ اب افسر نے جو مسلسل خوشامد سے کام لیا، تو ساغر نے نہج ہو کر اس سے کہا: ارے صاحب مجھے گورنر ہاؤس میں جانے کی ضرورت نہیں۔ وہ مجھے کیا دینگے، دوسو، چار سو، فیروں کی قیمت اس سے کہیں زیادہ ہے جب وہ اس پر کبھی نہ لاتا تو ساغر نے گلوڑی کتے میں و باقی اور زمین پر پڑی سگرٹ کی خالی ڈیا اسٹھا کر کے اُسے کھولا۔ جس سے اس کا اندر کا حصہ نمایاں ہو گیا۔ اتنے میں یہ تماشا دیکھنے کو اور گرد و خاصی بھیڑ جمع ہو گئی تھی۔ ساغر نے کسی سے قلم مانگا اور اس کا غنڈ کے ٹکڑے پر یہ شعر لکھا:

ہم سمجھتے ہیں ذوق سلطانی
یہ کھلونوں سے بہل جاتا ہے

ساغر صدیقی بقلم خود

اور وہ کاغذ پولیس افسر کی طرف بڑھا کر کہا: یہ صدر صاحب کو دے دینا، وہ سمجھ جائیگے۔ اور اپنی راہ چلا گیا۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پرندہ طبع لوگ
شاید کہ تم کو تیر سے صحبت نہیں رہی

ایک غنڈ، ایک خچہ، ایک تارا، ایک جام
لغیم دوراں، لغیم دوراں! تجھے میرا سلام

ہم بنائے یہاں ساغرِ انہی تصویرِ شوقِ ہم تخیل کے مجھو، ہم تصور کے امام

گیت اس عہدِ مختلف میں برہم و جنگ و لڑنے کو ترس میں

ساتیلا حیرے بارہ شانے میں نام ساغرِ بہ، کے کو ترسے ہیں

چراغِ طور جلاؤ، بڑا اندھیرا ہے ندانِ نقاب اسٹھاؤ، بڑا اندھیرا ہے

وہ جن کے ہوتے ہیں خورشیدِ کستوریں اسٹھیں کہیں سے بلاؤ، بڑا اندھیرا ہے

مجھے تمہاری ٹھکانوں پہ اعتماد نہیں سرے قریب نہ آؤ، بڑا اندھیرا ہے

قراقرش سے ٹوٹا ہوا کوئی تارا کہیں سے ڈھونڈ کے لاؤ، بڑا اندھیرا ہے

ابھی تو صبح کے ماتھے کا رنگ کالا ہے ابھی قریب نہ کھٹاؤ، بڑا اندھیرا ہے

بیرتوں پہ اجالوں کا خوف طاری ہے مجھے یقین دلاؤ، بڑا اندھیرا ہے

جسے زبانِ خرد میں شراب کہتے ہیں وہ شہنشاہی پلاؤ، بڑا اندھیرا ہے

بنامِ زہرہ جبیناں خطہٴ فردوس کسی کرن کو جگاؤ، بڑا اندھیرا ہے

سانر کسی کی یاد میں جب اشکبار تھے کئے حسین دن تھے جہاں خراب میں

جگمگاتے ہیں وحشتوں کے دیار عقل نے آدمی کو بیچ دیا

ہم اُلٹ دیتے ہیں مدیوں کا نقاب ہم نالوں کی خبر رکھتے ہیں

یوں چلنے میں شاخ پر غصے جیسے ان کے سلام آتے ہیں

رہبروں کے ضمیر مجرم ہیں ہر مسافر یہاں لیٹر ہے

معبودوں کے چراغ گل کر دو قلبِ انسان میں اندھیرا ہے

میں بھی جنت سے کالا ہوا اک بت ہی تو ہوں

ذوقِ تخلیق! تجھے کیسے ستم آتے ہیں!

ہاں ہیں نے لہو اپنا گلستاں کو بیلا ہے غم کو گل و گلزار پہ تنقید کا حق ہے

صبح دیکھا، شگوفے تھے ٹوٹے ہوئے گل کھلاتی رہی، رات بھر، چاندنی

اے ستاروں کے چاہنے والے آنسوؤں کے چراغِ حاضر ہیں

روشنیِ جشنِ رنگ و بو کے لیے زخمِ حاضر ہیں، داغِ حاضر ہیں

لشکرِ جنگی، اسے تو بہ ! قطرے قطرے کو ہم ترستے ہیں
 اے خداوندِ کوثر و نسیم ! تیرے بادل کہاں برستے ہیں ؟
 کچھ نہیں مدعا فیروں کا دد ہے لاد و افیروں کا
 اپنی تنہائیوں پہ ہنستے ہیں کون ہے آشنا فیروں کا

ایک وعدہ ہے کسی کا جو دنا ہوتا نہیں
 دمنہ ان تاروں بھری راتوں میں کیا ہوتا نہیں
 ہر شاد و کوہِ نہیں ملتا، تلاءِ علم سے خسراج
 ہر سفینے کا محافظ ناخدا ہوتا نہیں
 ہر بھکاری پا نہیں سکتا مقامِ خواجگی
 ہر کس و نا کس کو تیرا غم عطا ہوتا نہیں
 باے یہ یگانگی، اپنی نہیں مجھ کو خبر !
 باے یہ عالم کہ تو دل سے جدا ہوتا نہیں
 زمانے کو دے الزام، اے ناواقفِ منزل !
 زمانے کی نظر ہم ہیں، زمانے کا چلن ہم ہیں

آوارگی بزرگ تما شاہری نہیں ذوقِ نظر ہے، تو بہ دنیا بُری نہیں
 کہتے ہیں تیری زلف پریشاں کو زندگی اے دوستِ بوندگی کی تماشا بُری نہیں
 ساعہ کے ساتھ چل کے کبھی دیکھیں گے اتنی حدیثِ ساغر و بادہ بُری نہیں
 یاد رکھنا ہماری تربت کو
 قرض ہے تم پہ چار پھولوں کا

جمالی، طفیل احمد

ان کا خاندان دراصل الہ آباد کا رہنے والا تھا، لیکن یہ ۱۹۱۹ء میں بنارس میں پیدا ہوئے، جہاں اس زمانے میں ان کے والد محمد سحاق صاحب مقامی جیل خانے کے مہتمم تھے۔ وہ وہاں بہت لمبا عرصہ تعینات رہے تھے۔ چنانچہ جمالی کی ابتدائی تعلیم بنارس ہی میں ہوئی۔ بی۔ اے کا امتحان بعد کو ۱۹۴۱ء میں اپنے وطن الہ آباد یونیورسٹی سے پاس کیا۔

تعلیم کی تکمیل کے بعد انھوں نے دلی کی راہ لی۔ سیاست اور معنوں نگاری سے انھیں طالب علمی کے زمانے ہی میں دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ یہاں دلی میں انھوں نے مختلف اخباروں میں جَز وقتی کام شروع کیا۔ پھر مستقل طور پر ”غشور“ کے عملے سے منسلک ہو گئے۔

۱۹۴۷ء میں ملک تقسیم ہوا تو کراچی چلے گئے۔ ابتدا میں چندے روز نامہ ”جنگ“ میں کام کیا۔ جب مشہور کانگریسی اور کیونسٹ لیڈر میاں افتخار الدین (فد) جون ۱۹۴۷ء) نے اردو روزنامہ ”امروز“ جاری کیا، تو اس کا ایک ایڈیٹیشن کراچی سے بھی چھپنے لگا۔ اس کے ایڈیٹر مشہور صحافی چراغ حسن حسرت (فد: جون ۱۹۵۵ء) تھے۔ انھوں نے جمالی کی صلاحیتوں کا اندازہ لگایا اور انھیں امروز کے اسٹاف میں لے لیا۔ جمالی اس میں روزانہ ”پہلا درویش“ کے قلمی نام سے مزاحیہ کالم لکھنے لگے۔ وہ اس کے ہفتہ وار ایڈیٹیشن کے لیے

"مگر تو برا نہ مانے" کے عنوان سے ملک کی معاشری سیاسی رہائی، ادبی، عمری پر طنز یہ انداز میں تنقید کرتے ہے۔ یہ دونوں کالم (خاص کر مؤخر الذکر) بہت مقبول ہوئے۔

”امروز ہیکراچی ایڈیشن بند ہو جانے کے بعد وہ فلمی دنیا سے وابستہ ہو گئے۔ اس زمانے میں انھوں نے متعدد فلموں کے مکالمے اور گانے لکھے۔ وہ کراچی کے مشہور فلمی رسالے ”شکار“ (ہفتہ وار) کے مستقل فلمی معاون تھے۔ اس میں وہ مختلف ناموں سے ہر ہفتے کئی کئی مضمون لکھتے رہے۔ یہ تعلق تقریباً دو برس تک قائم رہا۔

مجید لاہوری دفعہ جون ۱۹۵۷ء اعلان کا ہفتہ وار مزاجیہ اخبار ”ننگہ ان“ کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ نگار سے علاحدہ ہونے کے بعد جمالی نے ”ننگہ ان“ اپنی تحویل میں لے لیا۔ وہ دو برس تک اس کے مرتب رہے۔ زیادہ حصہ اس کا سہمی ان کے قلم سے ہوتا تھا۔

۱۹۴۳ء میں وہ روزنامہ ”انجام“ (کراچی) کے مدیر مقرر ہو گئے۔ اسی سال انہوں نے روس کا دورہ کیا۔ دو سال بعد مئی ۱۹۶۵ء میں ملیک سرکاری اور اسے ”نیشنل اینڈ ڈیسٹ منٹ ٹرسٹ“ کے افسر تعلقات، مامنا مزو ہو گئے، لیکن یہاں سال بھر بھی مشکل سے گزرا ہو گا کہ حکومت چین نے ان کی خدمات حاصل کر لیں اور وہ ریڈیو بیکنگ کے رسالے ”تھیوری چین“ میں مقرر ہو کر چلے گئے۔ چین سے ۱۹۶۹ء میں واپس آئے۔

دو پاکستان ماسٹرز مجلہ کے مانیوں میں تھے - ۱۹۹۲ء - ۱۹۹۳ء تک دو سال اس کے سکریٹری رہے اور کچھ مدت اس کے رسالے "ہم قلم" کی ادارت بھی کی۔۔۔ بعد کو اس سے سبھی تعلقات منقطع کرنا پڑے، اور انہیں بسراوجہات کے لیے ریڈیو اور ٹیلی رسالوں کا سہارا لینا پڑا۔

۶۱۹ء میں کراچی سے فیض احمد فیض نے ایک ہفتہ وار "یل و نہار" شروع کیا

تھا۔ جمالی اس میں اپنا کلام ”مگر تو بڑا نہ مانے“ لکھنے لگے۔ لیکن یہ تعلق بھی زیادہ دن تک قائم نہ رہ سکا۔ اس کے بعد جمالی نے اپنا ذاتی پرچہ ”انقلاب“ (ہفتہ وار) جاری کیا۔ لیکن اس نے بھی پانچ شماروں کے بعد دم توڑ دیا۔ انہیں اردو، فارسی، انگریزی تینوں زبانوں پر قدرت حاصل تھی۔ اردو اور انگریزی میں مشکلات لکھتے تھے۔ فارسی میں ان کا کوئی مضمون نظر سے نہیں گزرا۔ لیکن اس میں گفتگو اور تقریر وہ بڑی روانی سے کرتے تھے۔ وہ انجمن صحافیان پاکستان کی مجلس عاملہ کے رکن بھی تھے۔

انہی صلاحیتوں کا مالک اور کامیاب نثر نگار اور طنز نگار ہونے کے باوجود انہوں نے ان کے مزاج میں استقلال نہیں تھا۔ انجمن آرا اور انجمن ساز قسم کے انسان تھے۔ لاابالی پن گویا ان کے خیر میں تھا۔ ہر وقت دوستوں کے حلقے میں خوش گیسوں میں مصروف رہتے۔ اسی لیے عمر بھر پریشان رہے اور کوئی دیر پا کام نہ کر سکے۔ اور تو اسے اپنا کلام تک جمع نہیں کیا۔ حافظ بہت اچھا تھا؛ اسی لیے جو کچھ کہا، سب پایا و سنا؛ ضرورت پڑے پر وہ لمبی لمبی نغلیں (طنز پر اور مزاحیہ) اور غزلیں سنا دیتے تھے۔

آخری عمر میں انہوں نے صحافت سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی اور لمبر اوقات کے لیے ایک سیمنٹ ایجنسی چلانے لگے تھے۔ اسی کاروبار کے سلسلے میں ۱۰ اگست ۱۹۷۳ء ہفتے کے روز جہد رآباد (سندھ) گئے۔ اگلے دن شام کو کراچی واپسی ہوئی۔ رات سوتے میں شدید کمر درد کی شکایت کی۔ صبح (۱۳ اگست) دل کا درد پڑا۔ فوراً اسپتال منتقل کرنے کا انتظام کیا گیا، لیکن رستے ہی میں جان بحق ہو گئے۔ اسی دن مغرب کے بعد سنی حسن و مبارک قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔

شاہی خاصی دیر سے ۱۹۶۲ء میں کی تھی۔ وکسن لڑکیاں ان کے سگواروں میں ہیں۔

افسوس کہ ان کے کلام کا مجموعہ آج تک نہیں چھپا۔ اپنی بے پروائی اور لاابالیانہ پن

کی بدولت کبھی کوئی باقاعدہ بیاض تک نہیں رکھی۔ مندرجہ ذیل تین غریب، مختلف
رسائل سے جمع کی گئی ہیں :

گسی جییں، نہ کسی نازنیں کی بات کرو
ہو سے سہیلی ہوئی آستیں کی بات کرو
گماں ہے موت، یقیں موت کا جواب ہوا
گماں سے ہاتھ اٹھاؤ، یقیں کی بات کرو
مقام آہ و فغاں سے گزر چکی ہے حیات
ننگا و گرم و دم آتشیں کی بات کرو
نہیں ہے پیاسی لے خون دل کے چھینے دو
پھر اس کے بعد تے وانگیں کی بات کرو
مہر دستار کی محفل بڑی حسین ہے، مگر
زمین والو! کچھ اپنی زمین کی بات کرو
سیاہی شب، اجراں کی داستان چھوڑو
سحر قریب ہے، مہر میں کی بات کرو
شگفت گل کے فسانے تو سن چکے ہیں بہت
شکست خاطر اندو گلیں کی بات کرو

باغیاں کو آئل مشر دیکھ کر چپ ہو گئے
اس عین میں ہم ہی کیا سب دیکھ کر چپ ہو گئے
گر میں محفل جو یوں باقی رہی، تو کیا رہی
دل دل چپ ہو گئے، اول نظر چپ ہو گئے
رات اس محفل میں کس خوابیدہ سر کا ذکر تھا
ساز نوئے، راگ بہکے نغمہ مگر چپ ہو گئے

اک خبیستاں نور کو ترسا گیا، ترپا گیا
سو سے بڑاں دیکھ کر خس و قمر چپ ہو گئے
کارواں لٹے کاظم بھی رفتہ رفتہ دھل گیا
رنگرز پھر سو گئی، اہل سفر چپ ہو گئے
کم نہ تھے نازک مزاجی میں کسی سے ہم، مگر
ریخ دینے والے کو پہچان کر چپ ہو گئے
اپنے دل کی دھڑکنیں ہم بھی سنانے آئے تھے
قلبِ عالم کو دھڑکتے دیکھ کر چپ ہو گئے

داستانِ غم میں غنچہ آسمان رہے دیا
ایک نکتہ سخا کہ محتاجِ بیاں رہے دیا
ان کو دیکھا، پھر بھی نظروں سے نہاں رہے دیا
اپنی آنکھوں پر حجابِ گلستاں رہے دیا
گل کو چوما، چاند کو دیوانہ وار آواز دی
ایک پردہ ان کے اپنے درمیاں رہے دیا
اس جہاں سے سرکشی کی، اس جہاں سے خودی
لیکن ایک نازک سا سنگِ آستان رہے دیا
اپنی پلکوں پر چمن کے سارے آنسو لے لیے
گل کو خندیں، بلبلوں کو نغمہ خواں رہے دیا
سیا بٹکتے چشمہ جیرواں کی خاطر در بدر
اپنے پاس اک غم ستا، اس کو جا دلاں رہے دیا
اے جمالی اسبکہ اک گلشن سے نسبت تھی ہمیں
اپنے نغموں میں بھی اندازِ غماں رہے دیا

ٹھاکر پونجھی، جگن ناتھ

ان کا اصل نام سوہن لال تھا، لیکن مشہور جگن ناتھ کے نام سے ہوئے۔ وہ پونجھ کے ایک راجپوت خاندان میں ۳۱ دسمبر ۱۹۲۲ء کو پیدا ہوئے۔ پونجھ اس زمانے میں ریاست جوں و کشمیر کی ذیلی باجگراں ریاست تھی۔ ان کے والد باجوسیم سین کو درہنشی کھیلوں، خاص کر پولو اور نیزہ بازی میں خاص مہارت حاصل تھی، اس بنا پر وہ راجہ صاحب پونجھ کے بڑے چیمپے اور منہ چڑھے تھے اور اس کے باوجود کھیرکادی طور پر بعض ریاست کے محکمہ حسابات میں ملازم تھے، راجہ صاحب موصوف کی نجی محفلوں میں بھی براہِ تبرک رہتے تھے۔ شاید حکمران خاندان سے دور نزدیک کی کچھ دشتے داری بھی ہو۔ غرض ٹھاکر پونجھی بھی بچپن سے محل میں گئے جانے لگے اور ان کی تربیت اچھے مرنے والے خاندان کے ڈھنگ پر ہوئی۔ پھر جب تعلیم کا زمانہ آیا، تو اہل انھیں مقامی دکتوریہ جوبلی اسکول میں اور بعد کو تھیکل کے ایسے پرنس آف ولز کالج (حال مائندھی میویری کالج) جوں میں بھیجا گیا، جہاں سے انھوں نے بی اے کی سند لی۔

تعلیم ختم کرنے کے بعد وہ اولاً چندے محکمہ سول پہلائی میں ملازم رہے۔ لیکن ان کی طبیعت کی جالان کے لیے یہ میدان بہت تنگ تھا۔ وہ محض کلر کی اور بے عملی کی زندگی پر قانع نہیں ہو سکتے تھے۔ مشہور ہے کہ بچپن میں وہ گلی محلے کے بچوں کو ساتھ لے کر ڈرامے کھیلا کرتے تھے، اور سب لوگ انھیں جتھہ دار کے نام سے پکارتے تھے۔ اس سے ان کے مزاج کے انجاد کا پتا چلتا ہے۔ وہ واقعی محلی اور ادبی صلاحیتیں رکھتے تھے۔ چنانچہ جب

سول سپلائی کے محکمہ سے دل اُچاٹ ہو گیا، تو ۱۹۴۴ء میں دلی چلے آئے۔ آدھی دچھپن اور شگل دھولت کے لحاظ سے اچھے تھے، کچھ سفارشوں نے بھی کام کیا ہو گا پھر ضابطہ انجیل پر جلد ہی اہل اثر یا ریڈیو میں ملازمت مل گئی۔ یہاں وہ ڈوگری نیو مدرنس میں سب ایڈیٹر مقرر ہوئے تھے۔

دلی اس زمانے میں پنجاب سے آنے ہوئے پناہ گزینوں سے بھری تھی۔ یہ لوگ جو بھوکے، تنگے جان پکار رہاں گئے تھے، اور جن کے پاس سر چھپانے کے لیے آسمان کی چھت کے سوا کچھ نہ تھا، انہیں تنہا ہر طرح کی مدد کے مستحق اور طلب گار تھے۔ ٹھاکر پو پھی نے کچھ اور نکالنے کے تعاون سے دھامے کیئے اور پناہ گزینوں کے لیے، جن کی آمدنی انہوں نے شری رام سٹی ریٹیف فنڈ میں پیش کر دی۔ اس کے لیے کچھ ڈرامے خود بھی لکھے تھے۔

دلی میں وہ دسمبر ۱۹۴۶ء تک رہے۔ اس کے بعد اسی عہدے پر جوں ریڈیو اسٹیشن میں تبادلہ ہو گیا۔ انہوں نے خاص طور پر ڈوگری علم و ادب اور کچھ کے فروغ میں نمایاں کام کیا۔ وہ ریڈیو اکاڈمی کے بھی رکن تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی افسانہ لائیکس سے شروع کی تھی۔ ان کا پہلا افسانہ غالباً "خاتمہ بدوش" تھا جو ۱۹۵۰ء میں "ایشیا" (پہلے اداس) میں چھپا۔ ۴۴ برس بعد اپنی موت تک انہوں نے کوئی دو درجن ناول اور افسانوں کے تین مجموعے شائع کیے۔ ان کے بعض ناولوں اور افسانوں کا ملک کی دوسری زبانوں، بنگالی، پنجابی، ملیالم، ہندی میں بھی ترجمہ ہوا۔ ان کے چند ناولوں کے نام یہ ہیں: ڈنڈی، دادیاں اور ویرائے، رات کے گھونگٹ، شمع ہر رنگ میں جلتی ہے، ذائق کے سر ہونے تک، چاندنی کے سایے، یادوں کے کھنڈر، پیاسے بادل، اداس تنہائیاں، جب پتھر روتے ہیں، یہ رشتے یسٹ، پت بھڑکے بھڑکے، بھنور دھیر۔ زندگی کی دوڑ، چاندوں کے چاند، آدھے چاند کی رات، افسانوں کے مجموعے ہیں۔

وہ ڈوگری میں بھی بلا تکلف لکھتے تھے۔ ان کی تحریریں ہماری زندگی اور عوام کے مشاغل کا اچھا رقعہ ہیں۔

زندگی کے آخری قیام میں انہوں نے ایک نیا ناول لکھنا شروع کیا تھا۔ "اداسی دلی"

نہیں رہتا۔ اسے انہوں نے ۱۴ اگست ۱۹۷۴ء کو مکمل کیا اور آخری صفحے پر یہ لفظ لکھا:

”ابنا پروردگار“

”پناہ“

”سلام“

”خدا حافظ“

”سب کچھ درد ہے۔ سب کچھ پاس ہے، صرف احساس کی بات ہے“

یہ آخری لفظ لکھ کر وہ رہبر کو میز سے اٹھے اور دفتر سے باہر کچھ کھانے پینے کے لیے گئے۔
 شکر پر پہنچے ہی تھے کہ ایک ٹیز آئی، بولی جیپ ان سے ٹکرائی۔ داغ کو ضرب شدید پائی،
 جس سے بیہوش ہو گئے۔ فوراً آخری ہمارا جاکملا بے سنگہ اسپتال پہنچایا گیا، جہاں اس
 بیہوشی کے عالم میں جمعہ ۱۶ اگست (۱۹۷۴ء) صبح طائرہ روح نقیہ عنقریب سے پردا کر
 گیا۔ موت سے کوئی تین مہینے پہلے سے انہوں نے ”کہانی ختم“ کا نقشہ ختم، کے الفاظ
 کو اپنا تکیہ کلام بنایا تھا۔ اس وقت انہیں کیا معلوم ہو گا کہ واقعی اتنی جلد ان کی حیات
 کہانی یا قصہ حیات ایسے انداز طریقے پر ختم ہونے والا ہے۔

۱۹۴۶ء میں لاہور کے وزیر خاندان میں شادی ہوئی تھی، لیکن بیوی سے شہرہ سکی اند کوئی
 ڈیڑھ دو سال میں علیحدگی ہو گئی۔ لاولد فوت ہوئے۔ وہ ہر کسی کے دوست، مہربان اور
 غمخوار تھے۔ ان کے خاں کے ساتھ زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے لوگوں کا جو
 ہجوم تھا، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کتنے مقبول اور ہر دل عزیز تھے۔

بہزاد لکھنوی، سردار احمد خان

۱۹۰۰ء میں اپنے خاندانی مکان، امین آباد پارک، لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ چونکہ خاندان مذہبی خیالات کا ادبہ بھی متوسط الحال متمدن کا تھا، اس لیے تعلیم کے پہلو سے تشفی بخش انتظام نہ ہو سکا۔ پھر بھی ششم ہشتم ڈل کے درجوں تک اُردو، فارسی، عربی اور کچھ انگریزی حاصل کر لی۔ جب معاش کا مسئلہ پیش آیا تو دیوبند کے محلے میں ملازم ہو گئے۔ وہ مدتوں الٹی، الٹی، اسی چلتی گاڑی میں کلٹ معاہدہ کرنے والے ایک حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ان کے خاندان کا بریلی کی دنگاویہ نیا دیوبند پر بااثر تعلق تھا، یہ بھی وہیں سریدھ تھے۔ اس لیے نادر دوس کے سختی سے پابند تھے۔ پچیس سے تو اس کے تیلے اور جسم کے کزدہ تھے ہی، متواتر سفروں نے ذہنی بھی کسر پوری کر دی اور بیمار رہنے لگے۔ صحت سقیم، فرائض منجھی میں متواتر لمبے لمبے سفر لازم، جن میں بعض اوقات راتوں کو جاگنا پڑتا، اس پر ذہنی بیاخت۔ غرض صحت نے بالکل جواب دے دیا اور اختلاجِ قلب کے دورے پونے لگے۔ لکھنؤ میں پھوش پڑے رہتے، اسے یاد لوگوں نے حالتِ جذب سے تعبیر کیا۔ جب صحت کچھ بہتر ہوئی تو اب نئی اور نسبتہ سکون کی ملازمت کی تلاش میں دلی آ گئے۔ اس زمانے میں یہاں آل انڈیا ریڈیو کے صحابہ بھاجا بڑے ہمدرد قسم کے لوگ تھے، ان کی حمایت سے دھوری لی گئی اور یہ یضوں (سکرپٹ) لکھنے پر مقرر ہو گئے۔ دلی میں وہ تین چار برس رہے۔ یہاں زاد ہے جب میں نے انہیں دیکھا۔

اختلاجِ قلب کے مرض سے انہیں اغا توڑ ہو گیا، لیکن اس کے بعد سے وہ متغلاً موت کی

اجتی خاصی موتی دہری تھی گلے میں ڈالے دیتے۔ جب کلام پڑھتے پڑھتے جوش میں آجاتے تو دونوں ہاتھوں سے اسے کھینچنے لگتے تھے۔ چونکہ وہ دہری تھی اس لیے نیچے اوپر چلتی دیتی اور اس سے گلا گھونٹے جاتے کا اندیشہ نہیں تھا۔ میں جس ملاقات کا ذکر کر رہا ہوں اس دن طبیہ کالج (قردوباغ) دل کے کسی مشاعرے میں کلام سنانے کے لیے اسٹیج پر آئے تھے میں نواب سائل مرحوم (ف: ۱۹۴۵ء) کے قریب بیٹھا تھا۔ برابر میں کسی نے کہا: "اوسے یہ گلے میں ڈی کیوں ڈالے ہوئے ہے اور اسے کھینچ کیوں کیا ہے؟" اس پر سائل صاحب لبے: "بھائی یہ دیوانہ ہے، لیکن بکا و خوش ہشیار۔ اگر کھینچے کو رٹی نہیں ہو، تو یہ اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے گا۔"

ہنر اور اگرچہ یہاں ہر طرح خوش تھے، لیکن ۱۹۴۰ء میں وہ ریڈیو کی نوکری ترک کر کے چل کر فلم لین، لاہور میں مکالمہ نویس بن کر چلے گئے۔ لاہور میں وہ تین برس رہے تھے۔ دہلی کا معاہدہ ختم ہوا تو وہ دوبارہ ۱۹۴۲ء میں آل انڈیا ریڈیو میں آگئے، اب کے ان کا ٹکھنؤ ایشین میں مضمون (سکرپٹ) لکھنے پر تقرر ہوا۔ دو سال بعد، ۱۹۴۵ء میں انھیں راج کل کلامند بھیجے گئے اپنی فلموں کے لیے گیت لکھنے پر ملازم رکھ لیا۔ ۱۹۵۱ء تک بہن میں رہے۔ اس زمانے میں انھوں نے ۴۰-۵۰ فلموں کے لیے گیت لکھے ہونگے۔ اسی سال پاکستان چلے گئے، جہاں جمعہ کے دن ۱۰ اکتوبر ۱۹۵۷ء کو قریب مغرب ان کا کراچی میں انتقال ہو گیا۔ سنی مسن دہگاہ کے قبرستان (کراچی) میں چادر دیواری کے باہر اس احاطہ خاص میں دفن ہوئے، جہاں ان کے سلسلے کے لوگوں نے دہگاہ تعمیر کی ہے۔

ہنر اور ادب اصنافِ سخن پر قادر تھے۔ غزل، گیت، نظم کا دائرہ غیرہ ان کے ہاں مختا ہے۔ لیکن ان کی خصوصیت شہرتِ نعت نگار کی حیثیت سے ہوئی اور اس میں شبہ نہیں کہ ان کی نعت میں خاص کیف اور درد ہے۔ لہٰذا سے بڑھتے بھی خوب تھے۔ ان کے شعور محبوبے شائع ہوئے تھے۔ ان میں سے نذر نور، موجِ ظہور اور چراغِ طور بہت مقبول ہوئے۔

انہوں نے ان کے کلام کا کوئی مجموعہ تلاشِ بسیار کے باوجود دستیاب نہ ہو سکا۔ بعض سال

میں شائع شدہ چند غزلیں ملیں کہیں ہیں سے چند شریطو رموز و درج ذیل ہیں کلام
میں بھی تصنیف کا رنگ غالب ہے، جوان کی زندگی کا ماہ الا قیاس تھا،

اک عجیب عالم ہے جس کی یہ دنیا بھی
داہر سے کیا پوچھوں داہرن سے کیوں گلو
منزلِ محبت کا ہے اک ادورستا بھی
بھسے پھینکیں کیوں ہے غم کا اک ہارا بھی
جس جگہ نظر آئے جلوہ گر بھی، جلوہ بھی
ہاں یہیں پہ جوتا ہے زندگی کا سودا بھی
عجیب درد سے لے جان جاگد رتی ہے
خدا گواہ کہ بیاختہ ابھرتی ہے
دورِ رحمت و آلام سے بھرتی ہے
جو روحِ درد بچکی تھی وہ خود ابھرتی ہے

مجھے خبر ہے مرے سوزِ عشق کی، پھر بھی

بتاتا کہ توی زلف کیوں سنو داتی ہے

تو زلف و درخشاں کا یہ رنگیں نظام
مبارک، مبارک، انھی خود نقاب
میں کیوں راہبر، تجھ کو تکلیف دوں
وہ انھی، وہ انھی کسی کی نظر
نہ اپنی خبر ہے، نہ دل کی خبر

ہے بخود سا بہتراد، مضطر، ملو

ہے اس کے لبوں پر تمھارا ہی نام

یہ تو ہی تھائے زارِ ادا ہے دیا کہ بے ریائی
تھوے آسمان کے صدفے کوئی حد کی کیف کی ہے
مرا جذبہ ندامت اتنی شان پارسانی
کہیں منت ہونے چلے، مرا ووقی جہہ پارسانی
کوئی اور کیا بھر گیا مرا کا سنہ گردانی
میں جہاں سے منہ پھرا کہ تھے پاس آؤ ہوں

مری الجبوں سے پوچھو، مری دھڑکنوں سے پوچھو
 بڑی منزلوں سے گزریں ہے جنوں کن پارسان
 مری زندگی ہے سستی، مری زندگی کا حاصل
 نہ جنوں نہ ہوشمندی، نہ دانا، نہ بیوفائی
 مری بیخودی تصدیق، مری مستیاں پنہادر
 وہ ادھر ہی آ رہے ہیں، بیکمال دربان
 تری رہگذر کے پھیرے، ترے آستان کے بکد
 یہی ہیں مری خطائیں، یہی میری پارسان

خبر نہ تھی تیری جستجو میں، کشف کمش رہ رہی ملیگی
 قدم قدم پر جہیں جھکیگی، قدم قدم آگہی ملیگی
 تمہیں مبارک مرا تڑپنا، مجھے مبارک تمہارا چلو
 یہ دونوں عالم رہیں سلامت، جاں کو آسوں ملیگی
 نہ ڈھونڈوں کو لگاؤ عالم، جاں پہیں ہوں جاتی وہ چلو
 جہاں بھی کھویا ہوا ملیگا، فضا بھی کھوئی ہوئی ملیگی
 ابھی نہ چھڑو، ابھی نہ بھڑو، ابھی تو فوج طلب میں چلو
 یہ داند کیون مجھ پہ کھوئے فتنے ہو کر اور مشکل ابھی ملیگی
 خودی کے دھوکے میں آ رہا ہوں جنوں سے امن کا رہا ہو
 سمجھ رہا ہوں یقین میں بھنس کر، سکون کی زندگی ملیگی
 ہمیں تو ہر ذرہ میکہ ہے کہ کم تو ہیں تیرے رند، ساقی
 مگر کہاں مستیاں ملیں گی، مگر کہاں بیخودی ملیگی
 گناہ کے ہاتھوں خراب خس، اکدھر یہ دلانے جا رہیں
 کہیں نہ کعبہ نہ تکرہ ہے، ملی تو ان کی کھلی ملیگی

محشر مرزا پوری، مرزا فرزند علی

یکم جنوری ۱۸۸۹ء کو مرزا پور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد حکیم علی صاحب تھے جو بچوں کو سنی تعلیم دینے کے لیے اس دور میں خاصی شہرت کے مالک تھے۔ فرزند علی صرف پانچ برس کے تھے، جب ان کا انتقال ہو گیا۔ محشر صاحب نے ابتدائی تعلیم اپنے والد کے بعض شاگردوں سے گھر ہی پر حاصل کی؛ اور اس کے بعد، عمر سولہ سال ۱۹۰۴ء میں مقامی لندن مشن ہائی اسکول (حال بابوالا جیسوال انٹر کالج) سے دسویں درجے کا امتحان اول ڈویژن میں پاس کیا۔ اس طرح وہ اردو، فارسی، ہندی اور انگریزی میں خاصی لیاقت کے مالک ہو گئے۔ چونکہ خاندان کی ذمہ داریاں مزید تعلیم کے رستے میں مائل تھیں، اس لیے انہوں نے بسراوقات کے لیے ملازمت کرنے کا فیصلہ کیا۔ اولاً چند مرزا پور کلکٹرٹ میں نوکری کی۔ ۱۸۹۱ء میں ان کی شادی الہ آباد میں ہو گئی اور یہ اگلے برس وہاں چلے گئے۔ یہاں کوئی سال سبھڑ سٹریٹ بورڈ میں کام کیا اور اس کے بعد خفیہ پولیس کے محکمے میں بھرتی ہو گئے۔ شروع میں کرایے کے مکان میں قیام رہا۔ بعد کو جب حالات سازگار ہو گئے، تو ۱۹۰۸ء میں وہیں محلہ بھیجی پور میں اپنا مختصر مکان خرید لیا۔ ملازمت اور اس کے بعد بھی اپنی وفات تک وہ اسی مکان میں مقیم رہے۔

۱۹۲۹ء میں ان کا دفتر الہ آباد سے کھننوتختل مکر رہا گیا، تو یہ بھی اس کے

ساتھ وہاں بھیج دیے گئے۔ نہ معلوم کیوں، وہاں کی آب و ہوا ان کے راس نہ آئی اور اکثر بیمار رہنے لگے، خاص طور پر آنکھوں میں سخت تکلیف پیدا ہو گئی اور بینائی بتدریج کمزور ہونے لگی، اس پر ان کا الہ آباد کے ایک متعلقہ دفتر میں تبادلہ ہو گیا، لیکن اس سے بھی چنداں فائدہ نہ ہوا، رفتہ رفتہ بصارت بالکل جاتی رہی۔ آخر اسی باعث، انہیں قبل از وقت ۱۹۴۷ء میں ریٹائر ہونا پڑا۔

ان کا الہ آباد کے جناب راحت حسین کی صاحبزادی سے نکاح ہوا تھا۔ ان کے بطن سے آٹھ بچے ہوئے: پانچ لڑکے (محمد علی مضطر، غفصنفر علی غفصنفر، اعظم علی، حمید علی، مسعود علی) اور تین لڑکیاں (قیصر جہان، انیس جہان، فردوس جہان)۔ بڑی بیٹی قیصر جہان کا ان کی زندگی میں انتقال ہو گیا تھا۔ باقی سب بچے بفضلہ تعالیٰ زندگی سلامت موجود ہیں۔

انہوں نے ۱۹۲۲ء میں شعر کہنا شروع کیا تھا۔ آغاز سخن گوئی میں پروفیسر ضامن علی ضامن صدر شعبہ اردو، الہ آباد یونیورسٹی کے براہر خود و مید حامد علی حامد مرحوم سے مشورہ رہا۔ سپر سید حسن رفعتی شفیق عماد پوری تعلیم دآمیر بینائی سے رجوع کیا۔ شفیق نے چند غزلیں دیکھنے کے بعد فارغ الاصل، آج قرار دے دیا۔ اس کے بعد کسی سے اصلاح نہیں لی۔ انہوں نے کلام کا مجموعہ ان کی زندگی میں شائع نہیں ہوا۔

۲۵ اکتوبر ۱۹۷۷ء کو فالج کا حملہ ہوا اور ہفتہ بھر بعد بروز جمعہ یکم نومبر ۱۹۷۷ء کو دن کے دس بجے داعی اجل کو لبیک کہا۔ جنازہ اگلے دن ہفتے کو بوقت صبح اٹھا، اور انہیں ہمت گنج کی کربلا میں اپنے خاندان کے بیشتر دوسرے لوگوں کے قریب دفن کر دیا گیا۔

عمر سیر کی مشق و مزاولت ادا ساندہ کی صحبت کا اثر تھا کہ ان کا کلام زبان اور فن کے پہلو سے بے عیب ہو گیا، اور انہوں نے خود استاد ی

کا وجہ حاصل کر لیا۔ انسوس کہ ان کا مجموعہ کلام آج تک شائع نہیں ہوا۔
نمونے کے چند شعر درج دیے ہیں،

میں اسی شے میں گمراہ ہوا جاتا ہوں
یوں کہ کہتی ہے دنیا جسے، وہ تم تو نہیں !
بدگماں کیوں نظر آتی ہیں تمہاری نظریں
خامشی میری بہ اندازِ محکم تو نہیں !
اے تمناؤں کے خالق ! غلشِ غم کے خدا !
عشق ہی حسن کا معصوم تبسم تو نہیں !

یہ مانا چھن گیا آنکھوں کا نور اے محشر ! تو کیا جو دل میں تھی میری وہ شفا ہو گیا
خطا معاف، ہم اس زندگی سے باز آئے۔ نفسِ نفس کا ہمارے شمار ہوتا ہے
تو بہارِ سنِ نفلت، میں جوں عشقِ رسوا
نری زندگی حقیقت، مری زندگی فسانہ

یہ زمانے میں نہیں دم کہ مٹاؤں بھوکو محشر ! میں زمانے سے نہیں ہوں، مردم سے چہرہ نہ
عشق بہارِ بیخزاں، عشق سرورِ جاوداں عشق کا غم نشا طِ جاں عشق سے دل بڑھ گیا
مرنے کا ٹھکانہ لی تو گیا، جیسے کاسِ بہارا ہو تو گیا
انید کی دنیا بس تو گئی، کچھ ان کا اشارہ ہو تو گیا
اے دردِ فراق ! اے دشمنِ جان ! اے زندگی غم کے سماں !
تھے طلبِ جگر جس سے لڑناں، مدد وہ گوارا ہو تو گیا
کلیوں کا تبسم غائب ہے بچوں کے ہیں چہرے پر مدد
لیکن ہم اس پر سچوئے میں، گلزارِ بہارا ہو تو گیا

نمونہ شش رات میں، جب کائنات ہوتی ہے
ترے خیال سے تا صبح بات ہوتی ہے

تاج ٹونکی، نواب محمد اسماعیل علی خان بہادر (والی ٹونک)

انگریزی مرنے کے راجھو تانے میں ۲۲ یاسین تھیں اور ٹونک ان میں واحد مسلم ریاست تھی۔ اس کی بنیاد امیر الدولہ نواب محمد امیر خان (ف ۱۸۳۴ء) نے انگریزوں کے ساتھ طویل کشمکش کے بعد ایک عہد نامے کی رو سے نومبر ۱۸۱۶ء میں رکھی تھی۔ علم و ادب کی سرپرستی اور اسلامی شعائر کی حفاظت اور پابندی ہمیشہ اس ریاست کا خاص شعار اور طرۂ امتیاز رہی۔ حضرت سید احمد بریلوی کی ہم کی ناکامی کے بعد ان کے بقیۃ السیف قافلے کے بیشتر مجاہدین کو یہیں پناہ ملی تھی، محلہ "قافلہ" انھیں اس پناہ کا بسایا ہوا ہے۔ ٹونک کے دوسرے حکمران نواب وزیر الدولہ محمد وزیر خان (ف ۱۸۶۴ء) کا نام غالب کی سوانح حیات میں بہت نمایاں ہے۔

نواب محمد اسماعیل خان اسی سلسلۃ الدہب کی ایک کڑی تھے۔ وہ ۳۱ جنوری ۱۹۱۷ء کو ٹونک میں پیدا ہوئے۔ وہ چوتھے فرمانروا نواب محمد ابراہیم خان مرحوم جنگ کے بیٹے تھے۔ اور بنگالہ کے والی ریاست ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ لیکن مقتد کو کون ٹال سکتا ہے! نواب محمد ابراہیم خان کے انتقال (۲۳ جون ۱۹۳۱ء) پر ان کے بیٹے سعید الدولہ نواب سعادت علی خان سعیدان کے جانشین ہوئے۔ وہ بھی تقریباً پندرہ برس کی جہان نانی کے بعد جمعہ ۲۳ مئی ۱۹۴۷ء کو ماہگراے عالم جاوادی ہوئے۔ چونکہ ان کے کوئی فرزند فرسینہ نہیں تھا، ان کے چھوٹے علاقے سبھانی ممتاز الدولہ فاروقی علی خان گڈی پر بیٹھے۔ لیکن ہی مشکل

سے چھ مہینے گزرے ہونگے کہ ان کا اچانک دل میں اشتعال ہو گیا۔ ان کے بھی کوئی نریمانہ اولاد نہیں تھی۔ اب ان کے برادر محمد احمد اسماعیل خان (جو باقی بھائیوں میں سب سے بڑے تھے) ان کے جانشین قرار پائے۔ جب ملک حکومت ہند کی طرف سے اس کی باقاعدہ توثیق نہیں ہو گئی، تاریخ ادب اردو کے مصنف جناب رام بابو سکسینہ (ف: ۱۹۵۷ء) جو یوپی میں کلکٹر کے عہدے پر فائز تھے، ریاست کے منظم قرار پائے۔ بعد کو حکومت ہند نے ۱۱ فروری ۱۹۴۸ء کو نواب محمد اسماعیل خان کی تخت نشینی کی منظوری دے دی، تو سکسینہ صاحب ہی وزیر اعلیٰ بنا دیتے گئے تھے۔ انھوں نے عزیز الدین امیر الملک کا نقب اختیار کیا تھا۔

لیکن ملک آزاد ہو چکا تھا اور حکومت ہند چاہتی تھی کہ ویسی ریاستیں بھی ملک کے نظم و نسق میں ضم ہو جائیں۔ چنانچہ اس دھوکے پر لینک کہتے ہوئے نواب محمد اسماعیل خان بہادر نے بھی ٹونک کو مارچ ۱۹۴۸ء میں راجپوتانہ سے ملا دیا۔ اس کے باوجود ان کے لیے ٹونک کی رعایا کی محبت اور احترام میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ اسی طرح یہاں کے لوگوں کا لمبا دما وا بنے رہے۔

جمرات ۲۱ نومبر ۱۹۷۷ء کو بعد ظہر بغاضہ کینسر اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ تجسیم و تکفین اگلے دن صبح گیارہ بجے ہوئی۔ جنازے کے ساتھ ہزاروں ہندو مسلمانوں کا مجمع تھا۔ ہر طرف سے جنازے پر گلابی ہو رہی تھی اور کوئی آنکھ اسی نہیں تھی جو شکبارہ ہومویتی باغ (شاہی قبرستان) کے قطعات میں اپنے پرواد انو اب، وزیر الدولہ کے سر پر خاک ہوتے۔

ان کے بھی اولاد نہیں تھی۔ اہل خاندان اور ٹونک کے عوام نے ان کے چھوٹے علاقے بھائی نواب معصوم علی خان کو ان کا جانشین قرار دیا۔

نواب محمد اسماعیل علی خان نے ہوش سنبھالا، تو اپنے ارد گرد علم و فضل اور شعر و سخن کی فضا دیکھی۔ ان کے والد نواب محمد ابراہیم علی خان خود بھی شاعر تھے، غلیل خلق تھا۔ وہ مضر اور پھر بھل سے مشورہ سن کر تے رہے تھے۔

نواب محمد اسماعیل خان کی تعلیم کا معقول غبی انتظام ہوا تھا، انہوں نے مختلف علوم متعدد اساتذہ سے حاصل کیے۔ بعد کو انگریزی تعلیم کے لیے یو کالج، اجمیر بھیجے گئے اور وہاں ایک انگریز ماہر تعلیم انایتی کی نگرانی میں چند برس رہے۔

ٹونک اس زمانے میں شعر و ادب کا شہر تھا۔ یہاں نواب محمد ابراہیم علی خان خلیل کی سرپرستی کے باعث شاعری کا وہ دورہ تھا۔ اساتذہ وقت نواب سلیمان خان بہادر اسد لکھنوی، سید محمد حسین بسمل خیر آبادی، سید محمد انتہار حسین خان مظفر خیر آبادی، سید ظہیر الدین حسین ظہیر دہلوی اور ان کے تلامذہ نے ٹونک کو حریز دہلی و لکھنؤ بنا دیا تھا۔ شاہی خاندان کے بیشتر افراد اور شہر کے لوگ شعر سے دلچسپی لیتے تھے اور آئے دن مشاعرے ہوتے رہتے تھے۔ ایسی فضا میں اگر نوجوان محمد اسماعیل خان بھی شعر گوئی کی طرف مائل ہو گئے تو اس میں تعجب کا کیا مقام ہے! چنانچہ انہوں نے تاج تخلص اختیار کیا اور اردو میں طبع آزمائی کرنے لگے۔

انہوں نے مشورۂ ستم مولانا عبدالقادر خنداں لکھنوی ثم اجمیری سے کیا، جو عربی و فارسی کے عالم اور اردو کے صاحب فن کہنے مشق شاعر ہیں۔ انہوں نے خود اپنے کلام پر مفتی مہدی حسن اور مولانا مفتی اجمیری سے اصلاح لی تھی۔

۱۹۴۷ء تک اجمیر ہی میں رہے۔ آزادی ملک کے بعد حبیب دہاں کی سکونت مجددش ہو گئی، تو ٹونک چلے گئے۔ شروع میں بہت دنوں تک نواب صاحب کے گنا بھلنے کے مہتمم بھی رہے۔ نواب صاحب مرحوم ان کے بڑے قدردان تھے۔

تاج مرحوم غزل سے بھی شغف رکھتے تھے۔ ان کے غزلیہ کلام کا دیوان (لمعاتِ تاج) مرتب شدہ خنداں صاحب کے پاس موجود ہے، جس میں سے چند شعر انتخاب کر کے آخر میں دیے جا رہے ہیں۔ انہیں حضرت رسالت کی ذاتِ ستودہ صفات سے جو محبت اور راوراوت تھی، اس کا اظہار اکثر نعت کی

شکل میں ہوتا رہتا تھا۔ اپنے پندرہ بزرگوار حضرت جلیل کے اتباع میں ربیع الاول میں سات دن تک محفل میلاد کا قیام ان کے عہد میں بھی جاری رہا۔ اس کے اخراجات کے لیے ہزاروں روپیہ اپنی جیب خاص سے عطا کرتے تھے۔ مدینہ بلا امتیاز مذہب و ملت شیرینی تقسیم ہوتی تھی اور آپ کے محل نذر باغ میں چراغاں ہوتا تھا۔ ٹونک کو عقلیوں کے بارے میں مولانا منظور الحسن برکاتی کا لکھا ہوا کد کچھ ”ٹونک کے جشن میلاد النبی“ قاصد کی چیز ہے۔ مولانا برکاتی ہی کا مرتب کردہ تاج مرحوم کے نعتیہ کلام کا انتخاب بھی ”تاجدار مدینہ“ کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے (ٹونک ۶۷ ۱۹۶۷) اس کے شروع میں انھوں نے وسیع اور جامع مقدمے کا اضافہ کیا ہے۔ اس پر نواب صاحب مرحوم نے انھیں خطاب اور خلعت سے نوازا تھا۔

انھوں نے اپنے محل ”نذر باغ“ میں پندرہ روزہ مشاعرے کا التزام کیا تھا۔ یہ مشاعرے طرحی ہوتے، اور مضرع خود نواب صاحب مرحوم تجویز کرتے تھے۔ ٹونک کے ممتاز شعرا کے وظائف مقرر تھے۔ باہر سے بھی مشاہیر دعوت پر بلائے جاتے اور ان کے اعزاز و اکرام میں کوئی کمی نہیں کی جاتی تھی۔ اگست ۱۹۶۷ء میں ان کی سرپرستی میں ”تاج اکیڈمی“ قائم ہوئی تھی جس کا مقصد ٹونک کی علمی اور ادبی تاریخ کی ترتیب اور ریاست کے جلیل القدر شعرا و ادبا کی تخلیقات کا تعارف تھا۔ یہ اکیڈمی آج بھی موجود ہے، غرض ان کی وفات سے ایک صاحب علم اور قدروان شعر و ادب شخص اہم سے جدا ہو گیا۔

اب نمونہ کلام ملاحظہ ہو :

تضمین

حرے اخلاق سے قائم ہوا دنیا کا کلام ایک ہی مضمین کھڑے کر کے آنا و غلام

تذکرہ معاصرین

تکلی بخت کے شاکی ہوئے سب شیریں کلام بحرِ لطف و عنایت، محیطِ اکرام !
 تھرے سرسبز و تر و تازہ ریاضِ اسلام دشتِ پرغارجاں، بن گیا گلزارِ حمام
 تحلیِ بستانِ مدینہ ز تو سرسبز مدام زان شدہ شہرۂ آفاق پر شیریں رطبی

تضمین

جگر تھامے ہوئے کوئی، کوئی مضطرب، کوئی بیدم
 کسی کے لب پہ آہیں، کوئی محوِ گریہ، پیہم
 غرض میں کیا کہوں پیشِ نظر تھا کو لسا عالم
 رمنی دانم چہ منزل بود شب جائے کہ میں بودم
 بہر شورِ قہرِ بیل بود شب جائے کہ میں بودم

جمالِ حسن پر جس کی ندرِ اجنت کے نظارے
 جو دیکھے اک نظر، قدموں پہ اک گمانِ دلِ دارے
 مجسمِ نوبہارے، تجلّذارے، ایک رفتارے
 پری پیکرِ نگارے، سرو قدِ لالہ رخسارے
 سراپا آفتِ دل بود شب جائے کہ میں بودم

عجب اک کشمکش میں مبتلا تھی، تاجِ میری جاں
 زمین و آسمان حیراں اور دیوار تھے لرزاں
 مجھ لینا تھے خلعت میں کسی سے آج کچھ پیاں
 رقیبانِ گوشِ برآواز، اور ناز، من ترساں
 سخنِ گفتن چہ مشکل بود شب جائے کہ میں بودم

بہالِ دمِ زدن ہے اور نہ یارے یاں خسرو !
 یاں کیسے کروں، کیسے کھلے میری زباں، خسرو

یہ شانِ تاجدارِ تاجدارانِ جہاں، خسرو!

خدا خود میرِ مجلسِ بود اندر لامکاں خسرو!

محمد شمعِ مغل بود شبِ جاے کہ میں بودیم

اب نزل کے چند شعرِ ملاحظہ ہوں :-

ان کے ہونٹوں پر نسی ہے اختیار آنے لگی

پھر ہرے ہونے لگے زخمِ جگر لے ہنٹیں!

یکے سے ہر آج ہی کالی گٹھا چھلنے لگی

آج ہی ہم نے کیا سنا غمِ ترکِ میکشی

گاہِ آدبِ محبت سے گزر جاتا ہوں میں

گاہِ آدبِ محبت کی قسم کھاتا ہوں میں

شعر کے چھوٹے میں دردِ دل سنا ہوتا ہوں

تاج میری شاعری کیا، ہر سرِ محفل کبھی

میں ناتم بے ستوں لاکھوں تو ایت اور سیاہے

کشتی کا عشق کی، ادنیٰ سایہ فیضان ہے شاید

گریباں چاک آنکھیں سرخ چہرہ خاک آلودہ

یہی اے تاج! اربابِ جنوں کی شان ہے شاید

دل پہ اب اختیار ہے میرا اب نہیں انتظار ہے میرا

ان کے آنے کا کچھ یقین سب ہے آج دل بقیہ راز ہے میرا

جگر میں سوز، دل میں درد، آغشتہ بخوں آنسو

فراہم ہو گئے سامانِ تکمیلِ محبت کے

گندہی میں میری عشق میں رہیں ہزار ہا طے میں نے کی میں عشق کی رہیں ہزار ہا

اتنا ہی کھردیا کہ سراپا ہوں شوقِ دید کھدے کے واسطے تو میں باتیں ہزار ہا

تو اس کے التفات سے غافل نہ رہ کبھی اے تاج! جس کی ہیں اوکھیں ہزار ہا

یہ خالی اہلِ دل سے تاج! وہ فرما دو مجھوں سے

یہ سب آبا بیاں جبرئی، یہ سب چرانے جھوٹے ہیں

ہوشِ ہستی، نہ تابوِ نظارہ اب کی کیسی بہار آتی ہے

رہِ عشق میں شوقِ ہوسِ ہفر تو دشواریاں سب ہیں آسانیاں

پوچھتے رہتے ہیں، مرے حالات میں سنا تا ہوں تو بگڑتے ہیں
 جس کو ہونزل لعل پریشیاں سے کسی کا نسبت
 اس کا جتنا کبھی پریشان ہو حال، اچھا ہے
 تاجِ بے عشق کی دنیا کا نرالا دستور
 حال جس کا ہو بُرا، اس کا مال اچھا ہے
 یہ گھلتاں تھے جہاں اب ہیں ڈھیر خاروں کے
 یہاں اترتے تھے سوکاروں ہزاروں کے
 جہیں ڈبویا سٹھا طوفاں نے، وہ ابھر کے رہے
 وہ ابھرے ڈوبنے والے کبھی کناروں کے

دل بہت ہتھکڑا رہے میرا
 دل پہ کیا اختیار ہے میرا

تمرچھوڑی، عبدالحفیظ صدیقی

ان کے خاندان میں ایک طرف عربی علوم اور اسلامیت کی روایت تھی، تو دوسری طرف شاعری اور وکالت کا پیشہ۔ ان کے والد مولوی عبد اللہ جھپڑو کے کامیاب وکیل تھے اور اردو فارسی میں شعر بھی کہتے تھے، انمشت خالص تھا۔ انہیں تاریخ نوی میں خاص ملکہ حاصل تھا۔ تاریخی نام سے اپنا مجموعہ کلام ”یہاں الغائب“ کے نام سے مرتب کیا تھا، جو غیر مطبوعہ رہ گیا۔ ان کے والد (یعنی ٹمر کے دادا) مولوی بخشش علی عربی اور فارسی کے عالم، وینیات کے فاضل اور فارسی کے شاعر تھے۔ انہیں بھی تاریخ گوئی میں خاص مہارت حاصل تھی۔ ان کا غیر مطبوعہ دیوان بھی خاندان میں موجود ہے۔

ایسے ماحول میں ٹمر (عبدالحفیظ) کی یکم فروری ۱۹۱۳ء کو چھپڑو (محلہ دھیانوال) میں پیدائش ہوئی۔ وہ آٹھ سہجائی بہن تھے۔ دو سہجائی ان سے بڑے تھے چار چھوٹے، بہن بھی چھوٹی تھیں۔ یہ سات آٹھ برس کے تھے کہ ۱۹۲۰ء میں ان کے دادا مرحوم نے ان کے بڑے سہجائی عبدالحکیم کے ساتھ تعلیم کے لیے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ بھیج دیا۔ یہاں وہ دو برس تک رہے۔ لیکن سیاسی ہنگاموں، بالخصوص خلافت تحریک کے باعث یکسوئی نصیب نہ ہو سکی، آخر ان کے والد کے مشورے سے انہیں انگریزی تعلیم دلانے کا فیصلہ ہوا اور یہ پٹنہ واپس آ گئے۔ یہاں چھپڑو اسکول میں داخلہ لے لیا۔ اس سے فارغ

ہو کر پٹنہ کالج میں پہنچے۔ درجہ بدرجہ ترقی کر کے بالآخر ۱۹۳۴ء میں پٹنہ یونیورسٹی سے بی اے کی سند لی۔ اس کے بعد وکالت کا امتحان (ایل ایل، بی) بھی پاس کر لیا۔

تعلیمی تکمیل کے بعد کسبِ معاش کا مرحلہ آیا، تو اپنی سادگی پسند طبیعت سے امتنا سے شروع میں معلّیٰ کا پیشہ اختیار کیا اور پر سالیانہ اکول، سالانہ دہار میں ملازم ہو گئے۔ لیکن نئی حالات کی مجبوری کے باعث یہاں ذیادہ دن بھگ نہیں رہ سکے اور والد کے توسط سے پٹنہ ہائی کورٹ میں مترجم کی حیثیت سے ملازم ہو گئے۔ آدمی محنتی تھے اور اخلاص و ایمان داری سے کام کرنے والے، محکمے میں ترقی پاتی گئی۔ پہلے ناظمِ ولد الترمیم مقرر ہوئے اور اخیر میں اوتھو کیشنرز اسی جگہ سے ۱۹۴۱ء میں مسکند دفس ہو کر پھلواری شریف میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔

صحت بظاہر حال ہمیشہ اچھی رہی۔ اکتوبر ۱۹۴۳ء میں دل کا دورہ پڑا۔ علاج کے لیے اسپتال چلے گئے۔ جہینا بھر بعد ۲۶ نومبر (۱۹۴۳ء) کو معالجوں نے کہا کہ آپ ٹھیک ہو گئے ہیں یہاں میں، تو مکان پر واپس جا سکے تھے۔ چنانچہ اسی شام پھلواری شریف پہنچے۔ دوست احباب، رشتہ دار سب خوش و خرم تھے، ہنس ہنس کر ان سے باتیں کرتے رہے۔ اچانک دس بجے شب میں طبیعت بگڑ گئی اور اللہ اللہ کرتے جاں بحق ہو گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

دعا گاہِ مندوم منہاج الدین راستی میں سپردِ خاک ہوئے۔ ابتدائی ماحول اور تعلیم کے زیر اثر شہر سے دوری و اتقا کی طرف مائل تھے۔ ہمیشہ پابندِ صلوٰۃ و صوم اور عاملِ امداد و مطلق رہے۔ ان کی فکری کا بانیِ سائیت یہ ہے کہ جب ان کے والد کا انتقال ہوا ہے، تو سب نے اتفاقاً راسے نماز جنازہ پڑھانے کے لیے انھیں امام بنا دیا۔

ان کی مشاوری کو طور (آرم) میں داروغہ۔ مجلس کی صاحبزادی (فیضانِ انور)

سے ہوئی تھی۔ ان کے بطن سے چار بچے ہوئے: ایک لڑکا (جاوید اقبال) اور تین لڑکیاں۔ ماشاء اللہ سب موجود ہیں۔

جس زمانے میں لکھنؤ میں زیر تعلیم تھے، وہاں دارالعلوم میں ایک تہذیبی سخن سنی، جس کے اہتمام میں مشاعرے منعقد ہوتے رہتے تھے۔ ان کی آٹھ نوبریں کی عمر تھی، یہی ان مشاعروں میں جاتے اور وہاں اپنے سے بڑے طلبہ سے شعرے کر اپنے نام سے پڑھ دیتے۔ یہی تفتن ان کی شعر گوئی سے شوق کی بنیاد بن گیا۔ چھپرو اسکول کی طالب علمی کے زمانے میں خود کچھ تک بندی کرنے لگے۔ اور صلاح کے لیے اسے اپنے دارالعلوم لکھنؤ کے رفیق سید ابراہیم ندوی ختم سابق پرنسڈنٹ اسلامک اسٹڈیز، پٹنہ کے پاس بھیجے گئے۔ اس کا احترام ایک شعر میں بھی کیا ہے۔

شاعری آتی نہ تھی مداحی مجھ کو اے ثمر!
محبتِ نجم سخنور نے سخنداں کر دیا

چندے بعد نجم لے بغیں اپنے استاد حضرت آغا عابدی جیلپی (ف: نومبر ۱۹۷۲ء) کے سپرد کر دیا۔ یہ سلسلہ بھی جلد ہی منقطع ہو گیا اور ۱۹۳۳ء میں یہ سیماب اکبر آبادی (ف: جنوری ۱۹۵۱ء) کے حلقہ تلمذ میں شامل ہو گئے، آخر تک انھیں کے دامن سے وابستہ رہے۔ ان کے بارے میں کہتے ہیں:

کہنے کو بکثرت ہیں سخنور، لیکن

سیماب کو استاد دیکھا نہ دیکھا

انھیں شریعت سے بھی دلچسپی تھی کہ، زمانے میں شہور فرانسیسی ناول نویس اور مصنف ہجوگو کے ناول کا ترجمہ بد نصیب کے عنوان سے کیا تھا۔ ابتدا میں کچھ نظمیں انگریزی میں لکھی تھیں، جو انگریزی ماہنامے "ٹریجر چٹ" میں شائع ہوتی تھیں۔ افسوس کہ ان کا کوئی اردو مجموعہ میری نظر سے نہیں گزرا۔ کلام بہت نچتر اور بے عیب ہے۔ فلسفیانہ طبیعت پانی تھی ہی کی

جھک ان کے کلام میں بھی ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں :

سب کیا جو سفر میں ہر قدم پر ساتھ ہے میرے

یہ گر و راہ میری رازوں معلوم ہوتی ہے

سوئی پڑی ہے عیش کی منزل ترے بغیر

پیمانہ بن کے ٹوٹ گیا دل ترے بغیر

مقصود ہر آنہ سعی کا حاصل ترے بغیر

منزل پہ بھی ہے صورت منزل ترے بغیر

بستم نگہ نشہ کار، کیا کہنا ! بدل دیا ہے رخِ روزگار، کیا کہنا !

آلِ یک نگہ حسنِ یار، کیا کہنا ! بنا ہے خرمِ دل پر شرار، کیا کہنا !

فریبِ وعدہ و حسنِ یار، کیا کہنا ! پھر اس پہ بھی ہے ترا اعتبار، کیا کہنا !

جہاں یار نے تجدیدِ عشق کا پیراں یک نگاہ کیا استوار، کیا کہنا !

خاموشی میں بھی کوئی کرتا ہے، کیا سرگوشیاں

سن رہا ہوں آپ اپنی داستانِ دل کے قریب

نشاطِ انجیز حب انسان کی تقدیر ہوتی ہے

تو خود بیٹھ بیٹھائے غیب سے تدبیر ہوتی ہے

جب دل ہی نہیں پاک، تو کیا سمجھو گے ! ہے عقل نہیں خاک، تو کیا سمجھو گے !

دنیا کے بول یا عالمِ بالا کے دود پیدا نہیں ادراک، تو کیا سمجھو گے !

دشوا ہے انسان کا انسان ہونا ہاں سہل نہیں، صاحبِ عرفاں ہونا

پھر بھی، ٹٹرا ! انسان جو کدو ہو مشکل نہیں، مشکل کا بھی آسان ہونا

دانا قدرت کسی کو معلوم نہیں اہلی فطرت کسی کو معلوم نہیں

تدبیر پر اعتماد سے، سب کو ٹٹو اپنی قسمت کسی کو معلوم نہیں

انور کامٹوسی، حافظ یار محمد انصاری

۱۸۵۷ء کی افادہ کے بعد انگریزی سیاست کی سخت گیری کے باعث شمالی ہند کے معاشرے میں ایک بڑی تبدیلی یہ آئی کہ یہاں کی گھریلو صنعتیں روہڑوال ہو گئیں۔ اس زمانے میں کئی دستکار اور پیشہ ور خاندان تلاش معاش میں ترک وطن پر مجبور ہو گئے۔ انھیں میں یوپی کے دیہات کے پارچہ باف بھی تھے، جو عرف عام میں انصاری کہلاتے ہیں۔ اسی برادری کا ایک خاندان نزاری (ضلع فیض آباد) سے ۱۹۰۷ء میں ہجرت کر کے ناگپور سے ۱۶ کلومیٹر کی دوری پر کامٹی میں ہالہسا، جو اس زمانے میں تجارت، کارکنز تھا۔ اس خاندان کے بزرگ حاجی شیخ امیر تھے۔ موصوف کے چار بیٹے ہوئے، جن میں سے دو نے خاصا نام پایا۔ بڑے اسو فی مولوی اعلیٰ محمد، عالم اور درس و تدریس سے شغف رکھنے والے بزرگ تھے۔ انھوں نے سید غلام کبریا کے ہاتھ پر بیعت کی تھی، خود بھی صاحب اجازت تھے۔ بہت سے لوگوں نے ان سے فیض حاصل کیا۔ مارچ ۱۹۵۵ء میں رحلت کی۔

شیخ امیر کے دوسرے بیٹے بھی حافظ یار محمد انور تھے۔ کہا کرتے تھے کہ جب خاندان نزاری سے کاشی آیا ہے، تو میری عمر کوئی سات برس کی ہوگی۔ اس طرح ان کا سال ولادت ۱۹۰۰ء کے قریب ہونا چاہیے۔ کامٹی پہنچ کر شیخ نے بیٹے کو تعلیم کے لیے یہاں کے مشہور استاد حافظ حاجی صفی اللہ کے حوالے

کر دیا۔ چنانچہ انھوں نے حاجی صاحب موصوف کی نگرانی میں قرآنِ ناظرہ ختم کیا اور اسے حفظ بھی کر لیا۔ اس کے بعد فارسی ایک دوسرے استاد بخشی محمد اسحاق صاحب سے پڑھی۔ کسبِ معاش کے لیے اپنے آبائی پیشے کو ورثہ بنا یا۔

یونہی کے اکثر مراثیوں کے کامٹی میں بس جانے کے باعث یہاں اردو کا مورا اور شعر و ادب کا خصوصاً اچھا خاصا چرچا تھا۔ سال بھر مشاعرے ہوتے رہتے، اور مشعرہ محرم کی مجالس تو بڑے اہتمام سے ہوا کرتی تھیں۔ انور کی شعر گوئی مشرور ہو چکی تھی۔ وہ بھی ان مجالسوں میں شریک ہوتے اور وہاں سلام وغیرہ پڑھتے۔ اس کے بعد طبیعت غزل کی طرف راغب ہوئی، تو انھوں نے مشہور مقامی شاعر سعید کا مٹوی (ف: ص ۱۹۳) سے اصلاح لینا شروع کی۔

سعید خود صاحب فن اور کہنہ مشق شاعر تھے۔ ایک زمانہ ہوا، ان کا ایک مجموعہ کلام ”ارمغانِ جدید“ کے تاریخی عالم (۱۳۱۵ھ) سے شائع ہوا تھا۔ سعید نے ابتدا میں چندے نشی خوش محمد سے اصلاح لی، بعد کو حاجی تھیل حسین تھیل جلاپوری (ف: ص ۱۹۳) سے مشورہ کرنے لگے۔ تھیل کا سلسلہ تین چار واسطوں سے ناسخ سے جاملتا ہے۔ لیکن تعجب ہے کہ اگرچہ سعید کے کلام میں لکھنوی رنگ نمایاں ہے، مگر انور کے ہاں اس کا اثر بالکل برائے نام ہے۔ رفتہ رفتہ انور نے خود استاد کی کا درجہ حاصل کر لیا۔ اس نواح میں ان کے شاگردوں کی تعداد کچھ کم نہیں ہے۔

نیو کامٹی کلب نے ان کے کلام کا انتخاب ”تجلیاتِ انور“ کے عنوان سے شائع کیا تھا۔ ہنوز بہت کلام غیر مطبوعہ موجود ہے۔ کلام کا جو انداز ادبی معیار ہے اس کے پیش نظر یہ اس لائق ہے کہ اسے شائع ہونے سے بچایا جائے۔ اپنے مگر۔ کے ماحول اور تعلیم کے زیر اثر ساری عمر صوم و سلوٹہ کے پابند ہے۔

۱۹۶۱ء میں حج بھی کیا تھا۔ اخیر تک آرام و رفقاں میں مساجد میں تراویح پڑھاتے رہے۔ غرض مفتی، پرمیزگار، پاملر و منیع بزرگ تھے۔ وہ اختلاجِ قلب کے مریض تھے۔ بدھ ۲ نومبر ۱۹۷۳ء (۱۳ ذی قعدہ ۱۴۱۳ھ) دن کے گیارہ بجے مرض کا شدید حملہ ہوا، جس سے جانبر نہ ہو سکے۔ اسی دن مغرب کے قریب سلم قبرستان، کامٹی میں تدفین عمل میں آئی۔ حکیم حریر قدوسی کامٹی نے قطعہ تاریخ و وفات کہا:

اٹھ گئے، بزمِ جہاں سے افسوس ناز تھا اہل سخن کو، جن پر
از سر آہ، کہا دل نے، عزیز! تیغ جاتے رہے حافظ الود
(۱) + ۱۹۷۳ = ۱۹۷۴ (۱۹۷۳)

صلبی اولاد میں چار بیٹے اور دو بیٹیاں اپنی یادگار چھوڑیں۔
انور مرحوم بسیار گونہیں تھے، لیکن جو بھی کہا، خوب کہا۔ شہب جو تلہ ہے کہ
کافی کے غیر شاعرانہ ماحول میں وہ اتنے کامیاب شاعر کیونکر ہو گئے،
واقعی یہ خدائے بخشندہ کی دین ہے۔ تجلیاتِ انور سے چند شعر ملاحظہ
ہوں:

جانا بھی چاہتا ہوں تری بزمِ ناز سے
پھر یہ بھی سوچتا ہوں کہ جایا نہ جاتیگا
دیوانگی شوق کا عالم جو ہے، یہی
انور سے ان کے سامنے جایا نہ جاتیگا
شب غم، شام سے گھبرا رہا ہوں
کنن کیا باندھ لوں میں سر سے، انور!
الہی! غیر کیا انجام ہوگا!
سنا ہے، آج قتلِ عام ہوگا!

آیا وہ، اور دل کو کیا اے کے چل دیا
کما کر بھی سو فریبِ محبت ہوں مطمئن
ہم سوچتے ہی رہ گئے، یہ ماجرا ہے کیا!
یہ ہجر کاری بت رنگین اداس کیا!

اس کو تری محفل میں تری دیکھ ہے کام کون آیا، گیا کون، یہ انور کو خبر کیا!
 جہت گھبرا ہے ہو، قصہ غم کی درخیزی سے
 جہاں تک سن سکو گئے تم، وہیں تک پہنچا پنا
 تم مہربان تھے، تو زمانہ تھا مہربان۔۔۔ تم مہربان نہیں، تو کوئی مہربان نہیں
 آتی بھی بہلاؤ اور! رخصت بھی ہوتی کب کی
 اب ہم سے گھر ہاں سے الگ ہوا سودا جی
 دو دن کی زندگی بھی بڑی چیز ہے، مگر جینا ہی جب نہ آئے، تو پھر کیا کرے کوئی!
 گتھیاں سلجھاتی سب نے، کچھ بنا لیکن نہ کام
 راز تھی پہلے بھی دینا، اور اب بھی راز ہے
 دہی میں ہوں، جو ستھانا کام شرحِ آرزو اک دن
 دہی میں ہوں، جسے کہتا تھا ہر اک بیڑیاں پہلے
 یہ سوچتے ہی سوچتے، انور گدھر گئے اس زندگی میں کیجیے کیا، کیا نہ کیجیے
 ہر مدد کی، ہر غم کی دوا میرے لیے ہے کیا نام تو تا نام خدا میرے لیے ہے
 تنہوڑی کی پیش رفت بھی الفت میں ہے بہت
 دل سے لے نہ دل، تو نظر سے نظر ملے

شاہ معین الدین احمد ندوی

یونپ کے ضلع بارہ بنگی میں ایک مردم خیز قصبہ رڈولی ہے۔ یہاں سے بعض ایسی ہستیاں اٹھیں جنہوں نے زندگی کے مختلف شعبوں میں امتیاز حاصل کیا اور آج تک ان کا نام عزت و احترام سے لیا جاتا ہے۔ انہیں میں صابر بہ چشتیہ سلسلے کے بزرگ حضرت شیخ عبدالحق (ف: ۱۳۶۷ھ) بھی تھے۔ جن کے نام سے اہل دل کے پیرے روشن اصداغ کی محفلیں آج بھی گرم ہیں۔ رڈولی میں ان کا مزار مرجع الناس ہے۔ شاہ معین الدین احمد ندوی انہیں کے خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ یہ خاندان نسباً فاروقی ہے۔

شاہ صاحب ۱۹۰۳ء میں رڈولی میں پیدا ہوئے۔ گھر کی زمینداری تھی۔ ان کے والد شاہ حسناات احمد مرحوم مجذوب صفت بزرگ تھے۔ اسی لیے شاہ معین الدین اپنے نانا کی کفالت میں آگئے۔ نانا شاہ شرف الدین تعلیم یافتہ اور قدردانِ علم ہونے کے باوجود یہ نہیں چاہتے تھے کہ یہ مزید تعلیم کے لیے گھر سے باہر جائیں۔ لیکن معین الدین احمد کی قسمت میں کچھ اور لکھا تھا۔ انہوں نے کوتاہ زمانہ سنی مطابق اسد اور فارسی کی ابتدائی کتابیں گھر پر پڑھیں اور مزید دینی تعلیم کے لیے لکھنؤ پہنچ گئے۔ یہاں متوسطات تک کی مدرسہ نظامیہ، فرنگی محل میں تحصیل کی اور اس کے بعد تکمیل کے لیے ۱۹۲۲ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخلہ لے لیا۔ اس عہد میں یہاں دارالعلوم میں ہر مضمون کا استاد اپنے

قرن کا ماہر و نقیر و تحریر کے میدان کا شہسوار طلبہ کا بلی ہمدرد تھا۔ نوجوان طالب علم نے اسی علمی ماحول سے اس اپنے استاد سے سب کچھ راستہ فراہم کیا۔ اس نے میں مولانا عبدالرحمن نگرانی (ف: مارچ ۱۹۲۶ء) دارالعلوم میں تفسیر کے استاد تھے۔ عجیب و غریب آدمی تھے، یہ مولانا نگرانی۔ علم و فضل کا شعلہ جوالہ! انوس کہ یہ آج کی جلد ہی تندی مہیا سے پگھل کر صرف ۲۷ برس کی عمر میں آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ شاہ معین الدین احمد ان کے چھوٹے شاگرد تھے۔ نگرانی مرحوم نے ان میں جو بہترین قابل دیکھا، تو ۱۹۲۴ء میں ان کے دارالعلوم سے فارغ ہونے پر انہیں اپنے استاد مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم (ف: نومبر ۱۹۵۲ء) نانظم دارالمصنفین کے پاس بوائے لئے کیا شعبہ تفسیری تھی۔ جب ۲۱ سالہ نوجوان شاہ معین الدین احمد نے دارالمصنفین کے احاطے میں قدم رکھا تھا۔ جو رشتہ اس دن سے قائم ہوا، وہ پچاس سال کے بعد موت کے ساتھ ٹوٹا۔

مولانا سید سلیمان نے انہیں تربیت کے لیے (۲۵ روپے ماہرے پر) رفیق مقرر کر دیا۔ آہستہ آہستہ انہیں لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ دارالمصنفین نے سیرۃ النبوی کی تالیف کے بعد صحابہ کے حالات کی تدوین شروع کی تھی۔ اس کی ابتداء دینی رد و جلدیں (خلافا سے راشدین) اور مہاجرین (حصہ اول) مولانا حاجی معین الدین ندوی (ف: ۱۹۴۱ء) نے مرتب کی تھیں۔ اب انہیں کے ہمام شاہ معین الدین احمد جوالہ کے ہاتھ لگے، تو سید سلیمان ندوی مرحوم نے اسے خالی ٹیک خیال کیا اور اس سلسلے کی تکمیل ان کے سپرد کر دی۔ شاہ صاحب مرحوم نے اس سلسلے میں تہا جرین (جلد دوم) لکھی؛ پھر تابعین لکھی؛ پھر صحابہ غیر مہاجر و انصار کی سیرت لکھی۔ اسی زمانے میں وسعت مطالعہ سے انہیں تاریخ اسلام لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ انہوں نے آغا سے خلافت بنو عباس کے اختتام تک چار جلدوں میں یہ سلسلہ مکمل کیا۔ یہ

کتاب بہت مقبول ہوئی۔ متعدد یونیورسٹیوں اور کالجوں کے نصاب میں شامل ہے اور اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

ان کے علاوہ ان کی بعض کتابیں یہ ہیں: اسلام اور عربی تمدن (عربی سے ترجمہ) عرب کی موجودہ حکومتیں، دین رحمت، حیات سلیمان (مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کی سوانح عمری)، ادبی نقوش (مجموعہ مضامین)۔ انہوں نے ۱۹۶۹ء تا ۱۹۷۱ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں "اقبال کی شاہی" کے موضوع پر توسیعی خطبات بھی دیے تھے، یہ شاید بنور کتابی شکل میں شائع نہیں ہوئے۔

معارف کے مشذرات وہ مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کے بھوپال چلے جانے کے بعد ہی سے مستقلآ لکھنے لگے تھے۔ ان کی تحریر کی سلاست اور مناسبت پنہنگی اور اصابت مانے کے سب قائل تھے۔ سخت سے سخت بات بھی ایسی نرم اور سادگی سے کہ جانتے سمجھتے کہ بڑے سے بڑا مخالف بھی اس پر انگلی نہیں دیکھ سکتا تھا۔

وہ تمام تعیناتی کاموں میں سید سلیمان ندوی مرحوم کے دستِ راست رہے۔ ۱۹۴۵ء میں مولانا ندوی مرحوم بعض مقامی حالات سے دل برداشتہ ہو گئے۔ انہیں آیام میں نواب محمد حمید الدخان والی بھوپال (ف، فروری ۱۹۶۰ء) نے انہیں اصرار سے اپنے ہاں آنے کی دعوت دی۔ اس پر مولانا سید سلیمان کو عظم گڑھ چھوڑ کر بھوپال جانا پڑا۔ وہ وہاں قضاتِ اعلیٰ کے منصب پر نیز دیہی اور ندہی امور کے منصرم بن کر لگے تھے۔ ان کی عدم موجودگی میں شاہ صاحب مرحوم نے دارالمصنفین کا نظم و نسق اور معارف کی ادارت کی فہم داری جس خوش اسلوبی سے سرانجام دی، اس پر استاد نے خوشنودی کی سند دی، اور تمبین کا اہماریا۔ پھر ۱۹۵۱ء میں جب سید صاحب منتقل طور پر ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے، تو اب اس تاریخی ادارے کا سالار باران

کے اور ان کے رفیق کار سید صباح الدین مہدار علی کے کندھوں پر آ پڑا۔ اور خدا کا شکر ہے کہ وہ اس سے بوجہ احسن عہدہ برآ ہوئے۔ اسی کا شاندار نتیجہ دارالصفین کا جیشن ترین محتاجو فروری ۱۹۶۳ء میں نائب صدر مجیدی ڈاکٹر فاکر حسین مرحوم (ف، م، ۱۹۶۹ء) کی صدارت میں منعقد ہوا اور جس میں ملک بھر کے علماء اور اہل علم نے شرکت کی تھی۔

سیہ ششی، اقربا پروری، استغنا، توکل ان کے کردار کے اجزائے ترکیبی تھے۔ ۱۹۶۴ء میں مشاہیرہ محض ۲۵ روپے مقرر ہوا، تو وہ اسی میں خوش تھے۔ آخر میں بڑھتے بڑھتے یہ ۳۴ سوئیک پہنچا تو بھی انہوں نے کسی طعراق اور نمائش کا مظاہرہ نہیں کیا۔ اس اثنا میں بڑے بڑے مشاہیرے پر بارہے بلاؤ آئے۔ مدرسۃ عالیہ، گلگتہ نے جلایا، جامعۃ کلبیہ اسلامیدہ، نئی دہلی نے اپنے یہاں آنے کی دعوت دی۔ لیکن اس مردِ خدا نے ایک درگزر و محکم گیر کے اصول پر عمل کرتے ہوئے اپنے استاد اور دادا استاد کی یادگار کو پیسنے سے لگا سنے رکھا، اور سب کو جواب دے دیا۔ ہر چہ اپنے اپنی آمدنی کا ایک حصہ اپنے اعزہ اور دوسرے متقی اصحاب کے لیے الگ کر دیتے تھے۔ ۱۹۶۹ء میں صدر جمہوریہ ہند کی طرف سے عربی کی سند اعزاز ملی، جس کے ساتھ تین ہزار سالانہ کا وظیفہ بھی ملتا ہے، تو اس کا بیشتر حصہ بھی اسی طرح تقسیم ہوتا رہا۔ ان کے والد بہت نرمی زمین چھوڑے۔ بڑے تھے۔ شاہ صاحب مرحوم نے اپنے حصہ کی زمین چھوڑے۔ سبھاٹی شاہ امام احمد کو بہہ کر دی کہ مجھے اس کی ضرورت نہیں، اور تمہارے پاس کوئی اور ذریعہ معاش نہیں ہے۔ عمر کے ساتھ استغنا کا یہ رنگ اور گہرا ہو گیا تھا۔ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی (سہارنپور) ابتر تبلیغی جماعت سے بیعت تھے اور اس جماعت کا جو رنگ ہے، اسے جاننے والے جانتے ہیں۔ دو مرتبہ (۱۹۶۹ء و ۱۹۷۳ء) حج بیت اللہ کی سعادت بھی نصیب ہوئی۔

ان کی پہلی شادی رُفوعی کی مشہور شخصیت شاہ مصطفیٰ احمد کی چھوٹی صاحبزادی حضرت النساء بیگم سے (جو کسی زمانے میں سہو پال میں اکاؤنٹنٹ جنرل تھے) عنوانِ شباب میں ہو گئی تھی، لیکن جلد ہی یہ خاتون ایک لڑکا اپنی یادگار چھوڑ کر ۱۱ دسمبر ۱۹۲۵ء (۲۵ جمادی الاول ۱۳۴۴ھ) کو انہیں داغ مفارقت دے گئیں۔ چندے بعد دوسری شادی شیخ منظور الحق نعمانی کی صاحبزادی وحی النساء سے ہوئی۔ لیکن یہی حادثہ پھر پیش آیا۔ ان کا ۳۸ دسمبر ۱۹۳۶ء کو انتقال ہوا۔ گھر والوں نے بہت کوشش کی کہ وہ پھر تاہل کا جو اگلے میں ڈال لیں۔ اس وقت عمر یہی ۲۵ برس کی رہی ہوگی۔ لیکن اس قدر کے ہنسے نے کسی کی لپک نہ سنی، اور پھر بچائے نہیں کیا۔ ان بیویوں سے دو بچے (ایک لڑکا اور ایک لڑکی) تھے۔ انہیں پالا پوسا اور پروردان چڑھایا۔ لڑکا شاہ دودرا احمد اپنے بیوی بچوں کے ساتھ آج کل کراچی میں ہے، اور لڑکی (دادھیالی نام، غوثیہ) ناٹھیالی، ٹرنا طہ) اپنے گھر بار والی رُفوعی میں۔ اس کی شادی اپنے خاندان ہی میں ایک جوان صالح چودھری ادیس احمد سے کر دی تھی۔

صوت ہمیشہ ٹھیک رہی۔ ہاں کبھی کبھی تنفس کی شکایت کرتے تھے۔ ۱۹۷۲ء میں جب دارالمصنفین کا اجلاس بمبئی میں ہوا ہے، تو اچانک وہاں پہلی مرتبہ دل کی شکایت محسوس کی۔ لیکن اس پر کوئی تشویش نہیں ہوئی۔ آخری وقت بہت ہی دیر پاؤ آیا۔ جمعہ کے دن ۱۳ دسمبر ۱۹۷۷ء کو حسبِ عادت تمام مولات سے فارغ ہوئے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد آٹھ لگ گئی۔ جاگے تو عمر کی نمائندگی سے دھوکا پانی طلب کیا۔ کرسی سے اٹھنے لگے، تو گر گئے! اور پھر نہیں اٹھے۔ ڈاکٹر صاحب فوراً بلوائے گئے۔ انہوں نے دیکھ کر اعلان کیا کہ شاہد سنا سب اپنے رفیقِ اعلیٰ کے حضور حاضر ہو چکے ہیں۔ (آنا لندہ و آنا المیہ راجعون۔

ان کی وصیت کے مطابق میت اگلے دن ان کے وطن راولپنڈی گئی اور وہاں
 جو دھری خلیل احمد کی مسجد کے احاطے میں آخری خواجگاہ نصیب ہوئی۔
 آسماں تربت پر تیری عنبر انشانی کسے۔

شیر محمد اختر گجراتی

میرے ہمراہی اور دوست اور ہم وطن تھے۔ یعنی وہ بھی گجرات (موجودہ پاکستان) کے رہنے والے تھے، اگرچہ ۱۹۰۷ء میں پیدا لاہور میں ہوئے جہاں ان کے والد میاں محمد یوسف غالباً اور رہیں تھے، اور سرنگارام مرحوم (ف: جولائی ۱۹۲۷ء) کے دوستوں میں تھے۔ شیر محمد نے دسویں درجہ تک کی تعلیم زمینداروہائی اسکول (موجودہ زمیندار کالج)، گجرات میں پائی۔ اس کے بعد انھوں نے پولیس ٹریننگ اسکول، پشاور میں داخلہ لے لیا، اور وہاں سے تربیت کی تکمیل کے بعد پولیس کے محکمے میں بھرتی ہو گئے۔

لیکن ان کا مذاق ادبی، بلکہ تعلیمی تھا، پولیس کی نوکری کب تک چلتی! تین چار سال تو گھر والوں کے مجبور کر کے پر کسی نہ کسی طرح کاٹے؛ بالآخر ۱۹۳۱ء میں استعفیٰ دے دیا، اور سال بھر بعد لاہور چلے آئے۔

وہ عقیدے کے لحاظ سے جماعت احمدیہ کی لاہوری شاخ سے متعلق تھے۔ چنانچہ لاہور آنے پر وہ اس انجمن کے دونوں پرچوں، ہفتہ وار ”پیغام صلح“ (اردو) اور ہفتہ وار ”لائٹ“ (انگریزی) میں کام کرتے رہے۔ یہاں سے نکل کر کچھ دن تک ماہنامہ ”تہذیب نسواں“ کے ادارہ تحریر سے بھی رسمی طور پر وابستہ رہے۔ اسی زمانے میں انھوں نے ایک سلسلہ مضامین بچوں کی نفسیات پر قلمبند کیا تھا، جو بہت مقبول ہوا تھا۔

انہوں نے نفسیات کا مطالعہ بطور خاص کیا تھا۔ لاہور میں انہوں نے ایک ادارہ قائم کیا تھا، جہاں وہ نفسیات کے موضوع پر طلبہ کو تعلیم دیتے تھے۔ اردو میں اس مضمون کی نصابی کتابیں ہی کتنی ہیں! چنانچہ یہ کسی پورا کرنے کو انہوں نے اسی زمانے میں چھوٹے چھوٹے رسالے لکھے جنہیں وہ نفسیات کے طور پر استعمال کرتے تھے۔

لاہور کے مسلسل قیام سے وہ وہاں کے علمی اور ادبی حلقوں میں اچھے خاصے متعارف ہو گئے، اسی لیے ان کے احباب کا حلقہ بھی وسیع ہو گیا۔

علم و شرف دونوں میں درک تو حاصل تھا ہی، اب وہ رسالوں میں مضمون بھی لکھنے لگے۔ ان دنوں مولانا احسن اللہ خان تاجور خجیب آبادی کا ماہنامہ ”شاہکار“ بڑے شغف سے پھلکتا تھا۔ آخر ایک دن اس کے دفتر گئے۔ مولانا تاجور جا بھرتے ہوئے ادیبوں کی حوصلہ افزائی کرنے اور انہیں آگے بڑھانے میں بڑی مشغولیت محسوس کرتے تھے۔ انہوں نے آخر کی صلاحیتوں کا اندازہ کر کے انہیں ”شاہکار“ کا نائب مدیر مقرر کر دیا۔ مولانا تاجور کا جب جنوری ۱۹۵۱ء میں انتقال ہو گیا، اور شاہکار بھی بند ہو گیا، تو اس کے بعد اختر پنجاب کے مشہور ماہنامے ”ہمایون“ کے ادارے سے منسلک ہو گئے۔ یہاں وہ ۱۹۴۸ء تک رہے۔

اس دوران میں بھی ان کا علمی و ادبی جوش و خروش جاری رہا۔ ۱۹۴۴ء میں انہوں نے اس موضوع پر اپنے دو ماہانہ رسالے شروع کیے (۱) ”نفسیات“ اور (۲) ”نفسیات جہانزے“ یہ دونوں پرچے مدتوں باقاعدگی سے چھپتے رہے۔ اب ان کی ادبی حیثیت مسلم ہو چکی تھی۔ ۱۹۴۸ء میں وہ ہفتہ وار ”قندیل“ (لاہور) کے مدیر مقرر ہو گئے۔ اور ۱۹۷۰ء تک اس رسالے کو مرتب کرتے رہے۔ اس میں وہ ہر صفحے ”میں دیکھتا چلا گیا“ کے عنوان سے ایک کالم ”تماشاخی“ سے علمی نام سے لکھتے تھے۔ یہ سب حلقوں میں بہت مقبول ہوا۔ اس میں لاہور

اور صوبے کی ہفتے بھر کی ادبی، سماجی، سیاسی سرگرمیوں پر لکے چکے انڈاز میں تبصرہ کرتے۔ ان کی زبان سلیس، سادہ اور بڑی جاندار تھی۔ مولوی عبدالحق مرحوم تک ان کی زبان کے مقترف اور تراجم تھے۔

وہ حلقہ ابابہ ذوق اور دانش زنگڈ کے بنیادی اراکین میں سے تھے، اور حلقے کے جلسوں میں خاص طور پر مستعدی سے شریک ہوتے تھے۔ اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ حلقے میں حاضری دیے والے اور بور کا کلام نظم و نثر انہیں بآسانی "تبدیل" میں اتناعت کے دل جاتا۔ یہ اس عہد کے بیشتر قابل ذکر ادیبوں کے مضامین اور منظومات تبدیل ہیں چھپتی رہیں اور پرچے کا معیار اپنے معاصرین کے مقابلے میں بہت بلند ہو گیا۔ وہ اپنے مستقل کام (میں دیکھنا چلا گیا) کے علاوہ بھی افسانے، ڈرامے اور مضامین لکھتے رہتے تھے۔ ان کی تقریریں، ریڈیو سے بھی نشر ہوتی رہتی تھیں۔

۱۹۶۱ء میں ان پر پہلی مرتبہ قایح کا شدید حملہ ہوا، اور وہ بہت دن تک نقل و حرکت سے محروم رہے۔ بارے، باقاعدہ علاج سے کچھ چلنے پھرنے کے قابل ہو گئے، لیکن اس سے کمزوری اتنی ہو گئی کہ پھر انہیں کامل صحت کا ایک دن بھی دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔ اکتوبر ۱۹۷۷ء کو اواخر میں ان پر پھر قایح گرا۔ اب کے علاج کے لیے یونائیٹڈ کرسچین اسپتال چلے گئے۔ دو مہینے بعد وہیں اسپتال میں ۳۰ دسمبر ۱۹۷۷ء کو علی الصبح رگڑے عالم جاو اتنی ہو گئے۔ جنازہ اسی دن اسٹا اور قبرستان میانی صاحبہاں سپرد خاک ہوئے۔ "وَنَالِلسَّعَادَةَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ"۔ یہ وہ کے علاوہ دو بیٹے اور چھ بیٹیاں اب سوگواروں میں چھوڑے۔

مرحوم اپنی سخن فنی اور بذلہ سنجی، سچر سچائی اور وضعداری کے لیے مشہور تھے جن تمام میں تبدیل کے میر تھے، کسی جگہ سے زیادہ تنخواہ پر ملازمت کی پیشکش ہوئی، لیکن انہوں نے ہمیشہ انکار کیا۔ پردیس سرحد سرود (جامعی) جنہوں نے

مولانا عبید اللہ سندھی پر خاما کام کیا ہے، اختر مرحوم کے ماموں ہیں۔ محمد سرور صاحب نے کسی زمانے میں حمید نظامی مرحوم کے ”نوائے وقت“ کے جواب میں اپنا روزنامہ ”آفاق“ جاری کیا تھا۔ انھوں نے معقول تنخواہ پر اختر کو بھی اس کے ادارہ تحریر میں شمولیت کی دعوت دی۔ محمد سرور صاحب نے خیال کیا کہ اختر میرا سہارا ہے اور تنخواہ بھی معقول، سبباً اسے قبول کرنے میں کیا عذر ہوگا! لیکن انھیں بھی مایوسی ہوئی۔ اختر نے اپنی وضع داری بنا ہی اور ”من بستم خائے قناعت“ پر اسے خلیش ”کہتے ہوئے قندیل“ میں جمے رہے۔

ایک اور بات! اختر کا تخلص نہیں تھا، وہ شعر کہتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی نے پوچھا؟ اختر صاحب! آپ شعر نہیں کہتے تو نام کے ساتھ یہ تخلص کیوں لگوا رکھا ہے؟ ”کہنے لگے؟“ اختر تخلص نہیں ہے، بلکہ سید اقیار علی تاج قسم کی چیز ہے، انھوں نے بھی تو کبھی شعر نہیں کہا۔ بات دراصل یہ ہے کہ شبیر محمد قسم کے نام کچھ نوجوان اور جنگجو حضرات ہی کو زیب دیتے ہیں۔ میں نے التباس سے بچنے کی خاطر اپنے نام کے ساتھ اختر کا اضافہ کر لیا؟

انھوں نے کوئی پچاس کے قریب کتابیں چھوڑی ہیں۔ ان میں نفسیاتی موضوعات ہیں، تراجم ہیں، افسانے ہیں، ڈرامے (اردو اور پنجابی) ہیں، تاریخ اسلام ہے۔ لیکن ادیب اور مصنف سے کبھی وہ بلند تر انسان تھے۔ با اصول، مرتجان مرغ، دوستوں کے ہمدرد اور کلمہ پرور۔ دعا ہے کہ خداوند تعالیٰ ان سے مغفود کریم کا سکوک کرے! آمین!

چغتائی، عبدالرحمن (خان بہادر)

مومن ہے جس نے جامع مسجد اور لال قلعہ یا تلج محل، اگرہ کا نام نہ سنا ہوگا! لیکن یہ کم فوگوں کو معلوم ہو چکا کہ ان عالیشان اور شہرہ آفاق عمارتوں کے نقشے لاہور کے دو فنکاروں کے تیار کیے تھے، ان کے نام تھے: احمد اور حامد۔ یہ دونوں سگے بھائی تھے۔ عبد شاہجہانی کے مورتخوں نے ان کے نام استاد العصر احمد اور نادر العصر حامد لکھے ہیں۔ ان کے نام سے مشہور موحیہ استاد احمد آج بھی ان کی یاد نازہ کرنے کو موجود ہے۔ فنی عمارت اس خاندان میں نسلًا بعد نسل قائم رہا۔ بہارا جا رنجیت سنگھ کے میر عمارت بابا صدرا الدین چغتہ اکی خاندان کے نام بیوا تھے۔ ان کے بیٹے میاں رحیم بخش تھے اور میاں رحیم بخش کے میاں کریم بخش چغتہ۔ یہ دونوں باپ بیٹے بھی میر عمارت اور معمار تھے۔

میاں کریم بخش کا ۱۹۱۳ء میں انتقال ہوا۔ ۶۰ سال سے نیا فطر پائی۔ میاں کریم بخش چغتہ کے عین بیٹے، عبدالرحمن، عبداللہ اور عبدالرحیم ہوتے۔ یہی عبدالرحمن، ہمارے مشہور مصور اور فنکار عبدالرحمن چغتائی ہیں، جن کا ۱۷ جنوری ۱۹۷۵ء کو لاہور میں انتقال ہوا۔ عبداللہ علمی حلقوں میں ڈاکٹر محمد عبد اللہ چغتائی کے نام سے معروف ہیں، اور ان کا نام سوانح اقبال میں متعدد مقام پر آتا ہے۔ انھوں نے سورہ بون یونیورسٹی (پیرس) سے تاج محل کے موضوع پر اپنے مقالے سے ڈاکٹریٹ کی سند لی تھی۔ عبدالرحیم سب سے

چھوٹے ہیں۔ انھوں سے ساری عمر بڑے سجاتی عبدالرحمن چغتائی کی معیت اور خدمت میں گزار دی۔

عبدالرحمن چغتائی لاہور میں ۲۱ ستمبر ۱۸۹۹ء کو پیدا ہوئے۔ ان کی اسم اللہ مسجد میں پڑھائی۔ یہاں انھوں نے قرآن ناظرہ ختم کیا۔ بعض سورہیں جو انھیں آخر تک حفظ تھیں، وہ اسی ابتدائی تعلیم کا نتیجہ تھا۔ مسجد کی یکمبتی تعلیم کے ساتھ ہی ان کے والد نے انھیں اپنے بہنوئی میاں میران بخش نقاش (بن بابا عمر الدین نقاش) سے نقاشی اور مصوری کے اسباق پڑھنے کی ہدایت کی تھی۔ میاں میران بخش نقاش اپنے فن کے ماہر اور اس حیثیت سے سرکاری حلقوں میں بھی معروف تھے۔ حکومت نے ان کی عظمت فن کے اعتراف میں انھیں مسجد فیروز خان (لاہور) میں ٹھہرے عطا کیے تھے۔ اس زمانے میں یہ ٹھہرے مصوروں، نقاشوں، خطاطوں کو حکومت کی طرف سے اعزاز و اکرام کے طور پر دیے جاتے تھے۔ بابا میران بخش نے بھر ۱۱ سال ۱۹۲۰ء میں وفات پائی۔ وہ لاہور کے قبرستان بی بی پارک وامن میں دفن ہوئے۔ عبدالرحمن چغتائی میواں کول جانے تک ان سے مستفیض ہوتے رہے تھے۔

مسجد سے فارغ ہو کر ان کا ریلوے ٹیکنیکل اسکول، لاہور میں داخلہ ہوا۔ چھ درجے کے بعد تعلیم کا یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ چندے پننگ بازی اور آداب گردی کرنے کے بعد انھوں نے سچر سی اسکول سے ۱۹۱۱ء میں پرائیویٹ طور پر ملل (اسٹوڈنٹ) درجے کا امتحان پاس کیا۔

فائدہ فی روایت کے پیش نظر فن اور آرٹ ان کے خون میں تھے۔ ملل اسکول امتحان کے بعد انھوں نے خود بخود میواں اسکول آف آرٹ، لاہور میں داخلہ لیا۔ اس زمانے میں یہاں ڈرافٹنگ، نقشاسازی (ڈرافٹ مین) ٹولہری (ڈریگزی) کے کام کی تعلیم کا خاصا انتظام تھا۔ عبدالرحمن چغتائی آخری درجے کے امتحان (۱۹۱۴ء) میں صوبہ ہبر میں اول آئے تھے۔

میں اسکول کے امتحان میں کامیابی کے بعد اولاً انھوں نے کرسچین ہائی اسکول گوجرانوالہ میں ڈرائنگ ماسٹر کی نوکری اختیار کر لی۔ لیکن یہاں ان کا دل نہیں لگا۔ گوجرانوالہ میں وہ صرف چند مہینے رہے، اور استعفیٰ داخل کر کے واپس لاہور چلے آئے۔ ان کی مادر علمی (بھیسکول) نے محسوس کیا کہ ان کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانا چاہیے، چنانچہ اسکول میں نوڈلیریتھوگرافی کا درجہ کھولا گیا جس کے انہماک چغتائی صاحب مقرر ہوئے۔ وہ اس عہدے پر ۱۹۲۲ء تک رہے اور پھر مستعفی ہو گئے اس کے بعد عمر سبیر کہیں ملازمت نہیں کی۔

یہ بیاں میران بخش نقاش کی تربیت ہی کا اثر تھا کہ انھوں نے صنوف ان مشابہ میں مصوری شروع کر دی۔ چنانچہ پنجاب فائن آرٹ سوسائٹی، لاہور کی نمائش منعقدہ ۱۹۱۹ء میں چغتائی کی آب رنگی تصاویر کا بھی سراغ ملتا ہے لیکن ابھی تک ان کی مصوری کی شہرت ان کے احباب ہی تک محدود تھی، اور عوام سے متعارف نہیں ہوئے تھے۔ ان کی شہرت کے عام کرنے میں پروفیسر ڈاکٹر محمد دین تاثیر (۱۶ نومبر ۱۹۵۸ء) اور ماہنامہ نیرنگ خیال کا بہت ہاتھ ہے۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ نیرنگ خیال کے شروع کرنے والے ہی تاثیر اور چغتائی تھے۔ اس کی داغ بیل تاثیر کے مکان ہی پر پڑی، اور انھیں نے حکیم یوسف حسن کو یہ پرچہ جاری کرنے کا مشورہ دیا، چونکہ ان کے پاس سرمایہ تھا، جسے وہ اس کے اخراجات کے لیے لگا سکتے تھے۔ ہاں، بعد کو دوسرے احباب ریناز منڈلانا لہریہ سے بھی مشورہ کیا گیا تھا اور سب نے دستِ ثناء و بڑھانے کا وعدہ کیا۔ نیرنگ خیال وسط ۱۹۲۳ء میں جاری ہوا اور اس کے پہلے ہی شمارے میں چغتائی کی بنائی ہوئی ایک تصویر شامل تھی۔ اس کے بعد بھی وہ باقاعدگی سے اپنی تخلیقات نیرنگ خیال میں شائع کرتے رہے۔ غرض کہ یہ حقیقت ہے کہ اگرچہ چغتائی پہا سے مصوری کر رہے تھے، لیکن وہ عوام سے نیرنگ خیال ہی کے ذریعے سے متعارف ہوئے تاثیر نے ان کے فن اور تکنیک کے بارے میں اور ان کی

خوبیوں اور خصوصیتوں کی وضاحت کے لیے متعدد مضامین لکھے یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہو گا کہ تاثیر نے محض چغتائی کے آرٹ پر لکھنے اور اس کی بائیکوئیں کو اجاگر کرنے کی خاطر یورپ کے بڑے بڑے مصوروں اور فنون لطیفہ کے ماہروں کی تخلیقات اور تصنیفات کا غائر مطالعہ کیا تھا، تاکہ وہ چغتائی کے فن پر کما حقہ لکھ سکیں اور دوسرے عالمی مصوروں کے ساتھ ان کا مقابلہ کر کے ان کے ماہرہ الامتیاز پہلو دکھا سکیں۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اگرچہ چغتائی نے اھول کی حد تک تو اپنے بزرگ میاں میران بخش سے ضرور استفادہ کیا، لیکن اس کے بعد اس میدان میں انھوں نے جو فتوحات حاصل کیں اور دنیائے تصویر و فن کے خزانے میں جو جوش بہا امانڈ کیا، وہ سراسر ان کا ذاتی کامنامہ اور ان کے اپنے زور بازو کا ثمرہ تھا۔ اس کے باوجود انھوں نے محسوس کیا کہ جب تک میں عالمی شاہکاروں کا قریبی اور غائر مطالعہ، اور معاصر مصوروں اور فنکاروں اور نقادوں سے بالمشافہہ تبادلہ خیال نہیں کرتا، میرے فن میں وسعت اور عالمگیریت پیدا نہیں ہو سکتی۔ اسی مقصد کے لیے انھوں نے ۱۹۳۱ء اور ۱۹۳۶ء میں دو مرتبہ یورپ کا سفر کیا۔ پہلے سفر میں ان کے چھوٹے بھائی محمد عبداللہ چغتائی بھی ان کے ساتھ گئے تھے۔ اسی زمانے میں علامہ اقبال بھی گول میز کانفرنس کے سلسلے میں لندن میں مقیم تھے۔ اقبال نے اپنے مشوروں سے مستفیض کیا اور مختلف اکابر سے ان کی ملاقاتیں بھی رہنمائی کی۔

ان سفروں میں انھوں نے یورپ کے تمام بڑے بڑے شہروں اور وہاں کے عجائب گھروں اور تصویر خانوں کی سیر کی اور ان کے مہتمموں سے طے نیز مختلف مقامات کے وہ حسین مناظر منظر قائم دیکھے، جو اکثر مصور اپنی تخلیق کے لیے پس منظر کے طور پر استعمال کرتے رہے ہیں۔ انھیں سفروں میں وہ یورپ کے مشاہیر علم و فن اور متعدد مصوروں سے بھی ملے۔ اعادہ کیا جاسکتا ہے کہ

ان سفروں اور ملاقاتوں کا ان کے فن کی بالیدگی اور پختگی، اور شخصیت کی تشکیل اور بچاؤ میں کتنا ہاتھ رہا ہوگا۔

یورپ سے واپسی کے بعد انھوں نے اپنے فن میں تانے کی پلیٹ پر لوہے کے قلم سے تصویر بنانے (یعنی ریتنگ: Etching) کا اضافہ کیا۔ اب انگ ان کی توجہ زیادہ تر خطوط پر مبذول رہی تھی۔ یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ محض خطوط کے پیچ و خم سے جیتی جاگتی تصویر بنا دینے میں ان کا کوئی حریف نہیں اور اس کاراں ان کی ڈرائنگ کے فن پر غیر معمولی قدرت میں پوشیدہ ہے۔ یہی کام انھوں نے ریتنگ سے لیا۔ یاد رہے کہ ان سے قبل کسی ہندوستانی مصور نے فن کی اس شاخ کا ایسا سمجھ پور نمونہ پیش نہیں کیا تھا! اس کا سہرا صیح عنوان میں چغتائی کے سر ہے۔

اب ان کا سجا طور پر ہندوستان کے صفا اول کے مصوروں اور فنکاروں میں شمار ہونے لگا۔ ۱۹۳۴ء میں حکومت وقت نے ان کی خدمات کا اعتراف ”خان بہادر“ کے خطاب سے کیا۔ یہاں غائباً ایک بات کا ذکر یہیں نہیں ہوگا۔ انگریزی جہد میں یہ خطاب بالکل سیاسی نوعیت کے تھے۔ اور بالعموم حکومت کے چیلے چانٹوں اور جی حضوریوں تک محدود (خان صاحب اللہ! ایک آدمی مرتبہ غیر سیاسی اور علمی وادبی افراد کے حصے میں بھی آچکا ہے) لیکن چغتائی کو یہ خطاب بعض اپنی فنی اور ادبی خدمات کی وجہ سے ملا۔ اس سے پہلے جن چند غیر سیاسی اشخاص کو اس طرح کا خطاب ملا تھا، ان میں علامہ اقبال اور رابندر ناتھ ٹیگو کے نام نمایاں ہیں۔

پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد ۱۹۴۰ء میں وہاں کی حکومت نے انھیں ”ہلال امتیاز“ کے اعزاز سے نوازا۔ ۱۹۴۴ء میں مغربی جرمنی کے سابق صدر ڈاکٹر ہرک ہیکے پاکستان کے دورے پر آئے تھے۔ انھوں نے چغتائی سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ لہذا اگلے دن جب وہ صوف علامہ اقبال کا حرارہ دیکھنے گئے،

توان کی خواہش کے مطابق وہاں ان سے چغتائی کا تعارف کرایا گیا۔ ڈاکٹر بکے، چغتائی کے فن کے بڑے مداح تھے چنانچہ انہوں نے خاص طور پر اپنے وزیر والٹر شیل کو (جو بعد کو صدر مغربی جرمنی بنے) چغتائی کے مسکن (راوی روڈ) پر ان کی خدمت میں سونے کا تمغہ پیش کرنے کو بھیجا، جو گویا مغربی جرمنی کی طرف سے ان کی فنی میدان میں خدمات کا اعتراف تھا۔

ان کی چھ کتابیں فن اور تصویر کے موضوع پر شائع ہوئی ہیں۔ سب سے پہلے ۱۹۲۸ میں مرتب چغتائی "منقہ شہود پر آئی" جس میں غالب کے کلام کو تصویروں کے پیکر میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ کتاب ان کی شہرت کا سنگ بنیاد ثابت ہوئی۔ اس کا متعلقہ علامہ اقبال نے لکھا تھا۔ اس میں ۲۴ رنگین اور دس سادہ تصویریں ہیں۔ اس کا ایک خاص ایڈیشن شائع ہوا تھا۔ اس کی قیمت ۱۲۵ روپے فی نسخہ تھی اور ایک عام جوسترو روپے میں بچا تھا۔ دونوں میں کاغذ کے تفاوت کے علاوہ اور کوئی فرق نہیں تھا۔ اس سلسلے میں لطیف یہ ہے کہ اعلان کیا گیا تھا کہ اعلیٰ ایڈیشن جرمنی میں چھپا ہے، حال آں کر یہ لاہور ہی میں چغتائی صاحب کے مکان واقعہ کوچہ چاکر سواراں، لاہور میں خاص مشین سے طبع ہوا تھا۔ اس کی دیدہ زیب کتابت اور اعلیٰ معیار طبعیت اور تجلید وغیرہ سے سب لوگ دھوکا کھا گئے۔ اس کام میں ان کے سب سے پیوٹے سبھائی عبدالرحیم چغتائی ان کے دست راست اور ہر طرح مدد و معاون رہے۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ عبدالرحیم صاحب نے اپنی پوری زندگی بڑے سبھائی کی خدمت کے لیے وقف کر دی۔ عبدالرحیم چغتائی کو اپنے تخلیقی کام کے سوا اسے اور کسی کام سے کام نہیں تھا۔ اس کے بعد تصاویر پر چرچے لگوانا، انہیں نمائشوں میں بھیجنا اور واپس منگوانا ہوتا ہوں کا شائع کرنا، ان کی تقسیم اور نکاسی کی نگرانی۔ غرض سب کام عبدالرحیم صاحب کی نگرانی میں ہوتے تھے۔ یہاں تک کہ گھر بار کے سب اخراجات بھی انہیں کے ہاتھوں

سریانجام ہوتے تھے۔

ترتیب چغتائی کے سلسلے میں ایک اور بات بھی قابل ذکر ہے جب یہ کتاب شائع ہوئی، تو اس کی تمام اصلی تصاویر سر اکر حیدری نے نظام پبلش ویدز آباد ہاؤس (نئی دہلی) میں لگانے کے لیے لے لی تھیں لیکن جب شہزادی وردانہ (نظام عثمان علی خان مرحوم کی بڑی بیوہ اور نواب اعظم جاہ ولی عہد کی بیگم) نے انھیں دیکھا، تو فرمایا کہ تصاویر نئی دہلی نہ بھیجی جائیں، میں اسٹیشن پے محل میں لگا دوں گی۔ خدا معلوم اب وہ کہاں ہیں!

نقش چغتائی، ان کا دوسرا کام تھا۔ یہ کتاب ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی۔ اس میں غالب کے کچھ اور اشعار کو مصور کیا گیا ہے۔ یہ بھی بڑے اہتمام سے کھلی، انجزم کی پمکدار جلد اور بڑھیا کاغذ، ہر صفحے کی جدول کی تزئین اور وہ رنگی چھپائی۔ اس میں کل ۱۹ تصویریں ہیں جن میں سے صرف ایک رنگینا ہے، بقیہ سب ساواہ، سپید و سیاہ ہیں۔

اسی نقش چغتائی کا دوسرا ایڈیشن، (نقش ثانی) غالباً ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا۔ (تاریخ درج نہیں) یہ پہلے ایڈیشن سے بہت مختلف ہے تصویروں میں بھی تفاوت ہے اور ان کی تعداد میں کمی۔ اس میں چھ رنگین تصویروں ہیں اور ساواہ، سپید و سیاہ۔ اسی دوسرے ایڈیشن کا جو بیوچر برتیسری مرتبہ ۱۹۹۵ء میں چھپا۔

اس کے بعد ان کی یہ کتابیں شائع ہوئیں:

- ۱۔ تصاویر چغتائی: ۱۹۳۶ء
- ۲۔ ہندی تصاویر چغتائی: ۱۹۵۲ء (اس کا ایک مختصر ایڈیشن بہت پہلے دہلی کی ایک فرم نے شائع کیا تھا)۔
- ۳۔ عمل چغتائی: ۱۹۶۸ء
- ۴۔ تیمور کا گھرانہ: ۱۹۷۲ء

عمل چنتائی میں کلام اقبال کو مصور کیا ہے جس طرح پہلی دو کتابیں مصور کلام غالب ہے۔ کلام اقبال کو مصور کرنے کی خواہش خود علامہ اقبال نے ”مربع چنتائی“ کی اشاعت کے بعد ظاہر کی تھی۔ چنتائی نے ہم ۱۹۶۱ء میں اس پر کام شروع کیا تھا، اس کی تکمیل کہیں ۲۵ برس بعد ہوتی۔ یہ بڑے سائزرڈ ۱۱×۱۴ کے ۳۵۰ صفحات کی کتاب ہے؛ اس میں ۴۴ چار رنگی تصاویر ہیں اور ۲۴ رنگی؛ شروع میں حبش مرشد الرحمن کا مریاچہ ہے۔ کتاب بہت اہتمام سے شائع ہوتی ہے اور ہر طرح سے اقبال اور چنتائی دونوں کے شایانِ شان ہے۔ مرحوم کہتے تھے کہ اس کی تیاری اور طباعت پر میرا تین لاکھ روپیہ صرف ہوا ہے۔ ابتداء میں اس کا ۲۵ جلدوں کا ایک خاص ایڈیشن بھی شائع ہوا تھا جس کی قیمت پندرہ سو روپیہ فی نسخہ تھی۔ اس کا اجراء سابق صدر پاکستان فیضان مارشل محمد ایوب خان کے ہاتھوں لاہور آرٹ کونسل میں ہوا تھا اور حکومت پاکستان نے اس خدمت کے احترام میں چنتائی مرحوم کو دو لاکھ روپے کا انعام عطا کیا تھا۔

مندرجہ ذیل کتابیں غیر مطبوعہ رہ گئیں :

- ۱۔ **عمر خیام** (مصور) : اس پر انھوں نے ۲۰-۳۰ برس کام کیا تھا لیکن مکمل ہو چکی تھی۔ اس میں کوئی ۴۰-۷۰ تصویریں ہیں۔ تمام تصویروں کی نوعیت اور بلاک وغیرہ بن چکے تھے اور وہ اسے شائع کرنے کا انتظام کر رہے تھے کہ موت کا بلاوا آگیا۔ خدا معلوم، اب اس کی اشاعت کا کیا انتظام ہوگا! چنتائی مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ یہ کتاب اس قرض کی ادائیگی ہے جو مغرباً مرخیام کی متعدد منزلیں کر کے اور اس کے متعدد مصور ایڈیشن شائع کر کے ہم اہل مشرق سے وصول کرنے کا حقدار ہے۔

- ۲۔ **چنتائی آرٹ** : یہ کتاب تقسیم ملک سے قبل زیرِ طباعت تھی کہ منسلکات کے باعث کام درمیان میں رہ گیا۔ اس کے بعد وہ عمل چنتائی کی تکمیل میں

لگ گئے اور اس پر توجہ نہ دے سکے۔ بہر حال اس کا پورا سامان موجود ہے۔
 ۳۔ کارچنتائی : یہ دراصل غالب کے سلسلے کی تیسری کتاب ہے یعنی ”ترتیب
 چنتائی“ اور ”نقش چنتائی“ کے بعد انھوں نے غالب کے جن مزید اشعار
 کو صورت کیا تھا۔ یہ ان کا مجموعہ ہے۔ اس میں ۳۰-۴۰ نئی تصویریں ہیں۔
 یہ کتاب بھی تقسیم ملک کے وقت زیرِ طبع تھی۔ اس کی ایک خصوصیت
 یہ ہے کہ ہر ایک تصویر کے ساتھ اردو میں کچھ اشارے لکھے ہیں ”عمل
 چنتائی“ میں بھی ہر ایک تصویر کے ساتھ تقریباً دو دو صفحے کے اشارات
 ہیں یہ سب محرم کے اپنے لکھے ہوئے ہیں۔

۴۔ اڈرن آرٹ میں چنتائی کا حصہ (انگریزی)

۵۔ چنتائی اور اس کے نقاد ()

۶۔ نمبر لذت ()

۷۔ چنتائی کی عریاں تصویریں (NUDES) ()

وہ اردو میں انسانہ بھی لکھتے تھے، اور نئی موضوعات پر مضامین بھی لکھتے تھے۔ ۱۹۴۷ء
 میں ان کے افسانوں کے دو مجموعے ”کاہل“ اور ”لگان“ شائع ہوئے تھے۔ اپنی
 وفات سے پہلے ایک اور مجموعہ ”ستادون“ کے عنوان سے مرتب کیا تھا۔ اس میں تین
 طویل افسانے ہیں : (۱) ستادون (۲) پانچن (۳) لندن ہے ایک خط۔ ستادون
 میں دوسری جنگ عظیم کے اس زمانے کی داستان ہے جب حسن اتفاق سے اردو
 کے بعض مشہور ادیب (تاثر، مجید ملک، پطرس بخاری وغیرہ) دلی میں جمع ہو گئے
 تھے۔ پانچن کشمیر سے متعلق ہے۔ ۱۹۲۹ء کے موسم گرما میں وہ کشمیر گئے تھے۔ اس
 افسانے میں اسی زمانے کے تاثرات ظہور کیے ہیں۔ تیسرا افسانہ ظاہر ہے کہ سفر
 لندن کی یادگار ہے۔ سنا ہے کہ ان کے غیر مطبوعہ افسانوں کی بھی خاصی بڑی تعداد
 موجود ہے۔

انھوں نے اپنے حقوق سے مختلف ممالک کے مشہور مصوروں کی تخلیقات کا اچھا

خاصہ ذخیرہ جمع کیا تھا۔ آرٹ سے متعلق مطبوعہ کتابیں بھی بہت تھیں۔ غرضی کہ مقام ہے کہ ان کی وفات کے بعد حکومت پاکستان کی سرپرستی میں چغتائی مجاہد گھر قائم کر دیا گیا ہے، جس میں ان کی سب چیزیں محفوظ ہو گئی ہیں۔ وہ خود بھی یہی جانتے تھے؛ اس طرح ان کی وصیت بھی پوری ہو گئی۔

وہ شخصی زندگی میں بہت سادہ تھے۔ دن رات اپنے فن کی دھن میں رہتے مگر سے بھی کم بھلتے تھے۔ کسی قسم کی ملت نہیں تھی؛ نہ سگریٹ پیتے تھے، نہ شراب، حال اُن کہ ان کے بیشتر دوست اور ملنے والے سگریٹ پیتے تھے اور ان میں سے کئی فنکار قسم کے حضرات تو شراب کے بھی رہا تھے۔ چغتائی صاحب تاش کے پتوں تک کو نہیں پہچانتے تھے۔ مصوری کے علاوہ ان کا دوسرا سب سے بڑا شوق پتنگ بازی تھا۔ اپنے پتنگ خود ہی بناتے تھے۔ ان کی ساخت اور شکل صورت میں طرح طرح کی اختراعات کی تھیں جو ان میں کھیل کو دکا طوق بھی ہا، بلکہ شروع میں تو اسی کت کے مارے چندے تعلیم کا سلسلہ ہی ٹوٹ گیا تھا۔ کرکٹ اہندوقی کا نشانہ بھلی کاشکار ان کے دل پسند مشغلے تھے۔ کرکٹ میں گیند اتنی تیزی اور قوت سے پھینکتے تھے کہ وکٹ ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی تھی تیراک بھی اچھے تھے۔

بزرگ جمعہ ۱۷ جنوری ۱۹۷۵ء کو اپنے خالق کے حضور حاضر ہو گئے۔ جنازہ اگلے دن اسٹا اور اسٹین امانتاً اپنے بزرگوں کے نزدیک لاہور کے مشہور قبرستان بیانی صاحب میں سپرد خاک کیا گیا۔ ان کے اعزاء چاہتے ہیں کہ انہیں ایک خاص مقبرے میں دفن کیا جائے۔ اسی لیے جب تک اس کے انتظامات مکمل نہ ہو جائیں، فی الحال انہیں میانی صاحب میں امانتاً دیا گیا ہے۔ بلکہ خود ان کی خواہش تو یہ تھی کہ ”چغتائی مجاہد گھر“ ہی میں اُن کا مدفن بھی بنے۔ اتنا ولندہ کو اتنا پسند را جیوں۔

انھوں نے اپنی زندگی میں دو نکاح کیے پہلی بیوی (وزیر النساء بیگم) اپنے خاندان ہی سے تھیں۔ ان کے والد کا نام میاں محمد بخش چغتائی تھا۔ اس بیوی سے کوئی

اولاد نہیں ہوتی ان کا ۲۳ مارچ ۱۹۶۶ء کو انتقال ہوا۔ دوسرا نکاح انہوں نے ۱۲ دسمبر ۱۹۶۴ء کو کیا تھا یہ ریگم (کشتور بائو) اور سر کے ایک کشمیری خاندان سے ہیں۔ ان کے بطن سے دو بچے ہوئے۔ بڑی بیٹی (مسرت) نے فلاسفی میں ایم اے کیا اور پنجاب بھر میں اول رہیں۔ وہ شادی شدہ اور اپنے گھر بار والی ہیں۔ ان سے چھوٹا ایک بیٹا عارف الرحمن چغتائی (ولادت: ۲۰ اگست ۱۹۶۹ء) ہے عارف میاں نے فرنس ایڈمنسٹریشن میں ایم اے تک تعلیم پائی ہے۔ وہ انگریزی میں شاعری بھی کرتے ہیں اور ان کے دو مختصر مجموعے شائع کر چکے ہیں۔

دیوان سنگھ مفتون، سردار

پنجاب (پاکستان) کے ضلع گوجرانوالہ میں ایک خاصا بڑا قصبہ حافظ آباد ہے۔ یہ تحصیل کا صدر مقام بھی ہے۔ تقسیم ملک (۱۹۴۷ء) تک بکٹری قوم کی کھیت براہروی کاں بہاں کے عائد میں شمار ہوتا تھا۔ اسی براہروی کے ایک کٹھ گھرانے کے ایک فرد ڈاکٹر ندھان سنگھ تھے۔ وہ سرکاری ملازمت میں تھے اور ڈاکٹر کی حیثیت سے پنجاب کے مختلف مقامات، (میاں والی، جہلم وغیرہ) میں تعینات رہے تھے۔ جب وہ جہلم کے سرکاری اسپتال کے انچارج تھے، تو یہاں ۳۱ اگست ۱۸۹۰ء کو ان کے گھر دو مسلار کا (اچھو ستھابچہ) پیدا ہوا۔ اس سے پہلے ان کی اولاد میں دو لڑکیاں اور ایک لڑکا کرتار سنگھ موجود تھے۔ اس نومولود کا نام انھوں نے دیوان سنگھ رکھا۔ یہی سچہ آٹھے چل کر سردار دیوان سنگھ مفتون، ایڈیٹر سیاست ہوا، اور اس نے تاریخ صحافت اُردو میں لافانی مقام حاصل کیا۔

دیوان سنگھ مفتون صرف ۳۴ دن کے تھے کہ ان کے والد ڈاکٹر ندھان سنگھ کا جہلم ہی میں انتقال ہو گیا۔ گھر میں کسی چیز کی کمی نہیں تھی، خدا کا دیا سب کچھ تھا۔ ڈاکٹر ندھان سنگھ نے اپنی طویل ملازمت کے دوران میں بہت کچھ کمایا اور پس انداز کیا تھا۔ اس کے علاوہ غیر منقولہ جاواں بھی کم نہیں تھی۔ اگر حالات معمول کے ہوا تو رہتے تو ان کے پساندگان کو کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوتا چاہیے تھی۔ لیکن ہندو سماج میں (اور وہ بھی آج سے ایک صدی قبل کے سماج میں) بچہ کی حالت بہت

نہ تھی۔ رشتے داماد و عزیز و قریب اس غریب کے اور اس کے تیم بے سہارا بچوں کے سر پر ہاتھ رکھنا اور ان کی حمایت کرنا تو درکنار اس تباہی میں رہنے کو جو کچھ ان کے پاس ہے، اسے بھی ہتیا لیں۔ ڈاکٹر ندھان سنگھ کی وفات کے وقت بڑی لڑکی ۱۸ برس کی تھیں، کرتا سنگھ دس برس کے تھے۔ اور ان سے چھوٹی (دوسری) لڑکی پانچ برس کی تھی۔ اور دیوان سنگھ تو جیسا کہ ابھی ذکر ہوا، صرف ۴ دن ہی کے تھے۔ ایسے میں ظاہر ہے کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کی بیوہ بالکل بے بار و مدار نہ گئی تھیں۔ اراٹنی اور مکانات پر مرحوم کے ایک بھائی نے قبضہ کر لیا اور ان بچوں کے جوان ہونے پر بھی یہ جاداد واپس دینے سے انکار کر دیا۔ گھر میں جو لذت تھی، وہ آہستہ آہستہ بچوں کی پرورش اور دولٹکیوں اور بڑے بیٹے کی خادہ کے مصارف میں ختم ہو گیا۔ جب نقد اور زیورات ٹھکانے لگ گئے، تو انہیں مالیت تک فروخت کرنے کا نوبت آگئی۔ قصہ کوتاہ، جب دیوان سنگھ کی دس بارہ برس کی عمر ہوئی ہے تو افلاس اور ادب بارے گھر میں ڈیرا ڈال رکھا تھا۔

ایسے حالات میں بالعموم سب سے چھوٹا بچہ سب سے زیادہ ٹھٹھے میں رہتا ہے، اس کی تعلیم و تربیت نہیں ہو سکتی۔ یہاں بھی یہی ہوا۔ دیوان سنگھ ششم پشتیم پانچویں تک تو بڑھ سکے، اس کے بعد ان کی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ گھر میں روزمرہ کے اخراجات تک پور کرنے کے لالے پڑے ہوئے تھے، ان کی فیس اور کتابوں وغیرہ کے لیے کہاں سے آتا! چنانچہ یہ خالصہ باقی اسکول، گورنمنٹ ہاؤس سے جہاں انہوں نے داخلہ لیا تھا، تین چار دن بعد واپس آ گئے۔

حالات سے مجبور ہو کر دیوان سنگھ اب وہیں حافظ آباد میں پانچ روپے ماہانہ پر ایک کپڑے کی دکان پر نوکر ہو گئے۔ یہ ملازمت دو تین برس رہی۔ اس کے بعد انہوں نے کوشش کر کے فیروز پور کے سول اسپتال میں کمپاؤنڈر کی نوکری حاصل کر لی۔ پھر وہ پلے مشاہرہ ملنے لگا۔ کچھ مدت بعد اسی حیثیت سے منڈی بوہر (ضلع فیروز پور) کے اسپتال میں نبادلہ ہو گیا، لیکن یہاں وہ زیادہ دن

نہیں رہے؛ فیروز پور واپس چلے آئے۔ فیروز پور میں شکل سے چھ بیسے غمزدہ ہونے کے پھر تبادلہ ہوا۔ اور اب کے وہ موگا (ضلع فیروز پور) پہنچ گئے۔ موگا کی یہ خصوصیت ہے اور اس شہر کے لیے باعثِ فخر بھی کہ آنکھوں کے مشہور معالج ماہر بہادر ڈاکٹر منتر اوس (ف: ۱۶ مارچ ۱۹۷۲ء) یہاں رہتے تھے۔ وہ بھی محل میں حافظ آباد ہی کے رہنے والے تھے، لیکن موگا میں بس گئے تھے۔ یہاں انھوں نے ایک اسپتالی قائم کیا تھا جس میں موتیابند کے علاج کے غلاشی مرضی اہم رہتے تھے۔ ڈاکٹر منتر اوس کی دیوان سنگھ کے خاندان سے دودنمز ویک کی کچھ عزیز داری بھی تھی۔ انھوں نے ڈاکٹر منتر اوس سے درخواست کی کہ مجھے اپنے اسپتال میں کام سیکھنے کا موقع دیجیے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے ان کا شوق دیکھتے ہوئے خوشی سے اجازت دے دی۔

وہ اس اسپتال میں کیا کنڈر کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ شروع میں نور علی مشاہرہ تھا؛ بعد کو ترقی ہوتی، تو بارہ ملنے لگے۔ ساتھ ہی موتیابند کا آپریشن کرنے کی تعلیم پاتے اور اس کی مشق بھی کرتے تھے۔ یہاں وہ تین برس رہے۔ جب ہاتھ جم گیا اور خود اعتمادی پیدا ہو گئی، تو انھوں نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور مانسہرہ (ریاست پٹیالہ) میں آزادانہ بنی مہی پریکٹس شروع کر دی۔ خدا نے ان کی محنت اور خلوص میں برکت دی، کام چل نکلا۔ یہاں انھوں نے اپنا ایک چھوٹا موٹا اسپتال بھی قائم کر لیا، جہاں وہ موتیابند کے آپریشن کرتے تھے، اور باہر کے مریضوں کو شہر آتے تھے۔ غرض اب زندگی کامیاب کہی جاسکتی تھی۔ شہرت بھی حاصل تھی اور زمین چار سو روپے جیسے کی آمدنی بھی۔

یہیں مانسہرہ میں وہ واقعہ پیش آیا، جس نے انھیں "ڈاکٹر دیوان سنگھ" کی جگہ "دیوان سنگھ مفتون" ایڈیٹر ہفتہ وار ریاست پٹیالہ کی راہ پر ڈال دیا۔

فیروز پور اسپتال میں تھے، جب انھیں اردو رسالہ پڑھنے کا شوق پیدا ہوا۔ اس زمانے میں وہ ماہنامہ "زمانہ" (کاپنور) کے خربدار بن گئے۔ "عزن" (لاہور) ان

کے لئے والے ایک صاحب کے پاس آنا تھا، یہ اس سے مسئلہ نے کر پڑھنے لگے۔ یہ سلسلہ شوق اہوہر اور دو گھنٹوں میں ختم ہو گیا، مگر اس میں خرقہ ہوتی گئی۔ اب اور ماہانہ سے بھی آئے گئے۔ بلکہ یہ روزنامہ اخبار عام دلاہور کے بھی باقاعدہ خریدار بن گئے۔ جہاں گئے، وہاں کے بعض علم دوست اصحاب سے بھی روابط پیدا ہو جاتے۔ ان سے نہ صرف پڑھے کو رسائل و جرائد ملنے، بلکہ ان کی صحبت میں دل و دماغ کی صلاحیتوں پر چلا بھی ہوتی چلی گئی یہ صورت حال تھی، جب وہ ماہانہ میں بلا شرکت غیرے ایک اسپتال اور تین چار سو روپے ماہانہ آمدنی کے مالک تھے۔

ایک دن انھوں نے ایک مضمون لکھا اور اسے شیر سنگھ فردپوری کے فرنی نام سے لاہور کے ہفتہ وار خالصہ اخبار کو بھیج دیا۔ مضمون چھپ گیا۔ اسی نام سے دو تین اور مضمون بھی اسے پرچے میں شائع ہوئے۔ تھوڑے دن بعد اخبار کے منبر سجائی مول سنگھ کا خط آیا کہ کیا آپ متعلق طور پر خالصہ اخبار کی ایڈیٹری کی ذمہ داری لے کر بنیادیں؟ اور اگر جواب اثبات ہو تو، کیا تنخواہ قبول کریں گے؟ انھوں نے جواب دیا کہ میں یہاں ڈاکٹری کرتا ہوں اور اس سے تین چار سو ماہانہ پیدا کر لیتا ہوں۔ میری تعلیم معمولی ہے، لیکن مطالعہ کافی ہے، اور مجھے لکھنے کا شوق بھی ہے۔ سجائی مول سنگھ نے اس پر لکھا کہ ہم تو ایڈیٹر کو ۶۰ روپے سے زیادہ مشاہرہ نہیں دے سکتے! آپ کی موجودہ آمدنی کے پیش نظر آپ کو خالصہ اخبار کی ایڈیٹری پیش کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

بظاہر معاملہ یہیں پر ختم ہو جانا چاہیے تھا کہ ۶۰ اور ۳۰-۴۰ میں جو بڑی فرق ہے، اسے کیسے نظر انداز کیا جاسکتا ہے! لیکن دیوان سنگھ کی ہوجان پسند طبیعت کو چین کہاں! انھوں نے ایک بزرگ ہریانہ سے مشورہ کیا کہ صورت حال یہ ہے، مجھے کیا کرنا چاہیے؟ ان صاحب نے لکھا کہ اس میں شک نہیں کہ تمہاری

قلم میں غیر معمولی زور ہے اور کامیاب صحافی بننے کی صلاحیت بھی، تجربہ کر لینے میں کیا معائنہ ہے! اس رتبے نے دیوانہ راہوسے پس است کا کام کیا۔ انھوں نے بھائی مول سنگھ کو لکھا کہ میں ۱۴ روپے ماہانہ ہی پر خالصہ اخبار کی ادارت قبول کرتا ہوں۔ اور مالنسہ میں اپنا جہا جایا، چلتا کاروبار چھوڑ کر لاہور پہنچ گئے۔

وہ اس اخبار میں مشکل سے چار مہینے رہے جو ننگے۔ بیشک ان کے زوردار طریقے سے ہرچہ بہت مقبول ہو گیا، لیکن ان کی تحریریں حکومت کی نظر میں خلاف قانون ٹھہریں، اور پرچے کے مالک اور طابع اور ناشر پر متعدد مقدمے قائم ہو گئے۔ ایک مہینہ (شیر پنجاب) کے ایڈیٹر سردار امر سنگھ (ف: جولائی ۱۹۴۸ء) نے بھی ازالہ حیثیت عرفی اور ہتک عزت کا مقدمہ دائر کر دیا۔ ظاہر ہے کہ گونا گونا اخبار اتھ "لائق" مدیر کا خرچ برداشت کر سکتا ہے! ہوتے تم دوست جس کے، دشمن اس کا آسماں کیوں ہوا! قدرتنا دیوان سنگھ ملازمت سے برخاست کر دیے گئے۔

اب وہ بیکار تھے، لیکن مایوس نہیں ہوئے۔ چندے ادھر ادھر کچھ اخباروں میں کام کیا، تاہم حالات نسلی بخش نہیں تھے۔ بہر حال انھوں نے محسوس کر لیا کہ اب صحافت ترک کر کے کوئی اور پیشہ اختیار کرنا ممکن نہیں۔ اور صحافت میں ان کی تعلیم و تربیت بمنزلہ تصفیر تھی۔ فیصلہ کیا کہ اگر صحافت ہی کو بقیہ عمر کے لیے ذریعہ معاش بنانا ہے، تو لازم ہے کہ اسے کسی کامل استاد سے سیکھا جائے۔ مشہور صحافی رام راجپال سنگھ شیدا (ایڈیٹر سندھوستان) ان دنوں لاہور میں تھے۔ اور دیوان سنگھ مفتون کے ان سے مراسم تھے۔ انھوں نے شیدا صاحب سے پوچھا کہ اردو صحافت میں سب سے لائق اور تجربہ کار کون صاحب ہیں؟ شیدا نے سید بشارت علی جالب دہلوی (ف: جولائی ۱۹۳۰ء) کا نام دیا، جو اس زمانے میں روزنامہ ہمد، لکھنؤ کے مدیر تھے۔ اس پر دیوان سنگھ نے جالب صاحب کو لکھا کہ میں آپ سے صحافت سیکھنا چاہتا ہوں، اگر آپ اجازت

وہیں، اور میرے لکھنؤ میں بسر اوقات کے لیے کچھ مقرر فرما دیں، تو میں حاضر خدمت ہو جاؤں۔ جالب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ باددہائی کرائی، تو اب کے سبھی صدائے برخاست۔ دیوان سنگھ سہلا یوں کہاں ٹٹلنے والی اسامی تھے! انھوں نے ریل کا ٹکٹ خریدا اور لکھنؤ پہنچ گئے۔ ساتھ کا منقر سالان ایک گورو دارے میں رکھا اور ہمد کے دفتر جا دھکے۔ جالب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے فرمایا کہ چونکہ ہمارے دفتر میں کوئی جگہ خالی نہیں تھی، اس لیے کوئی جواب نہیں دے سکا۔ دیوان سنگھ نے کہا کہ اگر صرف ۲۰ روپے ماہانہ کا انتظام ہو جائے، تو میں یہاں رہ کر آپ سے کچھ حاصل کر لوں۔ جالب نے پھر نفی میں جواب دیا اور کہا کہ کوئی خالی جگہ ہے ہی نہیں، تنخواہ کا کیا سوال ہے! اب دیوان سنگھ نے کہا کہ میں چیر اسی کے طور پر بھی رہنے کو تیار ہوں، کیونکہ میرا مقصد تو اب کے دفتر میں، آپ کے نزدیک رہنا ہے، تاکہ میں آپ سے کچھ حاصل کر سکوں۔ اس پر بھی جالب نے وہی جواب دیا کہ چیر اسی کی بھی جگہ خالی نہیں ہے۔ اس پر اسی مرد قلندرنے کہا کہ اچھا فرمائیے کہ کیا آپ کو میرے بغیر کچھ تنخواہ لینے، مفت کام کرنے پر بھی کچھ اعتراض ہوگا؟ جالب نے کہا کہ سہلا کسی کے مفت کام کرنے پر بھی اعتراض ہو سکتا ہے! اس پر انھوں نے شہر میں ایک کیمسٹ کی دکان پر پندرہ روپے ماہانہ کی نوکری تلاش کر لی۔ دن بھر ہمد کے دفتر میں مفت کام کرتے، چھ بجے شام سے آدھی رات تک اس کیمسٹ کے ہاں رہتے، اور جب وہاں سے چھٹی ملتی، تو گورو دارے اگر پڑ رہتے۔ وہ لکھنؤ میں غالباً چھ مہینے رہے، شاید اور رہتے، لیکن سخت بیمار پڑ گئے۔ جب علاج معالجے سے اچھے ہو گئے، تو لاہور واپس چلے آئے، اور شیدا صاحب کے اخبار ہندوستان میں نوکری کرنی۔

اس واقعے سے دیوان سنگھ کے کردار انسان کی کامیابی کا راز نکلتا ہے۔ اگر ان کے سامنے کوئی مقصد ہوتا، تو اس کے حصول کی خاطر وہ ماہ کی مشکلات سے

گھبر کر اس سے دست بردار نہیں ہو جاتے تھے منزل بمقصد تک پہنچنے کے لیے وہ کسی ادنیٰ سے ادنیٰ کام سے بھی جی نہیں چراتے تھے۔ ان کی تمام کامیابیوں کا راز انھیں دو باتوں میں پنہاں ہے، مشکل سے نہ گھبرانا اور محنت سے جی نہ چرانا۔

یہ ہندوستان "میں کام کرتے تھے کہ مشہور سکھ لیڈر ماسٹر مونا سنگھ نے ان سے کہا کہ ہمارا جانا پٹیا لہ کے آدمی جھسٹوڑ (ریاست پٹیا لہ) کے قومی کارکن بابو تيجا سنگھ کو بہت تنگ کر رہے ہیں کیونکہ بابو صاحب نے ہمارا جانا کی بعض ناجائز خواہش پوری کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ اس پر دیوان سنگھ جھسٹوڑ پہنچے، ماسٹر مونا سنگھ اور بابو تيجا سنگھ سے ملے، سارے حالات سنئے۔ مشورہ ہوا کہ کیا کرنا چاہیے۔ آخر طے پایا کہ ہمارا جانا بہادر کی کارگزاریوں کا سہانڈا بھجوا دیا جائے، اخباروں میں مضمون لکھے جائیں اور دیوان سنگھ خود حالات میں تقاب کرنے کے لیے اردو میں ایک پمفلٹ بھی لکھ کر شائع کرے۔

قرار داد کے مطابق دیوان سنگھ نے پمفلٹ بعنوان "خونِ شہادت کا تازہ قطرہ" لکھا اور چھپوا دیا۔ وہ اس کے دو نسخے جلدی سے تیار کر دے دفتری کے ہاں سے اٹھا لاتے اور انھیں دوستوں میں تقسیم کر دیا۔ شدہ شدہ اس کی خبر ہمارا جانا کے آدمیوں کو بھی ہو گئی۔ انھوں نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کیا، جس پر حکومت ہند نے پمفلٹ بحق سرکار ضبط کر لیا اور پولیس نے دفتری کے ہاں سے بقیہ ۱۸ نسخے اپنے قبضے میں لے لیے۔ جب دیوان سنگھ کو حالات کی خبر ملی، تو انھیں افسوس ہوا کہ کی کرائی محنت ضائع گئی۔ لیکن انھوں نے ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا۔ جھسٹوڑ پہنچ کر پھر ماسٹر مونا سنگھ اور بابو تيجا سنگھ سے مشورہ کیا۔ دونوں نے کہا کہ کچھ ہو، پمفلٹ دوبارہ شائع ہونا چاہیے۔ اس پر یہ دلی گئے، یہیں اس کی کتابت کرائی اور ایک دن میں اسے طبع کر کے اور دو ہزار نسخے کے کرواپس روانہ ہو گئے۔ رستے میں لدھیانہ، جالندھر، امرتسر کے ٹراکٹروں سے مختلف دستلوں کے نام پارسل بھیجتے ہوئے لاہور پہنچے، اور یقیقہ نسخے وہاں

سے ارسال کر دیے۔

پولیس نے تفتیش کی، تو انہیں پتا چل گیا کہ یہ کس کی کارستانی ہے۔ اس پر یہ دو ہفتے بعد گرفتار کر لیے گئے۔ اب ایک لطیفہ ہوا :

جب دن پولیس نے انہیں پکڑ لے، اتفاق سے اس دن اتوار تھا۔ سناٹے والوں نے انہیں ہتکڑی لگا کر انگریز ڈپٹی کمشنر کے بنگلے پر بھیجا کہ ان سے ریمانڈ پر دستخط کرائے جائیں، مقدمہ تحقیقات مکمل ہونے پر بعد کو واکر ہونا رہیگا۔ ان کی خوش قسمتی کہ جب اتنا نیدار انہیں ہتکڑی لگاتے ڈپٹی کمشنر کے بنگلے پر پہنچا ہے، تو صاحب بہادر نشے میں چور تھے۔ سناٹا نیدار نے ان سے کوائف بیان کر کے ریمانڈ پر دستخط کرنے کی درخواست کی، تو خدا معلوم، وہ پوری بات سمجھے بھی پا نہیں، انہوں نے دیوان سنگھ سے پوچھا: ویل، تم کل ہماری عدالت میں حاضر ہو گھا؟ دیوان سنگھ نے کہا: اگر آپ کہتے ہیں، تو میں ضرور آؤنگا۔ اس پر ڈپٹی کمشنر نے سناٹا نیدار کو حکم دیا کہ ملازم کی ہتکڑی کھول دو اور اسے رہا کر دو، پیکل عدالت میں حاضر ہو جائیگا۔ وہ توجہ نہ کر بنگلے کے اندر چلے گئے، اور سناٹا نیدار غریب جوان، پریشان کہ ٹولینس آف انڈیا کا مقدمہ، دو ہفتے کی دن رات کی تنگ و دوکے بعد ملازم گرفتار ہوا! اور صاحب نے بول اس کی رہائی کا حکم دے دیا! کیسی حکم حاکم، مرگِ مفاجات، کرتا تو کیا کرتا! اس نے انہیں رہا کر دیا۔

اگلے دن پیر تھا، یہ حسبِ افراد عدالت میں حاضر ہو گئے۔ اب صاحب کا نشہ اتر چکا تھا اور وہ اپنی پہلے دن کی کارگزاری پر کچھ متعجب اور پریشان بھی تھا۔ لیکن جو تیرکیاں سے نکل چکا تھا، وہ اب واپس کیوں نہ آ سکتا تھا! اس نے دیوان سنگھ سے کہا کہ اگر تم معافی چاہو، اور وعدہ کرو کہ آئندہ کبھی ایسا پفلٹ نہیں نکھو گے، تو ہم تم کو چھوڑ دیتا ہے۔ انہوں نے جوانی کی ترنگ میں جواب دیا کہ میں نہ معذرت کرتا ہوں، نہ کوئی وعدہ! آپ کو مقدمہ چلانا ہے، تو خوشی سے چلائیے۔ اس پر صاحب کسمیا نے ہونے چہر اسی کو حکم دیا کہ اس لڑکے کو

عدالت سے نکال دو! یہ نہیں جانتا کہ مقدمہ کیا ہوتا ہے! وہاں کیا درستگی چہرہ سی
نے انہیں گردن پکڑ کر باہر ڈھکیل دیا۔ جان بچی، لاکھوں پائے صاحب نے سب
پر لکھ دیا، ملزم نا تجرب کار لڑکھو چھو کر لے، اسے تفتیہ کر دی گئی ہے۔ میل داخل
دفتر کر دی جاتے۔

یہ ان کی زندگی کی پہلی تصنیف تھی! اور پہلی گرفتاری بھی۔

اب یہ پھر بیکار تھے۔ بسر وقات کے لیے چند سے لاہور کے مختلف چروں (گودگشتال،
ہندو، اکالی وغیرہ) میں جزوقتی کام کرتے رہے۔ لیکن کب تک؟ آخر ۱۹۲۸ء میں دلی
پہنچے۔ ان دنوں یہاں اخباری دنیا میں خواجہ حسن نظامی مرحوم دف: جولائی ۱۹۵۵ء
کا ڈکا ہوتا تھا۔ انہیں نئے نئے اخبار جاری کرنے کی گویا دھن تھی۔ دیوان سنگھ ان
سے ملے اور ملے پایا کہ ایک روزنامہ رحمت کے نام سے جاری کیا جائے۔ اس میں
دیوان سنگھ نے ۲۵۰ روپے لگائے، بقیہ سراپہ خواجہ صاحب مرحوم کا تھا۔ شرط یہ تھی
کہ دیوان سنگھ صرف تیس روپے ماہانہ اپنے ذاتی خرچ کے لیے لینگے۔ روزانہ خواجہ
صاحب کی کتابوں کا ایک صفحے کا اشتہار اخبار میں مفت شائع ہو گا۔ اگر اخبار میں
منافع ہوا، تو دونوں شریک برابر کے حصے دار! اگر نقصان ہوا تو اسے خواجہ صاحب
پورا کرینگے۔ لیکن پوری کوشش کے باوجود اخبار لگائے میں رہا۔ چند مہینے کے بعد
خواجہ صاحب نے کہا کہ بھائی، اب زیادہ نقصان برداشت نہیں کیا جاسکتا، ہمیں
اخبار بند کر دینا چاہیے۔ قدرتا دیوان سنگھ کو اس فیصلے سے بہت افسوس ہوا۔
ابتدائی فوجاتی سو تو ڈوبے بھاتے، اب سپر مستقبل کا سوال سامنے آگیا۔

خواجہ صاحب اوصوفہ کے عزیز دوستوں میں ملتا واحدی (دف: ۱ اگست ۱۹۷۷ء) بہت
مشہور شخصیت تھی۔ یہاں دلی میں ان کی بڑی ساکھ تھی، وہ میونسپل کمیٹی کے رکن
بھی تھے۔ اس زمانے میں وہ ماہنامہ نظام الشائع نکالتے تھے۔ انہوں نے
خواجہ صاحب سے کہا کہ آپ "رحمت" لکھ دے دیجئے، میں اسے چلاؤں گا۔ غرض،
"رحمت" کا دفتر واحدی صاحب کے مکان کو چھ چیلان میں اٹھ گیا۔ بھوپال سے

نیاؤں تھوڑی اس کی ادارت کے لیے بلائے گئے۔ حکومت کو اخبار کی پالیسی پسند نہ آئی، وہ اس کی متواتر شکایتیں چلیں، چلیں بچیں تھیں۔ اتنے میں پیاد کے مصرعے متعلق دو ادارے گویا روایتی اونٹ کی پشت پر آخری تنکا ثابت ہوئے۔ حکومت نے ملا واحدی سے ضمانت طلب کرنی، اور مطبع ضبط کر لیا۔ پرچے نے دم توڑ دیا۔ ہے یہ کہ آج تک بھی یہ ملا واحدی کی ضد سے چل رہا سخا ورنہ اس میں منافع کی صورت تو کبھی ایک دن بھی پیدا نہیں ہوتی تھی۔

دیوان سنگھ سچر بیکار ہو گئے، اور حسب معمول جیب بالکل خالی، برعیت میں کام کرنے کے زمانے میں ان سے دیوبند کے ایک تاجر لالہ اوگر سین کی ملاقات ہو گئی تھی۔ وہ دیوان سنگھ کی صفت کی عادت اور فرض شناسی سے بہت متاثر تھے۔ لالہ جی نے انھیں پیشکش کی کہ آئیے، ہمیں چل کر آڑھت کا کاروبار کریں۔ مرناسیہ نہ کرتا! مجبوراً دیوان سنگھ نے ۱۵۰ روپے مشاہرے پر ان کی ملازمت قبول کر لی اور بہت چلے گئے۔ لیکن تجارت ان کے بس کی بات نہیں تھی، نہ کوئی اس کا تجربہ ہی تھا۔ مشکل سے انھوں نے چار مہینے سیٹھ صاحب کے ساتھ کالے اور سبھاگ نیکے۔ اس کے بعد مہاراجا رپوڑ میں سنگھ واپی نا بھر کے، جن سے سردار سردول سنگھ کو پیش کر کے ذریعے سے تعارف ہو چکا تھا، ملازم ہو کر نا بھر چلے گئے۔ وہ نا بھر میں کوئی ڈھائی تین سال رہے۔ یہاں وہ دوسروں پرے ماہانہ پاتے تھے۔

مہاراجا رپوڑ میں سنگھ اپنی قوم پرستی اور انگریز دشمنی کے لیے مشہور تھے۔ اسی لیے حکومت ہند کا پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ ان کے خلاف ہو گیا اور حکومت انھیں گدی سے اتارنے کے لیے یہاں ڈھونڈنے لگی۔ بالآخر حکومت نے ۱۹۲۳ء میں مہاراجا کو اختیارات سے دست بردار ہونے پر مجبور کر دیا، جس کے بعد وہ ڈیرہ دون میں مقیم ہو گئے۔ لیکن حکومت ان کی سرگرمیوں سے مطمئن نہیں تھی۔ مہاراجا نے بھی کچھ بے احتیاطی سے کام لیا۔ آخر کار ۱۹۲۸ء میں انھیں الہ آباد کے ریلوے اسٹیشن پر گرفتار کر کے کوڈائی کنال میں نظر بند کر دیا گیا۔ وہیں ۱۹۴۲ء میں ان کا انتقال

ہوا۔ اس جلا وطنی کے زمانے میں ان کی بیوی سرورجینی دیہوی بھی ان کے ساتھ نظر بند رہی تھیں؛ ان کی سہ دسمبر ۱۹۷۷ء کو کوئی دہائی میں رحلت ہوئی۔

جب مہاراجا نا بھو کو گمری سے اتارا گیا، تو دیہان سنگھ نے بھی وہاں سے روانہ ہونے کی تیاری کی کہ اب وہاں ان کا کون تھا جس کے بھروسے پر یہ ناپہر میں رہ سکتے تھے؟ انھوں نے انگریز ختم علی (ایڈمنسٹریٹر مسٹر) لوگو کی خدمت میں اسٹیفن پیش کر دیا۔ اوکھوی نے اول تو ان سے اسٹیفن واپس لیے تو کہا اور ملازمت جاری رکھنے کا مشورہ دیا۔ لیکن، امرار کرنے پر انہی رعایت کی کہ اچھا پسندہ دن تک میں اسے منظور نہیں کرتا؛ یہ وقفہ آپ کی رخصت میں محسوب کر لیا جائیگا۔ اس دوران میں غور کر لیجیے۔ اگر اس کے بعد بھی آپ اس فیصلے پر پختہ رہے، تو اسٹیفن منظور کر لیا جائیگا لیکن ہوا اس کے برعکس۔ یہ ناپہر سے فوراً مہاراجا سے ملاقات کے لیے ڈیرہ دون پہنچے۔ وہاں مہاراجا نے انھیں ایک نجی خط دے کر حیدر آباد بھیج دیا۔ ظاہر ہے کہ حکومت ہند کی خفیہ پولیس ان کی نقل و حرکت کی نگرانی کر رہی تھی، اور انھیں معلوم تھا کہ یہ کیا کر رہے ہیں اور کہاں جا رہے ہیں؛ چنانچہ جب وہ حیدر آباد سے واپس نا بھو پہنچے کہ اپنا سامان وغیرہ لے کر اس شہر کو خیر باد کہہ دیں، تو پولیس نے انھیں گرفتار کر کے نظر بند کر دیا۔ قصور یا الزام کچھ نہیں بنایا، بس نظر بند کر دیا۔

ان کے دوستوں کی بھی کمی نہیں تھی؛ خود مہاراجا نے مجلسِ دامع قوانین کے اراکین دوستوں کو لکھا۔ خدا خدا کر کے معاملہ لاڈلہ ڈیڈنگ وایسر نے ہند کے سامنے پیش ہوا اور انھوں نے ان کی رہائی کا حکم صادر فرما دیا۔ یہ تین بیٹے نظر بند رہے تھے۔

نا بھو کی ملازمت کے دوران میں انھوں نے وہاں ظلم و ستم کے کئی واقعات اپنی آنکھوں دیکھے تھے۔ قرب و جوار کی دوسری ریاستوں کے حالات بھی کچھ بہتر نہیں تھے، وہاں کی برطانویوں کی کہانیاں بھی آنے والے سناتے رہتے تھے۔ دیوان سنگھ جب یہ باتیں سنتے، تو ان کا خون کھوتا اور چاہتے کہ کسی طرح ان مظلوموں کی رو واد حکومت

ہند اور عوام تک پہنچائی جائے تاکہ ان کی دادرسی ہو سکے۔ اسی زمانے میں انھوں نے دبر سیر ایک اخبار جاری کرنے کا عزم کر لیا جس کے ذریعے سے دلیان ریاست کے مظالم طشت از ہام کیے جاتیں اور ان کی مصیبت زدہ رعایا کی درونگاہی کافی ملک و قوم کو سنائی جاتے۔

جب یہ نا بھد کی نظر بندی سے چھوٹے تو سیدھے دلی پہنچے۔ اب انھوں نے اپنے منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کا اقدام کیا۔ دوستوں سے مشورہ ہوا کسی نے حوصلہ افزائی کی، کسی نے اس خازن سے دامن بچانے کی صلاح دی۔ روپے کا سوال الگ تھا۔ وہ ہمیشہ فضول خرچ رہے۔ نا بھد کی پوری ملازمت کے دوران میں بھی کچھ پس انداز نہیں کیا تھا کہ اب اخبار شروع کرتے وقت کام آتا۔ قسط کوتاہ کافی سوچ بچار کے بعد فیصلہ ہوا کہ ایک ہفتہ وار جاری کیا جائے اور موضوع کی مناسبت سے اس کا نام "ریاست ہند" ڈیڑھ ہزار روپیہ ایک بنیے سے فرض لیا اور یوں ۱۹۲۳ء میں اس کا آغاز ہوا۔

"ریاست" کا اجرا کسی پہلوؤں سے عہد آفریں تھا۔ یہ پہلا پرچہ ہے جس میں خاص طور پر دیسی ریاستوں کے حالات اور معاملات پر بخوبی اور صراحت سے تنقید کی گئی۔ اس سے پہلے اگر کوئی ریاستوں کے بارے میں کچھ لکھتا بھی تھا، تو صرف والی ریاست کی مدح میں قلعیدہ، تاکہ اس سے کچھ فتوح حاصل ہو سکے، لکھنے والے کو ریاست کی رعایا سے کوئی سروکار نہیں ہوتا تھا۔ سچ یہ پرچہ جس آب و تاب سے چھپنا شروع ہوا وہ بھی اردو صحافت میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس سے پہلے صرف مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم (ف: فروری ۱۹۵۸ء) کا الہلال (البلاغ) اس شان سے نکلا تھا، لیکن وہ خوش و خشیہ، دے دولت مستعمل بود کا مصداق ثابت ہوا۔ اور صرف چار برس زندہ رہ کر بند ہو گیا۔ "ریاست" کے سلسلے میں اس کے مدیر اعلیٰ پووان سنگھ کو جن مصائب کا سامنا کرنا پڑا، وہ بھی اپنی مثال آپ ہیں۔ چونکہ اس پرچے میں مختلف ریاستوں کی بی زبان اور مظلوم رعایا کی حمایت میں

وہاں کے حکمرانوں کے کرتوتوں کا کتچا چٹخا چھپتا تھا، اس لیے تمام والیان ریاست لے گویا دیوان سنگھ کے خلاف متحدہ محاذ بنالیا۔ کئی مقتدے دائر ہوتے جہاں میں دہلی کون تھے، ایک طرف راجا مہاراجا یا نواب کی بے پایاں دولت اور اثر و رسوخ، اور دوسری طرف ایک ہفتہ دار اخبار کا بیٹہ دتہ پائیڈ شیر اور اس کے محدود وسائل۔ لیکن آخر میں دیوان سنگھ کو کہ انھوں نے جو قدم پہلے دن اٹھایا تھا، اس سے توبہ برابر پسپائی قبول نہیں کی اور میدان میں ڈٹے رہے۔ ان پر بعض اوقات مختلف ریاستوں کی طرف سے یک وقت چار چار مقتدے چلیے گئے، ایک شمال میں، دوسرا جنوب میں، تیسرا مغرب میں، چوتھا یہاں دہلی میں۔ آپ تصور کر سکتے ہیں کہ اس سے کتنی جسمانی تکلیف اور ذہنی کوفت ہوتی ہوگی! پھر مالی زبرداری پہی جگہ۔ ان پر اپنی زندگی میں پندرہ مقتدے چلے۔ ان میں سب سے شہور نواب بھوپال کا مقدمہ ہے جو ہوشنگ آباد میں پھر برس تک جاری رہا۔ اور جس میں آخر کار دیوان سنگھ کو تین مہینے قید کی سزا ہوئی۔ مرحوم کہتے تھے کہ اس میں میرا سنی ہزار روپیہ خرچ ہوا تھا۔ اس کے باوجود یہ کبھی نہیں ہوا کہ ان مادی اور معنوی تکالیف سے پریشان ہو کر نا انصافی یا ظلم کو تم سے سمجھوتا کر لینے کا خیال بھی ان کے دماغ میں آیا ہو۔

ریاست کی ایک اور خدمت بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتی۔

ہماری سیاسی جنگ کا اصلی محاذ تو انگریزی حکومت کے خلاف تھا جس نے ہماری آزادی سلب کر کے پوری قوم کو غلام بنا رکھا تھا۔ لیکن ایک ذیلی محاذ اور بھی تھا اور اس پر بہت کم توجہ ہوئی۔ ہندوستان میں کوئی ۵۰۰ دیسی ریاستیں تھیں۔ ان کے حکمران مطلق العنان تھے، ان کا فرمودہ ریاست کا قانون تھا۔ جس کے خلاف کوئی داد تھی نہ فریاد۔ ان ریاستوں کی ہستی اور بقا انگریز کے رحم و کرم پر تھی۔ اس لیے یہ والیان ریاست ہمیشہ انگریز کی حمایت کرتے اور جیسا بس چلتا، رہنمایانہ قوم اور سیاسی لیڈروں کے خلاف اقدام کرتے رہتے تاکہ

اس طرح دلی نعمت انگریزی حکومت کی نظروں میں اپنی خیر خواہی اور فرائد رسانی کا نقش اور نگہرا کر سکیں۔ غرض کہ یہ ریاستیں ہماری آزادی کے حصول میں ہمیشہ سیدہ راہ ثابت ہوئیں۔ ریاست نے انھیں جیتا بک کر کے بہت بڑی خدمت سرانجام دی۔ اس سے جہاں ریاستوں کی رعایا میں بیداری اور اپنے حقوق کا احساس پیدا ہوا، وہیں اس سے انگریز کا وقار بھی ملیا میٹ ہو گیا، جو ان کا کارہ اور ننگ بخت و قوم راجاؤں، مہاراجاؤں اور نوابوں کا پشت پناہ اور حامی تھا۔

ریاست ۱۹۶۰ء تک جاری رہا۔ ملک آزاد ہوا، نور ریاستوں کی اہمیت بھی ختم ہو گئی۔ جلد ہی نہ ریاستیں رہیں، نہ ان کے حکمران، نہ ریاستوں کے مسائل۔ اس لیے حقیقت میں اب اس پر سچے کی ضرورت بھی نہیں رہی تھی۔ انھوں نے ایک مقامی دوست کے ساتھ اس کے جاری رکھنے کے لیے کچھ معاملہ کیا تھا، لیکن وہ بھی دیر پا ثابت نہ ہوا۔

دیوان سنگھ جنم کے فضول خرچ تھے۔ لاکھوں کما تے اور اڑا دیے، کبھی کل کی فکر نہ کی۔ ان کے ہاتھ میں چھید تھا، بڑا ساجھید، روپیہ اس میں ٹکتا نہیں تھا، ایسے میں کچھ پس انداز کرنے یا آڑے وقت کے لیے بچا رکھنے کا امکان ہی کیا تھا۔ ساری عمر مصافحت کا کاروبار کرنے سے وہ کسی اور گون کے رہے بھی نہیں تھے۔ اس پر کبر سنی وراعت ال قواء کا فقدان۔ واقعی پریشانی کا عالم تھا۔ بارے مولانا ابوالکلام آزاد کی سفارش پر حکومت ہند نے ڈھاتی سو روپے ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا، اور پھر انھیں کے ایمپائر حکومت پنجاب نے بھی غالباً پانسو ماہانہ دینا منظور کیے، یوں جاب و تن کا رشتہ قائم رکھنے کا سامان ہو گیا۔

ریاست بند کرنے کے بعد ۱۹۶۰ء میں دلی سے ہجرت کر کے راجپورہ (ڈیرہ دکن) چلے گئے تھے۔ وہاں اکیلے رہتے تھے، بیوی بچے یہاں دلی ہی میں رہے۔ ۲۰ جنوری ۱۹۷۵ء کو دہلی کے ہسپتال سے نکلنے ہوئے پاؤں رپٹ کیا اور گر گئے۔ سر میں چوٹ آئی۔ جس سے بہت خون خارج ہوا، علاج کے لیے وہاں اسپتال میں داخل ہو گئے۔

جب دلی میں گھردالوں کو اطلاع ہوئی، تو جا کر انھیں بوالا گئے۔ لیکن وقتِ اجڑا لگا تھا، ساری دوا دوش کے باوجود وہ جاہل نہ ہو سکے۔ اتوار ۲۶ جنوری ۱۹۷۷ء آدھی رات سے کچھ پہلے روحِ نفسِ منفری سے پرواز کر گئی۔ یوں وہ مرد میدان بھی جس نے ساری عمر لڑنے جھگڑاتے اور مخالفوں کا مقابلہ کرنے گزار دی تھی، فرشتہ موت کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گیا۔

موت سے کس کو رستگاری ہے !

تین بیٹے ان کی جسمانی یادگار ہیں: مہندر سنگھ، اوتکار سنگھ، زندکار سنگھ سب یہیں دلی میں کاروبار کرتے ہیں۔

ان سے دو کتابیں یادگار ہیں: ناقابلِ فراموش اور جذباتِ مشرق۔ ناقابلِ فراموش انھوں نے جیل میں لکھنا شروع کی تھی۔ ۱۹۴۲ء کی "ہندوستان چھوڑو" تحریک میں وہ بھی قید کر دیے گئے تھے۔ وہ ۱۸ اگست ۱۹۴۲ء کو گرفتار ہوئے اور تقریباً سال بھر بعد ستمبر ۱۹۴۳ء میں رہا کر دیے گئے۔ جیل خانے میں انھوں نے اپنی زندگی کے وہ واقعات قلمبند کرنا شروع کیے جو ان کی نظر میں اہم اور سبق آموز تھے۔ ان کی غیر حاضری کے زمانے میں ریاستِ ہندوستان ان کی رہائی کے بعد جب یہ ۳ اپریل ۱۹۴۳ء کو دوبارہ جاری ہوا، تو پہلے ہی شمارے میں یہ یادداشتیں "ناقابلِ فراموش" کے عنوان سے شائع ہونا شروع ہوئیں۔ بعد کو ان کا ایک مختصر مجموعہ کتابی شکل میں چھپا، تو بہت مقبول ہوا۔ اس سلسلے کی ہر دلعزیزی سے انھیں خیال پیدا ہوا کہ اسے مفصل کر دیا جائے۔ چنانچہ دوسری بار یہ کتاب نومبر ۱۹۵۶ء میں بڑے سائز کے ۵۱ صفحات پر شائع ہوئی۔ پھر وہ قیام کے زمانے میں انھوں نے اس کا دوسرا حصہ "سبب و قلم" کے نام سے لکھا تھا۔ اور اس کی کتابت بھی ہو چکی تھی۔ یہ بھی خاصی ضخیم کتاب ہے چھپ جاتے، تو اس سے ہمارے سوانحی ادب میں مفید اور دلچسپ اضافہ ہو گا۔

تعلیم کی کمی کے باوجود، انھوں نے ساری عمر کی مشق سے "اردو سے اچھی خاصی واقفیت

حاصل کر لی تھی۔ اگرچہ ان کی زبان اعلیٰ سے پاک نہیں، لیکن ان کی نثر میں بلا کی کشش ہے۔ ناقابل فراموش ”میں تسلسل منقووبہ“ جسے حجتہ واقعات میں بہر ایک واقعے کے آخر میں کوئی اخلاقی سبق دیے کی کوشش بھی موجود ہے جو طبیعت پر گراں گزرتا ہے۔ ان سب نقائص کے باوجود اس کی دلچسپی اور کشش کا یہ عالم ہے کہ انسان اس سے اکتاتا نہیں اور چاہتا ہے کہ اسے آخر تک پڑھ جائے۔ اس کتاب کا ہندی ترجمہ بھی ”تروینی“ کے عنوان سے چھپ چکا ہے۔ میں جب ۱۹۶۶ء میں افغانستان سے واپس آیا، اور انہیں معلوم ہوا، تو خواہش ظاہر کی کہ اس کا فارسی ترجمہ چھاپنے میں ان کی مدد کروں۔ میں نے عرض کیا کہ اصلی مسئلہ اس کے فارسی ترجمہ کرنے کا ہے۔ جب تک یہ نہ ہو، طباعت و اشاعت کے مرحلے کا کیڑا مگر سوچا جاسکتا ہے! بہر حال وہ پیل مندرجہ نہ پڑھ سکی۔

ان کی دوسری کتاب ”مذہبات مشرق“ بھی جیل کی دین ہے۔ مقدمہ سچو پال کے بعد وہ تین مہینے ناگپور جیل میں رہے تھے۔ یہیں انہوں نے ہندی، پنجابی، فارسی وغیرہ کے منتخب اشعار کا تشریحی ترجمہ شروع کیا۔ رہائی کے بعد دونوں تیراجم بھی زیاست میں چھپتے رہے۔ انہیں کا مجموعہ بالآخر ۱۹۶۰ء میں کتابی شکل میں شائع ہوا۔

ان کے نام کے ساتھ مفتون کا جزو تخلص نہیں تھا۔ خواجہ حسن نظامی مرحوم اپنے دوست احباب کو مختلف لقب اور خطاب دیا کرتے تھے جس زمانے میں سردار دیوان سنگھ سے ان کے تعلقات خوشگوار تھے، انہوں نے انہیں ”مفتون“ کا لقب عطا کیا۔ اور یہ کچھ ایسا ان کے نام کے ساتھ لگا کہ جب تک آپ پورا نام ”دیوان سنگھ مفتون“ نہ کہیں، ان کی طرف کسی کا خیال جا ہی نہیں سکتا۔

مرحوم کی پوری زندگی سبق آموز ہے۔ مادی و مائیل یکسر ندرت، تعلیم نہ ہونے کے برابر، ہر طرح کے ہنر یافتہ سے گورے، حوصلہ افزائی کرنے والے یا بڑھاوا دینے والے نہ تھے۔ ان کی محنت و مشقت سے جی نہ چرانے کی عادت، اور بے پایاں

خود امتدادی کا یہ ثمرہ تھا کہ اسٹون نے بڑے بڑے پہاڑوں سے ٹکرتی۔ اور انہیں
اپنی جگہ سے ہلا دیا۔ وہ آزادانہ پیچے اور آزادانہ مرے۔

اس طرح جی کہ بعد مرنے کے
یاد کوئی تو گاہ نگاہ کرے

مسح الزماں، ڈاکٹر سید

ان کا خاندان جالس (ضلع راولپنڈی، یوپی) کا رہنے والا تھا۔ ان کے والد سید مہدی الزماں پیشے کے لحاظ سے بہت کامیاب وکیل اور سماجی پہلو سے عمائد شہر میں سے تھے۔

سیح الزماں ۱۸ مارچ ۱۹۲۵ء کو جالس ہی میں پیدا ہوئے تعلیمی دور بہت کامیاب رہا۔ ۱۹۴۱ء میں بی۔اے کے امتحان میں التاباً ریونیورسٹی کے تمام اردو کے ابدولہا میں اول آئے، تو چٹمانی محوش کلیا و نگاری سونے کا تمغا انعام میں ملا۔ دو برس بعد وہیں سے ایم۔اے (اردو) کی سند پائی، جس میں پھر تمام طلباء میں اول رہنے پر کوٹہ جملی تمغہ عطا ہوا، اس کے بعد کچھ چاہتے تھے کہ وہیں سے ڈاکٹریٹ کی سند بھی حاصل کریں، لیکن اس وقت صدر شعبہ اردو خاسن علی خاسن دت: ۲۵ اپریل ۱۹۵۵ء تھے۔ اردو ہی ان کے تحقیقی کام کے نگران بھی تھے۔ ان سے موضوع کے مسئلے پر اتفاق نہ ہو سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بات ملتے رہی، اور بہت دن بعد کہیں ۱۹۶۸ء میں وہ ڈی پٹ کے مرتبے تک پہنچے۔ صرف ۱۸ برس کی عمر تھی کہ ایم اے کرنے کے بعد ۱۹۴۳ء میں وہیں اپنی ریونیورسٹی میں اردو کے مدرس (لیکچرر) مقرر ہو گئے، پہلے کچھ دن عارضی جگہوں پر رہے، بعد کو مستقل ہو گئے۔ رفتہ رفتہ ۱۹۷۲ء میں ریڈر کا مقام ملا۔ اس دوران میں دو برس کے لیے انہوں نے بنارس ہندو یونیورسٹی میں شعبہ اردو، فارسی و عربی کے صدر کی حیثیت سے

بھی کام کیا (نومبر ۱۹۶۹ء تا نومبر ۱۹۷۱ء) چونکہ وہاں نویسی نہ ملی، اس لیے وہاں اللہ آباد چلے آتے۔

”چہ جسم کے لاغر اور قواؤں کے کمزور رہتے، لیکن عام صحت کم و بیش ہمیشہ ٹھیک رہی۔ آخری وقت بہت دیر پانے لگا آیا۔ ۹ فروری ۱۹۷۵ء کو اچانک دل کا دورہ پڑا، اور جان بحق ہو گئے۔ خدا مغفرت فرماتے۔ کربلا، اللہ آباد (ہمت گنج) میں دفن ہوئے۔

جائے کے سادات امام دہم حضرت علی نقی علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ علم و فضل کے ساتھ شعر و ادب بھی ان کا طرہ امتیاز رہا ہے۔ سید سیح الزماں کے خاندان میں بھی پرانے مسلمان شہزادوں کی طرح عربی، فارسی کا بہت چرچا تھا۔ ان کے والد سید مہدی الزماں صاحب علمی ذوق اور شاعرانہ مزاج کے آدمی تھے۔ انہیں کچھ پڑھنے کا شوق تھا، بلکہ عروض پر چند رسالے بھی ان سے یادگار ہیں۔ سید سیح الزماں مرحوم نے بھی فارسی انہیں کی نگرانی میں پڑھی، اور اس میں اچھی استعداد پیدا کر لی۔

ان کی دلچسپی کے دو خاص موضوع تھے: ڈراما اور مرثیہ۔ ڈراما کے فن کے مارا، اور ماہیہ سے خوف وائف تھے۔ یونیورسٹی میں ڈراماٹک ایسوسی ایشن بھی قائم کی تھی، جس کی سرپرستی میں (خود سید الزماں صاحب کی نگرانی میں) ڈرامے کیلے جاتے تھے۔ یہ امر واقع ہے کہ اللہ آباد یونیورسٹی، بلکہ ہر شہر کے حلقوں میں بھی، ڈرامے کو جو فروغ ہوا، اس میں سید الزماں مرحوم کی مساعی کو بہت دخل ہے۔

جس ماحول میں ان کی تربیت ہوئی تھی، اس میں تعریف و تالیف کی چاٹ لگ جانا بالکل قدرتی بات تھی۔ اس پر پیشہ اُردو پڑھانے کا اعتقاد اچرنگہ شیعہ تھے، اس لیے مرثیے سے شغف بھی فطری بات تھی۔ ان کی پہلی کتاب ”مرثیہ میر“ تھی، جو ۱۹۵۲ء میں چھپی۔ عام خیال تھا کہ میر تقی میر کے مرثیے مفقود ہو چکے ہیں، مرحوم نے انہیں کو ایک مبسوط مقدمے کے ساتھ پیش کیا ہے۔ بقیہ مکتا میں یہ ہیں: (۲) اردو تنقید کی تاریخ: جلد اول (۱۹۵۴ء)؛ (۳) تبصیر انشراح، تنقید (۱۹۵۵ء)؛ یہ بعض مضامین اور مشرقی نقادوں کا مجموعہ ہے؛ (۴) ”حرف غزل“ (۱۹۵۷ء)؛ اس

میں اردو غزل کا تنقیدی مطالعہ اور انیسویں صدی کے مشہور غزل گو یوں کا جائزہ لیا ہے (۵) "امانت کی اندر سبھا" (۱۹۶۶ء) تنقید کی تصنیف کی گئی ہے، اور ایک مبسوط مقدمے میں، ابتدائی اسٹیج، رہس اور اندر سبھا کی تدوین اور اس کی خوبیاں اور خامیوں پر بحث کی ہے؛ (۶) معیار و میزان (۱۹۶۸ء)؛ اردو کے نثری اسالیب پر تبصرہ ہے؛ (۷) اردو مرثیہ کا ارتقاء (۱۹۶۸ء)؛ ڈی لٹ کی سنہ کا مقالہ؛ (۸) اردو مرثیہ کی روایت (۱۹۶۹ء) یہ گویا اردو مرثیہ کی تین صدیوں کی تاریخ ہے؛ (۹) مولانا انیس دو پیراؤں پر مشتمل (۱۹۷۰ء) مقدمہ اور حواشی کا اضافہ کیا ہے؛ (۱۰) کلیاتِ مومن (۱۹۷۰ء) مقدمہ اور مومن کے مقام کے تعین کی کوشش؛ (۱۱) کلیاتِ میر: جلد دوم (۱۹۷۱ء)؛ غزلیات کے علاوہ میر کے کلام کی تدوین، اس کے مقدمے میں میر کی شاعری اور اسلوب پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے؛ (۱۲) دلغ کی شاعری (ہندی)؛ (۱۳) خورشید (۱۹۷۳ء)؛ پارسی تخیل پر مبنی کا پہلا اردو ڈراما جو کسی زمانے میں گجراتی میں چھپا تھا، اسی کو حیاتِ نو بخشی ہے۔ انھوں نے دو کتابیں انگریزی سے ترجمہ بھی کی تھیں (۱۴) ٹیلیفون کی کہانی (۱۹۷۰ء)؛ (۱۵) بیاسہا متحدہ کی مختصر تاریخ (۱۹۷۴ء) کچھ چیزیں غیر مطبوعہ بھی رہ گئیں۔ مختلف مجلات میں مطبوعہ مضامین بھی خاصی تعداد میں ہیں۔

ان کی شادی پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب کی بڑی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ ان سے دو لڑکے اور دو لڑکیاں اپنی یادگار چھوڑے۔

حیرت بدایونی، سید حسن

بدایونی کے مروجہ چیز غلطے بدایوں میں پیر کے دن ۲۳ اگست ۱۸۹۶ء (۱۵ ربیع الاول ۱۳۱۶ھ) کو پیدا ہوئے۔ دادھیال اور نامھیال دونوں طرف سے حضرت ابو بکر صدیقؓ کی اولاد میں تھے۔ پشتوں سے ان کے بزرگ حکومت وقت کی ملازمت کرتے آئے تھے، اور گھر میں علم و فضل کا بھی دورہ دورہ تھا۔

ان کے جدِ اعلیٰ قاضی محمد جلیس، اہلِ درنگ و زیب میں فتاویٰ عالمگیری کی ترقیب و تدوین شریک رہے تھے۔ اسی باعث ان کے بعد یہ خاندان "قاضی زادے" کے لقب سے مشہور ہو گیا۔ چنانچہ بدایون کے جس محلے میں یہ لوگ مقیم تھے، وہ آج تک "قاضی ٹولہ" کہلاتا ہے۔

ان کے دادا قاضی عظمت علی منصف اور صلیہ علی کے عہد سے ہر فائز تھے زمین داری بھی تھی۔ غرض دینی عزت اور آرام و آسائش کے تمام وسائل مہیا تھے لیکن یہ خوشحالی ان کے والد قاضی محمد حسن کے ساتھ ختم ہو گئی۔ انگریزی حکومت کا زمانہ تھا۔ انہیں کوئی معقول ملازمت ملی نہیں، اور معمولی اور چھوٹی نوکری پھولنے لے اپنے شایانِ شان نہ خیال کی۔ بیکاری اور مزاج میں ریاست کی ہوا رفتہ رفتہ سازی اسلامک بک گتیس، جہاں عیش کے تقاسے بچتے تھے، وہاں افلاس نے چھاؤنی چھالی۔

بدایون کا ماحول کچھ عجیب دین و دنیا اور شر و حکمت کے اشتراج کا نام تھا۔

سید حسن کچھ حالات سے عبور کچھ اپنی انفرادی طبع کا امتزاج ان کی تعلیم کا آغاز بھی عربی اور دینیات سے ہوا۔ اور بالآخر مدستہ قادریہ اور مدستہ شمس العلوم سے عربی اور علوم قرآنی میں سند فرغ حاصل کی۔ پھر آراء یونیورسٹی سے فنی فاضل (فارسی) اور مولوی فاضل (دینی) کے اعلیٰ امتحانات انھیں اسے پاس کیے۔

تعلیم جس بیج پر جوئی تھی، اس میں علمس کے پیشے کے علاوہ اور کوئی سبیل رہ ہی نہیں گئی تھی۔ چنانچہ اوائل میں چندے انبار، بدایون، اکا پور کے باقی اسکولوں میں مدرس رہے۔

۱۹۲۲ء میں ہماری سیاسی تحریک اپنے پورے شباب پر تھی۔ پوری فضا کانگریس اور خلافت کے نعروں سے گونج رہی تھی۔ نوجوان طبیبیتوں میں جوش اور ہیجان تھا۔ جوان سید حسن بھی اس لپیٹ میں آ گئے، جوش و خروش سے میدان عمل میں کود پڑے اور مجلسوں میں تقریریں کرنے لگے۔ لیکن جب گرفتاری کا وارنٹ کٹ گیا، تو اب مابین اسی میں دیکھی کہ انگریزی علاقے سے ہجرت کر جائیں۔ رپوش ہو کر دسمبر ۱۹۲۲ء میں ریاست حیدر آباد وکن پہنچے، جہاں اس دور میں شمالی ہند کے شرفا کا واحد بھاء و ماوا تھا۔ مہینا بھر بعد جنوری ۱۹۲۳ء میں ریاست کے قانون کے مطابق حلف نامہ داخل کر کے ملکی صداقت نامہ ریاست کی رعایا ہونے کا سرٹیفکیٹ حاصل کر لیا۔ انگریزوں نے بھی یہ خیال کر کے کہ چلو، بلالئی، مزیلر بھیا لکھا اور انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیا۔

حیدر آباد میں بھی تعلیمی کا پیشہ اختیار کرنا پڑا۔ اولاً چندے مدستہ آصفیہ میں پڑھتا رہا، بعد کو شاہی خاندان کے نونہالوں کی درسگاہ ”مدستہ اعتراف“ میں تہادار ہو گیا۔ یہیں تھے کہ نوجوان نواب کلیانی کے انایتی مقرر ہو کر پاینگاہ پر چلے گئے۔ دونوں برس بعد ہمارا جاسر کشن پرشاد ہمیں السلطنت سے ملاقات ہوئی، تو ان کے دوبار سے وابستہ ہو گئے۔ ہمارا جامعہ حرم کی مردم شناسی اور اپنے وابستگان کی ترقی پر توجہ ضرب المثل ہے۔ انھوں نے جاگیردار کالج میں ان کی ملازمت کا انتظام کر دیا۔

سہی زمانہ ہے جب حیدر آباد میں ملکی اور غیر ملکی نحر یک جہلی تھی۔ جب تک ہمارا ہا ان کی پشت پر تھے، سید حسن کی ملازمت کو کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا۔ لیکن انہوں نے استغفا دے دیا تاکہ کسی کا احسان نہ رہے۔ اس کے بعد پھر ہمارا جاہی کی وساطت سے انھیں محکمہ اوقاف میں جگہ مل گئی۔ ۳۶ برس کی طویل ملازمت کے بعد اسی محکمے سے پینشن پر سبکدوش ہوتے۔ عمر بھر کے قیام نے حیدر آباد کو ان کا وطن ثانی بنا دیا تھا۔ اس لیے اب وہ یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ احمد بدایون واپس نہیں گئے۔

ان کا گھر سحر شاعر تھا۔ دادا عظمت علی ضیا، والد محمد حسن، آخر چچا محمد حسین، سحر، بڑے سہائی محمد حسن، محسن تھے۔ ان کے چھوٹے سہائی سلطان حسن کا تخلص ایرضا۔ ایسی ضرورہ فضا سے یہ کیونکر چھ سکتے تھے! غرض بہت کم عمری میں شعر کہنے لگے۔ پہلے حسن تخلص کیا، بعد ازاں سے حیرت سے بدل لیا۔ شعر پر کسی سے اصلاح نہیں لی جو کہا، خود ہی دیکھ لیا اور حسب ضرورت اس میں ترمیم کر لی۔ اردو اور فارسی دونوں میں کہتے تھے! اردو میں آئینہ (حیدر آباد ۱۹۳۷ء) اور فارسی میں ابرق (حیدر آباد ۱۹۷۳ء) مجھے طبع ہو چکے ہیں۔ بچوں کے لیے بھی کچھ چیزیں لکھی تھیں! یہ بھی شائع ہو چکی ہیں۔

۱۵ فروری ۱۹۷۵ء پہنچنے کے دن نماز مغرب کے بعد سو اسات، بچے راہی ملک بقا ہوئے۔ اگلے دن (۱۶) فروری جنازے میں شہر کے تمام طبقات کے لوگ کثیر تعداد میں شریک ہوئے۔ درگاہ یوسفین (نام آبی) کے احاطے میں پائین کی طرف سپرد خاک ہوئے۔ امیر مہناتی احمد داغ بھی اسی درگاہ میں موجود اب رہے۔ نام اللہ کا۔

۱۹۲۵ء میں ان کی شادی جناب اجمار حسین فرخوری کی صاحبزادی شکیلہ خاتون سے ہوئی تھی۔ وہ مجددہ تعالیٰ حیات ہیں، اردو و فارسی کی بھی لیاقت کی مالک ہیں اور شعر و شاعری کا بھی ذوق رکھتی ہیں۔

اولاً جسمانی میں چار بیٹے اور تین بیٹیاں اپنی یادگار چھوڑے۔ بیٹوں میں سب سے بڑے موقد حسن ایم۔ کام، ریحیل ریسرچ لیبارٹری میں انجینر کے شعبے کے مدیر ہیں۔ ان سے چھوٹے ڈاکٹر، افضل محمد عثمانید پونیورسٹی کے شعبہ جغرافیہ میں ریڈر ہیں۔ اور سنبھل احمد جلیس ایم، اے انوار العلوم کالج میں اردو کے لیکچرر۔ سب سے چھوٹے محی الدین حسن حکومت ہند میں ہیں۔ مشہور افسانہ نگار جیلانی بانوان کی بیٹی ہیں۔

کلام بہت پختہ اور بے عیب ہے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ میں غلط العام فصیح اور غلط العام فصیح دو دونوں کو دھوکا سمجھتا ہوں؟ عام اور عوام میں کوئی فرق نہیں؛ غلطی عوام کی ہو یا خواص کی، وہ غلطی ہی رہیگی اور غلطی ہی کہلائیگی۔ اس لحاظ سے ان کا کلام دیکھا جائے، تو آپ کو اس میں کہیں کوئی سقم نظر نہیں آئے گا۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

وہ شباب، وہ جوش، وہ دل نہ رہا، وہ تڑپ نہ رہی، وہ مزانہ رہا
تری آنکھ میں قہر و فغان نہ رہی، مرے دل میں مذاق جفا نہ رہا
تری دھن میں گیتا ہوں وہاں کہ جہاں نہ غم، دل و جاں نہ غم و دجہاں
کوئی دھن تری دھن کے سوانہ نہ رہی، کوئی غم ترے غم کے سوانہ نہ رہا

دل ہی کی زندگی سے ہے دنیا کی زندگی دنیا نہیں رہیگی، اگر دل نہیں رہا
حیرت! وہ میکشی نہ ہوتی، خود کشی ہوتی قابو میں جب وہاں نہ رہی، دل نہیں رہا

رنج میں ہنسنا، عیش میں رونا، موت کی شادی، ولایت کاظم
سارے زمانے سے الٹی دنیا سے محبت، کیا کہنا!

دور شراب و نغمہ و گلشن، ابرسیاہ و موسمِ نخل
آج کسی کی بزمِ طرب ہے غیرتِ جنت، کیا کہنا!

آج یہ کون انجمن میں جلوہ فرما ہو گیا بزم کا عالم، ابھی کیا سنا، ابھی کیا ہو گیا
میکدہ آباد، ساقی شاد، میکش زندہ باد آج ہم جیسے فیروں کا بھی پھیر ہو گیا

غیر دل کی وفا سے تو فریفت ہوئی حاصل
 اپنوں کی جفا کا ہے ابھی بارگراں اور
 ضیا فریب محض ہے، لیکن مقرر نہیں
 دنیا میں ہنوائی دنیا کیے بغیر
 پھر مومن ہیں آجائیں ہنزل چھوٹ کے چرچہ
 اب دل کو نیا رنگ لگانے کے نہیں ہم
 تم نہیں ہو، تو برسات کس کام کی!
 آگ برسا رہے ہیں، یہ پانی کے دن
 اپنی سنی کوئی کمی ہم نے دوا میں
 چلتی نہیں انسان کی مگر حکم خدا میں
 ہے رحم کا وعدہ، تو کبھی تپس کی دھمکی
 ڈالا مجھے کشمکش بیم و رجس میں
 پیتے میں محتسب بھی، اکیلے ہمیں نہیں
 لیکن وہ پی کے گھر سے نکلے نہیں
 منزل وہی قدم ہے جہاں ٹوٹ جاتے دم
 سچے پوچھے تو عشق کی منزل کہیں نہیں

تم پہ میرا کوئی حق بھی نہیں، دھوکا بھی نہیں

آج تک میں نے اس انداز سے سوچا بھی نہیں

دل بے نادان کہہ کرتا ہے بھر دسا تم پر

تم تو تم ہو، مجھے اب دل کا بھر دسا بھی نہیں

اب یہ لگتا ہے کہ برسوں کی محبت ہے، مگر

اس سے پہلے تمہیں میں نے کبھی دیکھا بھی نہیں

تم مہربان تھے، تو سبھی مہربان تھے
 تم مہربان نہیں، تو کوئی مہربان نہیں

خبر سنی جو نفس میں بہا ر آنے کی
 نظر میں پھر گئی تصویر اکشیا نے کی

شام سے صبح ہو گئی صبح سے شام ہو گئی
 آپ کے انتظار میں عرس تمام ہو گئی

ترب با رہ کی باتیں، اپا کہنا، رہنے دیے
 بارہ خدا باز آئے ایسے خیر خواہوں سے

دونوں کی خدمتے خاک میں ہم کو ملا دیا
 دل اختیار کا ہے، نہ تم اختیار کے

دل تم سے لگا کر یہ دعا مانگ رہا ہوں
 انسان کا انسان سے خدا کام نہ ڈالے

سوئی کو صدا اٹھ رہی آئی، تو سیرہ آئی
 جاؤ بھی، بڑے آئے ہمیں دیکھنے والے

موت ہے انسان کا آفت از بھی، انجام بھی

زندگی در حقیقت موت کی تاخیر ہے

مانا کہ دوسروں سے مخاطب میں وہ، مگر ہم خوب جانتے ہیں کہ ہم سے خطاب ہے
 تم نے کیا کر دیا، خدا جلے _____ دل ہمارا رہا، نہ ہم دل کے
 دورانِ سفر میں ہیں رہرو، پایاں سفر معلوم نہیں
 رہبر کو رُخ منزل تو کجا، خود را گھر ز معلوم نہیں
 یہ چاند کارنگیں دھوکا ہے، یا سچے نور کا نور کا ہے
 فسوس، ابھی اتنا بھی تھیں، درغانِ سحر معلوم نہیں
 طوفانِ فضا میں چھا تو گیا، موجوں میں تلاطم آ تو گیا
 اب دیکھیے، لکرا جائے کہاں، مریحائے کدھر معلوم نہیں
 اک ٹیس سی تڑپا جاتی ہے، اک برقی سی لہر جاتی ہے
 کیا کہیے کہ سینے میں رخی دل ہے کہ بیکر، معلوم نہیں
 لاریب کہ صلح صادق کا دنیا میں تو برحق ہے آنا
 البتہ ہمارے جیتے جی آئیگی سحر، معلوم نہیں
 ہر چند کہ ہو تم ہم سے خفا، اوروں کی طرف رُش ہے بھی تو کیا
 کیا ہم کو تمہاری آنکھوں کی اختا و نظر معلوم نہیں؟
 اٹھتے نہیں دل کی سمت قدم، کرتے ہو طوافِ دیرِ حرم
 اللہ کے بندو! تم کو بھی اللہ کا گھر معلوم نہیں
 مانا کہ انق پر پہنونی کرن، دنیا سے چن بیدار ہوئی
 آغازِ سحر معلوم سہی، انجامِ سحر معلوم نہیں
 حیرتِ آہنیں انساں کیوں سمجھا، اب میں وہ پری، اب کیا شکوہ
 جب حسنِ جوان ہو جاتا ہے، لگ جاتے ہیں پیر، معلوم نہیں؟

شمس میزری، حافظ شمس الدین احمد

ریاست بہار میں میزری بہت مشہور قصبہ ہے۔ یہ حضرت شرف الدین یحییٰ کی سکنیت اور رکھروہیں تدفین کی وجہ سے میزری شریف کہلاتا ہے۔ یہی میزری شمس کے نزرگوں کا وطن تھا۔ ان کے والد ضییر الدین صاحب معمولی کاشتکار تھے، عسقی، دیاندار، بخارا رس اور تعلیم یافتہ۔ اسی لیے وہ لوگوں میں مولوی ضییر الدین کے نام سے مشہور ہوئے۔ انھیں گاؤں کے زمیندار کے ظلم و ستم سے عاجز آکر ترک وطن کرنا پڑا۔ اس پر انھوں نے گوا تیار میں سکونت اختیار کر لی۔ یہاں انھوں نے سب اوقات کے لیے ٹھیکیداری کا کام شروع کیا۔ اور رفتہ رفتہ فن تعمیر میں اتنی مہارت حاصل کر لی کہ انجینئر کہلانے لگے، اور پھر اسی حیثیت سے ریاست میں ملازم ہو گئے۔ ان کی بقیہ زندگی گوا تیار ہی میں گزری۔ یہاں عزت و محبت حاصل ہوئی، اور روپیہ بھی خوب کمایا، یہ خدا نے ان کی نیک نیتی کا پھل دیا۔ ایک دن اپنے بعد وطن مالوٹ واپس آئے۔ اب دیکھیے قسمت کا کرشمہ! وہی زمیندار جس کی چہرہ دہشتوں سے تنگ آکر انھوں نے ہجرت کی تھی، اپنے لپٹنوں کے طفیل، ان کا لون پہنچ چکا تھا کہ اس کی جا داؤد فروخت ہو رہی تھی۔ مولوی ضییر الدین نے یہ جا داؤد خرید لی۔ ایک الایام ممداد لہا بن اٹھاس (ران) ابھی ہے۔

شمس الدین احمد ۱۸۹۶ء میں ضلع پٹنہ کے گاؤں بلجوری، اپنی نانھیال میں پیدا

پیدا ہوئے تعلیمی اور بہت شاندار دور تھا۔ دسویں کا امتحان ۱۹۱۱ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے درجہ اول میں پاس کیا، اور فارسی میں پوری یونیورسٹی میں اول آئے۔ انٹر کا امتحان بھی چٹہ کالج کے طالب علم کی حیثیت سے کلکتہ یونیورسٹی ہی سے درجہ اول میں پاس کیا، اور ادب کے صوبہ بہادر میں اول رہے۔ لی اے کے زمانے میں ان کے والد مولوی ضمیر الدین گوالیار میں مقیم تھے۔ یہ امتحان انھوں نے وکٹوریہ کالج، گوالیار سے، اور آباد یونیورسٹی سے دیا، جس کے ساتھ یہ کالج ملحق تھا؛ انے کالج میں اول آئے اور ریاست گوالیار سے وظیفہ ملا۔ اس زمانے میں مولوی احسن اللہ خان شاقب وکٹوریہ کالج میں عربی اور فارسی پڑھاتے تھے؛ شمس الدین احمد ان کے چہیتے شاگرد تھے۔ اس کے بعد انھوں نے مشن یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا، اور وہاں سے ایم اے (فارسی) کی سند درجہ اول میں حاصل کی، یونیورسٹی بھر میں اول آئے، اور طلائی تمغہ ملا۔ اسی دوران میں تالون کی سند (ایل ایل بی) بھی حاصل کر لی۔

اتنے شاندار تعلیمی دور کے بعد ملازمت میں کیا درخواست پیش آسکتی تھی؛ منظرِ فرد میں گریجویٹ بار برہمن کالج تھا۔ شمس کا ۱۹۲۱ء میں وہاں اردو فارسی کے پروفیسر کی اسامی پر تقرر ہو گیا۔ سال بھر بعد دادشا کالج، کنگ (اڈیسہ) میں تالون کی مدرسہ علی گئی اور یہ وہاں چلے گئے۔ پانچ برس وہاں رہنے کے بعد ۱۹۲۷ء میں چٹہ کالج میں اردو فارسی پڑھانے پر مقرر ہوئے۔ بقیہ زمانہ ملازمت اسی کالج میں بسر ہوا؛ ۱۹۵۱ء میں امرو۔ اردو اکرام سے دیں سے سکدش ہوئے۔

گازدار: پروفیسر سید حسن چٹہ؛ جناب قسم الحق گیلادی، چٹہ
 یہ کالج ایک مالدار اور عین بھروسہ ماہر، بوسنگٹ سنگھ نے قائم کیا تھا۔ گریجر
 (۱۸۷۷ء) اس وقت حاکم ضلع تھا جس کا نام انھوں نے اپنے ساتھ
 خال کر لیا۔ آڈاوی کے بعد حکومت وقت نے کالج کا نام صرف بانی سے
 منسوب کر کے لنگٹ سنگھ کالج رکھ دیا (۱۹۵۷ء میں)۔ چنانچہ اس وقت
 یہی نام ہے۔

ملازمت سے فارغ ہو کر اولاً انھوں نے دکالت شروع کی، لیکن اس میں دل نہیں لگا۔ سادہ عمر دس میں گزری تھی، تالیف کے ساتھ زیادہ سبب بھی نہیں رہا تھا۔ لہذا اس میں کچھ ایسی کامیابی نہیں ہوئی۔ اسی زمانے میں شیخہ کا دل کھل گیا اور یہ تعلیم زندگی کے لیے وہاں مقرر ہو گئے۔ لیکن اس وقت بہت گر گئی تھی، اور اکثر بیمار رہنے لگے تھے۔ آخر یہ اس ٹیٹ کی شکایت ہو گئی۔ اسی حادثے میں ۱۸ فروری ۱۹۷۷ء کو انتقال کیا۔ درگاہ شاہ اہلداں میں دفن ہوئے۔

شعرو گئی کاغذ کے زمانے سے شروع کی، اور اس میں اپنے کالج کے استاد شاقب مرحوم کے مشورہ رہا۔ بعد کو جب شاقب کا کلام نظم و شعر، گوہرین نامہ کے عنوان سے چھپا (نکھنؤ ۱۳۲۱ء)، تو شمس نے اس کے شروع میں اردو میں تقریباً لکھی گمان ہے کہ انھوں نے شاقب کے ملا وہ اور کس کو اپنا کلام نہیں دکھایا۔ ان کے کلام کا ایک مجموعہ ”گلہا نگ“ کے نام سے چھپ چکا ہے (شعبہ ۱۹۷۰ء) اس کے علاوہ انھوں نے نظیر اکبر آبادی کا مختصر انتخاب ”اشعارِ نظیر“ کے عنوان سے کیا تھا۔ یہ کتاب بھی چھپ چکی ہے (الہ آباد)

انھوں نے اپنی زندگی میں تین کتابیں کیے۔ پہلی بیوی ان کی خالہ کی صاحبزادی تھیں۔ ان سے دو بیٹے ہوئے۔ ایک لڑکا عین عالم شباب میں بحالت جنون فوت ہو گیا، دوسرے حیات ہیں۔ اس بیوی کی وفات کے بعد دوسری شادی کی، اس کی اولاد موجود ہے۔ تیسری بیوی کی اولاد بھی ماشاء اللہ خوش و خرم موجود ہے۔

چند اشعار بطور نمونہ درج ہیں:

اللہ! یہ صنفِ کلام کیا بنا دیا | اس خاکِ راں کو حسن کی دنیا بنا دیا
سدا جلوہ لائے بوقلمون سے جہان کو | آشوب گاہِ طورِ تجلی بنا دیا
دشمنِ وحشت میں وہ اب پہلی سی رہی | موت نے مجھوں کی ادیرانے کو دیراں کر دیا

شکرۃ مسامرین

کیا بکدوشی ہوئی، شمس! میری عشق میں

بہن دی اللہ کو، دل نذر جانماں کر دیا

خزاں سے پامال ہو رہا ہے، جس جو تھا اپنی آرزو کا

جو کل بظاہر شگفتہ ہیں سب، نہیں ہے نام ان میں گم گم کا

بھلا کر دے بھلا لگا، بڑا کر دے، بُرا دیتا

اس نے کہا ہے جس نے بویا، اسی نے چاٹا ہے جس نے تھوکا

اللہ ان کی یاد اب اتنی سی رہ گئی۔ گویا کبھی لے تھے کسی مینہاں سے ہم

منزل بھی ایک ناگہی ایک اخلاق کیو؟ بس یہ کر ٹھہر گئے ہیں زرا کاراں سے ہم

کبھی ہم سے قول و قرار تھا، تمہیں یاد ہو کہ زیادہ ہو

کبھی چاہ تھی، کبھی پیاد تھا، تمہیں یاد ہو کہ زیادہ ہو

کبھی وقت گری خوں بھی تھا، کبھی جہیز زدِ جنوں بھی تھا

کبھی خوشی عہد بہار تھا، تمہیں یاد ہو کہ زیادہ ہو

بسی جنگلوں میں قرار تھا، کبھی شغلِ سیر و شکار تھا

یہیں لطفِ میل و نہار تھا، تمہیں یاد ہو کہ زیادہ ہو

تھے بہت تھا سہ بھی تھی دمِ استخوانِ رجا کوئی

یہی ایک شمس نزار تھا، تمہیں یاد ہو کہ زیادہ ہو

بہت کم ہیں جالِ روئے بلی دیکھنے والے زیادہ ہیں فقط محلِ کا پردہ دیکھنے والے

ذہنِ آدمستِ جامِ کارانی اس قدر تن کے

بہت دیکھی ہیں تقدیریں بگڑہ تی ہم مذہبِ بن کے

مزا ہے آپ روٹھیں اور مذاہنِ منتوں سے ہم

تیا مست ہے، مگر پھر روٹھ جائے آپ کا من کے

کوئی چنیا پڑے تو شمس جنگلِ نوکل جانیں

شالِ داغ ہم بھی منتظرِ بے ہیں سادہ کے

دونوں پر تسم کیوں کا، گالوں میں لائی پھولوں کر
 کچھ پھول اوجھل بھی دیتی جا، ادھیچنے والی پھولوں کی !
 بھاگن کی تیرا میں چلتی ہیں، شاخوں میں گلیاں کھلتی ہیں
 اس فصل میں جو بن رہی کھلتی ہے، دالی دالی پھولوں کی

گتوں کے اندھیرے میں روشن پھولوں کے دیے کڑا ہے
 باغوں میں منائی فطرت نے کیا خوب، دالی پھولوں کی
 اپنے بیگانے ہوئے، اسے جان جان تیرے لیے
 بن گئے دشمن زمین و آسمان تیرے لیے
 ساتھیوں نے ساتھ چھوڑا، دوستوں نے دوستی

ہو گئے اپنے پر ایسے بدگماں تیرے لیے
 کیسے ہم بیکر تھے جب تک نہ تھا تیرا خیال
 ایک آفت ہم پر آئی ناگہماں تیرے لیے
 سختیاں ساری ہمیں تیرے لیے، اسے دلر !

کھوئے سب آرام، اسے آرامِ حال تیرے لیے
 جان تک اس نے لگا دی جاہ کی بازی میں
 کچھ نہ دیکھا شمس نے سودا دیاں تیرے لیے

یاد سے دہ بد و نظر نہ ہوئی لاکھ جا تا کہ ہو، مگر نہ ہوئی
 شبِ فرقت گزری جائے گی کون سی شب ہے، جو سحر نہ ہوئی؟
 وہ طلب کیا، جو در پر ٹھہر گئی ! وہ نظر کیا، جو پردہ در نہ ہوئی؟
 وہ دہ دہ جس کے تیرے آتشِ شوق تیز تر نہ ہوئی

چاندنی کھل رہی ہے صبح میں
 شمسِ وحشی کو بھیجا خبر نہ ہوئی !

اعجاز حسین، ڈاکٹر سید

ان کے والد کا نام سید محمد شفیع تھا۔ وہ پولیس میں ملازم تھے۔ آدمی شریف اندر مسکین طبع تھے لیکن تعلیم زیادہ نہیں تھی۔ اس لیے کوئی ترقی نہ کر سکے۔ ان کے خسر سید حسین امیر اور رئیس آدمی تھے۔ اللہ آباد کے معافات کے محلہ راجا پور میں خامی جاداد کے مالک تھے۔ ان کے صرف چار بیٹیاں تھیں، نرینہ اولاد نہیں تھی۔ اسی لیے انھوں نے بیٹیوں کی شادیاں شریف لیکن غریب نوجوانوں سے کیں اور سب کو خانہ دانا کی حیثیت سے اپنے ساتھ رکھا یہی وجہ تھی کہ سید اعجاز حسین کی ولادت اپنی ناسخیاں میں ہوئی۔ انھوں نے خود لکھا ہے کہ سال کا یقین نہیں ۱۸۹۸ء یا ۱۸۹۹ء تھا، لیکن مہینا یقیناً اگست کا تھا، اور جمعہ کا دن، وقت صبح صادق تھا۔ بعد کو انھوں نے یوم آزادی کی مناسبت سے ۱۵ اگست بنا لیا تھا؛ ظاہر ہے، کہ یہ فرضی تاریخ ہے۔ اور بطریقہ یہ ہے کہ ۱۵ اگست ۱۸۹۸ء کو جمعہ تھا، نہ ۱۵ اگست ۱۸۹۹ء کو۔

سید حسین اپنے زمانے کے رئیسوں کی جملہ خوبیوں اور خامیوں سے متنس تھے۔ شرابی کہتے تھے۔ نوتی تھاقص کرتے تھے۔ بیک واسطہ ان کا سلسلہ تلمذ آتش سے ملتہ ہے۔ وہ فارسی اور عربی کے دلدادہ تھے؛ اور انگریزی کے مخالف کسی

نہم کا کام کاج کرنا دون مرتبہ سمجھتے تھے۔ آمدنی کا اور کوئی ذریعہ نہ تھا اندرون ختے سے سبب شوق پورے ہونے لگے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح تو تھارون کا خزانہ بھی ساتھ نہیں دے سکتا نتیجہ وی ہوا جس کی کوئی بھی مفقودہ پیشگوئی کر سکتا تھا۔ رفتہ رفتہ حالت اتنی کمزور ہو گئی کہ گھر کا اُجلا خرچ تک چلانا دُوبھر ہو گیا۔ کہاں کبھی روپے کی وہ بیل سیل تھی، اور کہاں اب آمدنی گھٹنے گھٹنے ۲-۲۵ روپے ماہانہ رہ گئی۔

ستیا راما رحیمین کی تعلیمی رفتار بہت سست رہی۔ گھر کے احوال کے باعث انھیں اردو اور فارسی شعر سے تو ضرور دلچسپی پیدا ہو گئی، بلکہ جلد ہی خود بھی تنگ بندی کرنے لگے، لیکن ریاضی اور اقلیدس سے ان کی جان جاتی تھی، اور دسویں درجے کی سند کے امتحان کے لیے یہ لازمی مضمون تھے۔ چنانچہ دوم ترہ ناکامی کے بعد انھوں نے کلکتے کی راہ لی، جہاں یونیورسٹی میں ریاضیات کا میاں رتبہ کم تھا اور اسی لیے یہاں سے وہ ۱۹۱۹ء میں دسویں درجے کی سند لینے میں کامیاب ہو گئے۔ اس وقت عمر عزیز ۲۰ برس سے متجاوز ہو چکی تھی۔

اس کے بعد انھوں نے میونسٹریل کالج، الہ آباد میں داخلے لیا۔ سائٹ میں بھی ایک مرتبہ ٹیل ہوتے، لیکن لگے رہے۔ آخر کار مسلم یونیورسٹی سے انٹر اور ۱۹۲۳ء میں میور کالج سے بی اے کی سند لی۔ اسی دوران میں انگریزوں کو اردو پڑھنا اور اپنے خرچ کی کفالت کرنے رہے۔ چونکہ اب سرکار کی ملازمت کے لیے عمر زیادہ ہو چکی تھی، اس لیے انھوں نے یونیورسٹی میں ایم اے (اردو) میں داخلے لیا۔ ۱۹۲۴ء میں اس شان سے یہ امتحان پاس کیا کہ اول درجے میں یونیورسٹی بھر میں اول آئے۔ اور سو روپے ماہانہ کالریسچ اسکالرشپ بھی ملا۔ جس سے مستقل آمدنی کی صورت پیدا ہو گئی اور شولش کچھ کم ہوتی۔ پھر جب ۱۹۲۶ء میں وہیں اردو کے مدرس کی جگہ نکلی، تو اس پر ان کا تعزیر ہو گیا۔

اب یہ ہر طرح مطمئن اور پرسکون زندگی گزارنے کی شاہراہ پر کھڑے تھے۔ اس میں اگر

افسوس کا کوئی پہلو نہ تھا، گو یہ کہ ان کے وہ نانا (سیّد حسین) جنہوں نے انہیں پالا پوسا ہے وہاں چڑھایا، پڑھایا، کھایا، پلا، ان کے کلام کی خاطر خود ہر طرح کی تکلیفیں جھیلیں، ان کے ملازم ہونے (۷ اگست ۱۹۲۹ء) سے پانچ بیسے پہلے (۲۱ مارچ ۱۹۲۹ء) رجسٹر فرما چکے تھے۔ انہیں اپنے چھپتے نواسے کی کامیابی دیکھنا نصیب نہ ہوئی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

سیّد تاج الدہیر رحم (دف ۱۹۷۳ء) نے اپنے بعض ہنجیال احباب کے تعاون سے ۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد رکھی تھی۔ انہوں نے اس کے قیام اور استحکام کے لیے ملک کا دورہ کیا اور جگہ جگہ اس کی شاخیں قائم کیں۔ ۱۹۳۷ء میں انہوں نے الہ آباد میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ اسی زمانے میں ان کے بعض اور ادیب دوست بھی یہیں مقیم تھے۔ ان میں ڈاکٹر ذریعہ، اے احمد (نہیں العابدین احمد) موجودہ رکن راجہ سبھا، گور محمد اشرف اور پروفیسر احمد علی کے نام زیادہ نمایاں ہیں۔ اس اجتماع کا نتیجہ یہ نکلا کہ الہ آباد میں بھی انجمن ترقی پسند مصنفین کی شاخ قائم ہو گئی۔ جلسے ہونے لگے، جہاں بحث مباحثے ہوتے، اور بڑے شہر کے ادیب حلقوں میں گویا زندگی کی تازہ لہر دوڑ گئی، عجاظ خیل بھی اسی سجنور میں پہنچ گئے، بلکہ انہیں کے سکتے بنا دیے گئے۔ ان کی کتاب ”نئے ادبی رجحانات“ اسی ماحول میں لکھی گئی تھی۔

۱۹۲۸ء میں ایم اے کی سند لینے کے بعد انہوں نے پی ایچ ڈی کے لیے ایترج میں داخلہ لے لیا تھا۔ موضوع مقالہ تھا: ”اردو شاعری پر تصوف کا اثر“ لیکن خطا معلوم کیوں، مقالہ پیش نہیں کیا۔ بہر حال وہ ڈاکٹریٹ کی سند کے بغیر ہی کام کرتے رہے۔ دس بارہ برس بعد انہوں نے ڈی لٹ کی سند لینے کی سٹافنی اور مقالہ بعنوان ”مذہب و شاعری“ تیار کیا، ہندوستان کی تمام یونیورسٹیوں میں اردو موضوع پر ڈی لٹ کی سند لینے والے وہ پہلے شخص تھے۔

ڈاکٹر اعجاز حسین یونیورسٹی میں بحیثیت لیکچرر ۱۹۲۹ء میں آئے تھے۔ وہ مدتوں

اسی جہد سے پر رہے، پھر ریڈ مقرر ہوئے اور بالآخر پانچ چھ برس پر و فیروزہ کے بعد یکم مئی ۱۹۶۱ء کو ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔ اس کے بعد یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی طرف سے انھیں پانسو روپیہ مہینہ کا تحقیقی وظیفہ عطا ہوا اور وہ شاعری کا سماجی پس منظر "اس وظیفہ کا قیمتی نتیجہ ہے۔

اگرچہ صحت عام طور پر اچھی رہی، لیکن عمر کے ساتھ ضعف قواء و ہمتی عمل ہے، جس سے سفر نہیں۔ ۱۸ فروری ۱۹۷۵ء کو ایک طاعون کے پی ایچ، ڈی کے امتحان کے سلسلے میں مظفر پور (بہار) گئے تھے، وہیں دل کا شدید دورہ پڑا علاج معالجہ ہوا لیکن میسورہ۔ یوں اپنے اعزہ اور خاندان سے دور پریس میں اتوار ۲۳ فروری ۱۹۷۵ء کو جان بحق ہو گئے۔ لاش الہ آباد آئی اور شوکت نگر کے نواح میں سرستی گھاٹ کے قریب، اپنے ناصیالی قبرستان میں دفن ہوئے۔ ان کی مندرجہ ذیل کتابیں رشائع ہو چکی ہیں (۱۶): ایکہ معرفت (۲۱) مختصر تاریخ ادب اردو (۳) نئے ادبی رجحانات (۱۹۶۲)؛ (۴) مذہب و شاعری؛ (۵) ملک ادب کے شاہزادے؛ (۶) اردو ادب آزادی کے بعد؛ (۷) ادب و ادیب؛ (۸) حیاتِ ستیانا و حضرت سید طاہر سیف الدین مرحوم؛ (۹) ادبی ڈولے؛ (۱۰) میری دنیا (۱۹۶۵)؛ (۱۱) اردو شاعری کا سماجی پس منظر وغیرہ۔ ان کے علاوہ کچھ کتابیں ہندی میں بھی ہیں۔

وہ ابھی طاعون تھے جب ان کے نانائے انھیں روز افزوں آوارگی اور تماشینی سے بچانے کی خاطر ۱۹۲۲ء میں ان کی شادی کر دی تھی۔ ان سے آٹھ بچے ہوئے، پانچ لڑکے اور تین لڑکیاں۔ مجددِ تعالیٰ سب خوش و خرم ہیں۔ جیسا کہ کچھ چکا ہوں، ان کے نانا مرحوم شعر کہتے تھے۔ گھر کے کتابوں کا مقول ذخیرہ تھا۔ آغاز میں ماحول بھی رنگین اور شعر انگیز تھا۔ اسی لیے وہ بہت اوائلی عمر میں شعر کہنے لگے، انھیں اعجاز تھا۔ بہت دن تک نانا آباہی سے اصلاح لی لیکن جب وہ بصارت سے محروم ہو گئے، انھوں نے اپنے میور سنٹرل کالج کے

اسٹنٹ پروفیسر (عربی و فارسی) شیخ مہدی حسن نامہری کا وامن سخا۔ ان کی ادبی تربیت میں شیخ صاحب موصوف کا بہت ہاتھ تھا۔ دیوان آج تک شائع نہیں ہوا۔ بطور نمونہ چند شعر ملاحظہ ہوں جو ان کی بیاض سے حاصل کیے گئے ہیں۔

جلد بیدل نے فشر غم کو رگب جاں کر دیا
در دکھ اس طرح اپنا پاکہ درماں کر دیا
پیکر ہستی میں اک دھبہ سا سخا میرا وجود
ذوقِ جینابی کے صدقے جس نے فناں کر دیا
موجِ غم سے داد کیا ملتی، دلِ برباد کی
میں لے خود، اعجاز! ہر قطرے کو طوفاں کر دیا

سفر حیات بھی ختم ہے، کہیں زندگی کا نشان نہیں
ابھی ادا تھم کے میں دیکھتا میرے بس ہیں عمر و مہل نہیں
میرے دل کی ہیں یہ کہانیاں جو بھر گئی ہیں یہاں وہاں
یہ چین میں لالہ و گل نہیں، یہ فلک پہ گہکشاں نہیں
نہ وہ بنگرہ میں کہیں ملا، نہ حرم میں اس کا پتا چلا
یہ اب اشرافِ شکست ہے، یہ جس نہیں، یہ نواں نہیں
دل و جاں کے بدلے میں کیا ملا، یہ سوال اہلِ ہوس سے کر
کہ میرا عشق عالم کیسے ہے، یہ دیار سود و زیاں نہیں
میرے ٹوٹے دل کو نو کیسے کرے غنہ غنہ بنا ہے دل
میری عمر بھر کا ریا خاں ہے جو یہ آشنا نے فغاں نہیں

خدا ہی جالے، اب اس دل کا حال کیا ہوگا
کہ اس غریب کو مرنے کی سبھی خوشی نہ رہی

بہاریسی، کہاں کی خزاں، خدا جانے
 خیالِ دید میں کچھ فسکو نہ گئی نہ رہی
 ہمیں بخود ملائک نے یوں کیا برباد
 کہ بزمِ خاص میں کچھ قدر بندھی نہ رہی
 غمِ دواں پہنچ آیا علمِ جاناں کے قریب
 آخر آہی گیا آہِ مہِ تاباں کے قریب
 یہ تیری یاد ہے، یا دردِ محبت کی غلکس
 اک کسک ہوتی ہے وہ رگِ رگِ جاںِ قریب
 اب جیواں نے کیا، زوقِ فنا سے محروم
 وہ نہ یہ خطر بھی ہوتے کہیں انساں کے قریب
 ابھی ہے زخم کا احساس، فکروں مرہم ہے
 ہنوز منزلِ اقل ہے، غم فقط غم ہے
 تارِ غم بھی نہ لٹ جائے اس اندھیرے میں
 چراغِ راہِ محبت میں روشنی کم ہے
 نہ کوئی ربط، نہ ترتیب، بزمِ انجم کی
 مگر غزل کی طرح دلکش و منظم ہے
 نہ لکھا، نہ لکھا کسی کو روزِ ابد
 مگر صحیفۂ عالم کا اک ورقِ گم ہے
 خللِ دماغ کا ہویا سکونِ طے، اعجاز!
 یہ عشق جو بھی ہو، وجہِ قیامِ عالم ہے

ننگا ہوں کالمنا تو پل بھر سے کم سمجھا
 وودت مگر جا وداں ہو گئی ہے

کھنڈ زمین تابہ افلا — پہنچی
بلندی کی پستی عیاں ہو گئی ہے
ہمہ نامرادی، ہمسہ ز ندر گمانی
محبت بھی اک داستان ہو گئی ہے

اپنی پیغم کی وفات پر جو رثیہ کہا تھا، اس کا پہلا بند ہے :

یا دایا ہے کہ جب سوداے بیش و کم نہ سقا
دامنِ عجب جوانی آنسوؤں سے نم نہ سقا
عالمِ شعر و شباب و مجمعِ احباب میں
زندگی کا راستہ سیدھا تھا، بیخ و خم نہ سقا
ذہن کی تکیل ان ہاستوں میں تھی، جن کے لیے
کاسۂ علم و ہنر بھی جامِ جوئے سے کم نہ سقا
گردشِ آیام کی اس چلچلاتی دھوپ میں
کاروانِ شوقِ لطفِ اندوز تھا، برہم نہ سقا
مٹھنی حالات بن جاتی تھی، پیغامِ حیات
راہ کا پتھر عسائے موسوی سے کم نہ سقا
اس فغائے جانفزا میں ایک تبدیلی ہوئی
چادرِ یکسانیت پر چڑھ گیا رنگِ دہائی

شفقت کاظمی، سید فضل الحسن

یہ خاندان اہل تشیع کے امام ثامن حضرت امام رضا علیہ السلام کا نام لیا تھا جب ۱۲۱۳ھ میں امام رضا کا انتقال ہو گیا، تو ان کے اخلاف عراقی نے نکل بکھرے ہوئے جہے جہاں جگہ ملی، اس نے وہاں پناہ لی شفقت کے اسلاف بھی کابل، غزنی سے ہوتے ہوئے اگر شمال مغربی سرحدی صوبے میں بس گئے۔ یہاں ان کا قیام مدتوں مختلف مقامات پر رہا۔ ایک زمانہ بعد پیر ایک شاخ نے وہاں سے بھی نقل مکان کیا، اور آکر ڈیرہ غازی خان (قدیم) میں رخت سفر مکمل دیا۔

جناب فضل الحسن شفقت نے اپنے نام کے ساتھ کاظمی کی نسبت حضرت امام رضا کے والد حضرت موسیٰ کاظم (امام ہفتم) کے باعث اضافہ کی تھی۔ بلکہ وہ کاظمی کبھی کبھی بطور خالص بھی استعمال کرتے رہے۔ ۱۳۵۵ھ فروری ۱۹۱۳ء کو ڈیرہ غازی خان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام سید علی تھا سید جزو علم ہے، وہ پولیس میں ملازم تھے اور آخر تک سی ٹکے سے منسلک رہے۔ لطیفہ یہ ہے کہ بہت کم لوگوں کو معلوم

سے قدیم اس لیے کہ موجودہ شہر نیا ہے۔ پرانا شہر دریائے سندھ کے ۱۹۰۰ کے سیلاب عظیم کی نذر ہو گیا۔ یہ شہر اس کے بعد وجود میں آیا۔ پھر انے شہر کی نشانی چھاؤنی رہ گئی تھی، دریائے سندھ سے اندیشہ ہے کہ یہ بھی اب کچھ ہی دن کی مہمان ہے۔

تھا کہ وہ پولیس میں ہیں۔ گھر سے اپنے روزمرہ کے معمولی کپڑوں میں تنہا نکلتے جاتے اور وہاں پہنچ کر وردی پہن لیتے۔ کام کے بعد سے وہیں چھوڑ آتے اور اپنے ذاتی لباس میں مکان پر آ جاتے۔ بیفرملش اور مرخانہ رینج آدمی تھے۔ محرم کی مجلسوں میں بڑے ذوقی و شوقی سے شرکت کرتے، اور بعض اوقات اس کے لیے خاصی لمبی مسافت طے کرنے جاتے۔ ۱۹۴۵ء میں انتقال ہوا۔ اور کربلا سے قبرستان عالمی والا ڈوبہ غازی خان میں دفن ہوئے۔

شفقت صاحب نے صوبوں و سب تک تعلیم پائی۔ اسکول میں جو کچھ پڑھا، وہ اپنی جگہ، لیکن اس کے علاوہ انھوں نے ذاتی طور پر اردو اور فارسی ادب کا اور اس میں بھی شعرا کا مطالعہ خاص طور پر کیا۔ انھیں بیشمار شعر یاد تھے، جن سے نہ صرف شعر گوئی میں مدد ملی، بلکہ وہ علمی اور ادبی مجلسوں کی بھی گریبا جان بن گئے۔

جن تعلیم پر کسی ابھی ملازمت کی کیا توقع ہو سکتی ہے۔ بارے، گھر میں قناعت اور توکل کا ماحول تھا۔ والد کی پنشن ۱۲ روپے مہینہ تھی۔ ان کی والدہ کڑھائی کا کام بہت اچھا جانتی تھیں۔ اڑوس پڑوس کی عورتیں انھیں کپڑے کڑھائی کے لیے رتی رتی تہی تھیں۔ اس طرح بسر اوقات ہو جاتی تھی۔ بہر حال تنگ دستی کا زمانہ تھا۔ اب شفقت نے مقامی انڈسٹریل سکول میں داخلہ لے لیا۔ اور وہاں بڑھتی کالام، خاص کر فرنیچر جانا سیکھ لیا اور اس طرح بیسے میں پندرہ بیس روپے کی یافت کا سامان ہو گیا۔

اسی زمانے میں وہ مرگی کے موزی مرض میں مبتلا ہو گئے۔ مدتوں اس کے دورے پڑتے رہے۔ مگر زما و عارض سے کوئی بارہ برس بعد اس سے چھٹکارا ملا۔ لیکن اس کا آخر زبان کی خفیف سی لکنت کی شکل میں آخر تک سداۓ وہ رہا اور ڈیٹیکٹک طرح سے نہیں ادا کر سکتے تھے۔

اب وہ مقامی میونسپل کمیٹی میں چہرہ اسی مقرر ہو گئے۔ سب افسران کے کام سے بہت مطمئن تھے۔ چہیکہ یہ لکھنا پڑھنا جانتے تھے، اس لیے انھیں ترقی دے کر محرز چنگی

بنادیا گیا۔ جب ملک تقسیم ہوا ہے تو اس کے بعد وہ ریکارڈ کیس مقرر ہو گئے اور اسی جگہ سے سبکدوش ہوئے۔ اپنی معمولی تنخواہ کے علاوہ انھیں کمیٹی کے تمام اجلاسوں کی کارروائی قلمبند کرنے کا خاص وظیفہ تیس روپے مہینہ الگ ملتا تھا۔ تنخواہ کے ساتھ اسے ملازمتی ترشی سے بسر اوقات ہو جاتی تھی۔ آخری پیام میں انھیں ایک افسوسناک خبر پہنچا، کمیٹی کے نئے منتظم ایک ایسے شخص مقرر ہو کر آئے، جو ان سے ہر قسمی بات پر ناراض ہو گئے۔ انھوں نے جاوید کا انھیں دق کرنا شروع کیا۔ بات بات پر فائنٹ ڈپٹ اور دوسکی ان کا معمولی دطیرہ ہو گیا، اور بالآخر اس شخص نے ان کی تنخواہ میں سالانہ اضافہ بند کر دیا۔ شفقت نے محسوس کر لیا کہ اب خودداری کا خون کیے بغیر یہاں رہنا ممکن نہیں۔ اس پر انھوں نے مقررہ میعاد سے تین سال قبل پنشن کی درخواست دے دی اور نوکری سے الگ ہو گئے۔

شفقت نے شعر گوئی بعمر ۱۸ سال ۱۹۳۳ء میں شروع کی۔ ابتدائی مشق کے بعد انھوں نے مولانا حسرت سہانی (ف: مئی ۱۹۵۱ء) سے درخواست کی کہ انھیں شاگر کی میں قبول کر لیں۔ نچانے کیوں، انھوں نے یہ درخواست منظور نہ کی۔ اس پر انھوں نے پہلے فیض احمد فیض جعفری سے رجوع کیا۔ ندیم ڈیرہ غازی خان ہی کے رہنے والے ہیں ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوئے۔ عمر سب کو آپریٹو تحکے میں ملازم رہے۔ افسر حدیقی اور دہوی کے شاگرد ہیں۔ ایک مجموعہ کلام "خانہ زنجیر" شائع ہو چکا ہے۔ بفضلہ بقید حیات ہیں۔

شفقت نے ندیم کے علاوہ صادق ایتوبی (حاجی محمد) سے بھی مشورہ کیا تھا صادق ۱۹۰۸ء میں ڈیرہ غازی خان میں پیدا ہوئے۔ شعر خاصا کہہ لیتے تھے۔ لیکن ان کا اصلی کام افسانے کے میدان میں ہے۔ انھوں نے انگریزی سے پو پ کا مختلف زبانوں کے بلا مبالغہ بیسیوں افسانوں کا ترجمہ کیا۔ میاں بشیر احمد دم برہا یوں ان کے بڑے قدر دان تھے، چنانچہ صادق کے دونوں افسانے ہمایوں میں شائع ہوئے۔ معلوم نہیں کیوں، انھوں نے ۱۹۳۲ء میں ادبی میدان ترک کر دیا۔ اور خزانہ

نویسی کا پیشہ اختیار کیا۔ قانون کی پیچیدگیوں کو خوب سمجھتے تھے۔ اس پیشے میں بہت کمایا اور خوشحال زندگی بسر کی۔ ۱۹۷۴ء میں انتقال ہوا۔ شفقت نے چار برس کی مشق کے بعد ۱۹۳۰ء میں دوبارہ حسرت سے اصلاح کی خواہش ظاہر کی۔ اب کے انھیں کامیابی ہوئی، اور حسرت نے ان کی درخواست منظور کر لی۔ حسرت کی وفات تک وہ ان سے مطورہ کرتے رہے اس کے بعد ہمیشہ اپنے نام کے ساتھ خاک پائے حسرت موبانی لکھتے رہے۔

شفقت شروع میں نظم اور غزل دونوں کہتے تھے۔ لیکن حسرت کی شاگردی کے بعد غزل کے لیے وقف ہو کر رہ گئے۔ ان کے کسی مجموعے شائع ہوئے۔ بالکل ابتدائی کلام ان کے دو کتوں نے "نغمہ ناسیڈ" کے نام سے چھاپا تھا۔ یہ نو دیکھنے کو نہیں ملا۔ بعد کے مجموعے، حسرتکدہ (منظر گر طبع ۱۹۵۸ء)، نغمہ حسرت (منظر گر طبع ۱۹۵۹ء)، وادی حسرت (لاہور ۱۹۷۰ء)، نازخ حسرت ملتے ہیں۔ بہت نختہ کلام ہے۔ غزل کی تمام خصوصیات ان کے کلام میں بدرجہ وافر ملتی ہیں۔

ابتدائی میرالحمالی کے باعث صحت ہمیشہ خراب رہی۔ ۱۹۶۱ء/۶۹۴۲ء میں ذیابیطس کا گھلا دینے والا مارشل لاجی ہو گیا اور آخر تک وبالِ جاں رہا۔ جون ۱۹۶۳ء میں دل کے مریض میں مبتلا ہو گئے۔ جیسے یہ تمام عوارض کافی نہ ہوں، اواخر ۱۹۷۳ء میں جسم کے باقی حصے کو فالج نے بیکار کر دیا اور وہ مستقلاً صاحبِ فراش ہو گئے۔ حکومت نے توجہ کی اور انھیں علاج کے لیے مقامی اسپتال میں لے گئے۔ وہیں مارچ ۱۹۷۵ء کو فالج کا ذہنی طرف حملہ ہوا، جس سے ہوش ہو گئے۔ اسی حالتِ نحس میں ۱۲ مارچ ۱۹۷۵ء کو ظہر کے وقت روحِ نفیسِ عنقریب سے پرواز کر گئی۔ چونکہ یہ ۲۸ رجب تھی، اس لیے اسے مبارک خیال کرتے ہوئے اسی شام انھیں اپنے والد کے حواریں (دکڑے ٹالھی والا میں) سپردِ خاک کر دیا گیا۔

کئی اصحاب نے قطعاتِ تاریخ کہے۔ سید ندا بخاری نے "مرگِ دلخراش" سے تاریخ نکالی (۱۳۹۵ھ) عیسوی تاریخ میں سید چراغ علی شاہ آزاد نے یہ قطعہ

لکھا :-

توڑی گردوں نے ہم پہ یہ کیا جفا ہاں ہے ! سینہ اپنا ہے ، اور حرکتِ فضا ہاں ہے !
 اٹھ گئی رسمِ اخلاصِ دل زمانے سے بھو گئی شمعِ غمناکِ وفا ، ہاں ہے !
 شاعر بے بدل ، قادر الکلام ادیب ! نغمہ گئی نغمہ منج و سخن سرا ، ہاں ہے !
 تاجدارِ غزل ، سخا بشیوہ حسرت ہر سدا خود کو سمجھا وہ خاکِ پا ، ہاں ہے !

نغمہ گئی تاریخ پر آتی یہ ندا ، آزاد !

شیخ شفیقت کاظمی جیلا ، ہاں ہے " (۱۹۷۵ء)

شفقت کی شادی اپنے چچا سید جند و شاہ کی بیٹی سکینہ بی بی سے ہوئی تھی سید جند و شاہ پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر تھے۔ دونوں حکومت کی ملازمت کی۔ اس سے سبکدوش ہوئے ، تو اپنا مطب جاری کر لیا۔ اس سے اچھی خاصی آمدنی ملتی تاہم اسایش کی زندگی گزاری۔ شفقت کی جسمانی اولاد صرف ایک لڑکا غیب الحسن رضوی ان سے یادگار ہے۔ انھوں نے بی بی سے لگا تب لہجہ پاتی ہے۔

کافی ہے اپنے رفیع ترود کے واسطے

ان کی نہیں بھی عرضِ وفا کے جواب میں

ہزار ہو سکے نہ تری آرزو سے ہم

ستھی شانِ افتخار جو ترے اجتناب میں

دلیپیاں بہت اول مرحوم ! تجھ سے ستیں

جب تو نہیں ، تو رونقِ بزمِ جہلی نہیں

تجھ سے بچھڑ کے ، سب کی نظر میں ذلیل ہیں

تو ہر ہاں نہیں ، تو کوئی مہر ہاں نہیں

مغنیہ میں لکھی تھی باہم جدائی نہ تم ہو غاہوں نہ ہم جو غاہیں

بہر وہی گئے دن زندگی کے تجھے کیا ، شاید اشارتے ہم

اسباب اور بھی مری بربادیوں کے تھے
 کیا جانے کیوں زبان پہ ترا نام آگیا
 بات جب بڑھ گئی تو کیا کرتے تھے ہم کو یا راتے اختصار نہ تھا
 بڑے مزے میں گزرتی تھی زندگی شفقت !
 خوشا وہ عہد کہ ان سے نہ سختی سنا سائی
 سرگزشتِ حیات کیا کہنے ! خیر، ابھی بُری گزر رہی گئی
 بات اپنی وفا کی جھوٹ نکلی آخر میں تری جفا سے ہارا
 ببول روئیں وہ تری دشمنی کو جن کو تری دوستی نے مارا
 کچھ اور بھی آسے تھے، لیکن جب وقت پڑا، تجھے پکارا
 تری نگاہ تو اپنی سختی بے سبب جھوٹ پر یہ اور بات ہے کہ مجھ کو فریب کھانا تھا
 ایفلے عہد کرنے سکے وہ، تو کیا ہوا
 خود اپنی زندگی کو بھی ممکن تھا ثبات
 باغ پر اپنا بھی کچھ حق تھا، مگر باغ میں جب تک نہ آئی تھی بہار
 خوش ہو کے سہ رہا ہوں تری ہرجا ہنوز
 ثابت نہیں اگرچہ کچھ اپنی خطا ہنوز
 وہ ایک درد جس نے بنا دی ہے جان پر
 وہ ایک دردِ جان سے پیارا ہے آج تک
 گزری ہے نفس میں عز، لیکن سمجھ لے نہیں یادِ اشیاء ہم
 کچھ میں نہ چلا تری جفا پر دیکھا کیے سوئے آسمان ہم
 اپنی قسمت تھا وارغِ رسوائی کیا کریں اب تجھے ہشیاں ہم !
 سب کا مقصود ذکرِ مخا تیرا جتنے تھے تجھے سناتے ہیں
 کیا ختم سفر پر یاد کرتے گزریں جو مصیبتیں سفر میں
 ہر ماہ سے بے نیاز ہو کر لوٹ آتے ہیں تیری راہ میں

علم ڈھائیگی، کہاں تک دنیا! کہیں اپنا بھی خدا ہے کہ نہیں؟
 جن کو تیری نگاہ بھول گئی اب کوئی ان کو پوچھتا بھی نہیں

تھکا دیا ہے زمانے کی گردشوں نے بہت

تیری نگلی میں اجازت ملے، تو دم لے لوں

زمانہ دیکھ چکا ہے مری دنیا کا مآل

کسی پر اب نہ چلیگا تیری نظر کا فسون

جب سزا وار غم بھی نہ سمجھ گئے ہم کریں اور امید کیا آپ سے!

آج حیراں ہیں یوں، آپ سے مل کے ہم جیسے اب تک نہ تھے آشنا آپ سے

اس نہاں سے نرا گلا کیوں ہوا جس زباں سے تیری ثنا کی ہو

برودھو کے یہ سال بھی گزرا اب کے بھی پھرے ندن ہمارے

خود ہی ان تک جا پہنچے ہم قاصد سے کہہ گئے کہتے

تیری اولے کرم، لاکھ دلفریب سہی

مگر وہ دل جو تری بے رخی پر مرتا ہے

جب اٹھ کے آگئے ہیں، تو اب اس سے کیا غرض

ہم بھی کبھی تھے آپ کی مغل میں، یا نہ تھے

کیا کیا ہوا ہے ترکِ محبت پر انفعال

آئی ہے تیری یاد جو سب ناکہاں نے

جیسے ہی ہوس وہ کیا کر چکا مرنے کو بھی جو ترس رہا ہے

جفا لے خاص کے لائق بھی کو ٹھیرایا

اب اور اس کے سوا کیا کرے دنیا کوئی!

کسے خبر کہ حدیث جہاں کے پردے میں

خود اپنے غم کا فسانہ سنا گیا کوئی

ایسے بچلے تری انجمن سے کہ ہم عمر سب کے لیے بے شکا نا ہوتے

جو ریہیا کے لائق تو سمجھا ہمیں

اتنی امید بھی تھی کہاں آپ سے

یاد کرنے پر بھی یاد آتا نہیں

کس گڑھی ہم لے گئے کہاں آپ سے

ان کا خیال، ان کا تصور ہے آج تک جن سے کہیں لے نہ کہیں جن سے بات کی

لگتا ہے یوں کہ جیسے ابھی دل کی دل میں ہے

حال آں کہ ان سے قصہ غم بار بار کہتا

شمس کرمانی، شمس الدین حیدر

اگرچہ اعظم گڑھ یوپی کا قصبہ کرمان آبادی وطن متحالیکن ان کی ولادت ۸ جون ۱۹۱۳ء (۲ رجب ۱۳۳۱ھ) کو اپنی ناسخیاں پاسہ (ضلع غازی پور) میں ہوئی۔ کرمان کے سادات حضرت میر شمس الدین عرف میر شمس (ف: ۱۰۶۰ھ) کے نام سے وابستہ ہیں میر شمس کا اپنے زمانے کے مشہور صوفیہ اور اہل اللہ میں شمار ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی میں سات گج پیادہ پائے تھے۔ اس علاقے میں ان کی کرامات کے وسیوں قصبے زبازو خاص و عام ہیں۔ اسی لیے جب یہ پیدا ہوئے، تو ان کے والد سید محمد اختر نے بلور قباؤل ان کا نام شمس الدین حیدر رکھا، گھر میں پیار کا نام شمسو تھا۔ ان سے عین بڑے بھائی تھے، علی بخش غصنفز، اعظم حسین، حسام الدین حیدر۔ ایک بھائی علی حیدر، اور ایک بہن زہرا خاتون ان سے چھوٹے تھے۔

جب تعلیم کی عمر کو پہنچے، تو اس زمانے کے دستور کے مطابق بسم اللہ گھر پر پڑھائی جب یہ مرحلے ہو گیا، تو انھیں بڑے بھائی سید علی بخش غصنفز کے پاس گورکھ پور بھیج دیا گیا، جو وہاں ملازم تھے۔ وہاں کچھ پڑھا لکھا ہو گا۔ لیکن گورکھ پور کا قیام بہت مختصر رہا، جلد ہی وہاں سے واپس آکر انھوں نے رشید عربی اسکول فیض آباد میں داخلہ لے لیا۔ اس مدرسے میں دینیات کی رسمی تعلیم کے علاوہ عربی اور فارسی پڑھانے کا خاص انتظام تھا۔ چنانچہ یہاں انھوں نے عربی اور فارسی

کی تعلیم پائی اور اس سے یونیورسٹی کے مولوی اور کامل کے امتحان بھی پاس کیے۔ اس زمانے میں انھوں نے انگریزی نہیں پڑھی۔ یہ کمی انھوں نے بہت دن بعد پوری کی۔ پہلے دسویں کی سند حاصل کی اور پھر انٹر کی۔ اپنی منصبی سروفیتوں کے باعث بی اے کے امتحان کی تیاری نہ کر سکے، اور اس کمی کا احساس انھیں آخر تک رہا۔

دہلیہ عربی اسکول سے فارغ ہونے کے بعد انھوں نے ڈی اے وی ہائی اسکول، اعظم گڑھ میں ملازمت اختیار کر لی۔ یہاں وہ فارسی اور اردو پڑھاتے تھے۔ مقررہ تنخواہ تلیل تھی، اور جو کچھ واقعی ملتا تھا کوہ تلیل تر تھا، اور ستم یہ کہ اس کی بھی مفت پر ادائی ہمیشہ فریقینی رہتی۔ یہ صورت حال کسی عنوان اعلیٰ کی بخش نہیں تھی۔ بالآخر انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ مدنی کو خیر باد کہہ کر کوئی اور پیشہ اختیار کیا جائے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب ہندوستان کی صنعت و فلسفہ سازی روز افزوں ترقی کر رہی تھی اور ہمارے بیشتر شاعر اور ادیب اس سے منسلک ہو گئے تھے۔ سب اعظم گڑھ کے قیام کے زمانے میں ان کا تعارف ماسٹر سید منور حسین رضوی سے ہو گیا، جو وہاں کے سماجی حلقوں میں خاصی معروف اور ذی اثر شخصیت تھے۔ سید منور حسین کے ایک بھائی سید شوکت حسین رضوی فلمیں بناتے تھے، مشہور ملکہ ترنم نور جہاں ان کی پوری تھیں۔ سید شوکت حسین نے شمیم کو مشورہ دیا کہ وہ ان کے ساتھ لاہور چلیں، اور نچولی کچر کی فلموں کے لیے گانے لکھیں۔ یہ مدنی سے اور تلیل آمدنی سے تنگ تو ابھی چکے تھے؛ کچھ ان ادیبوں کی اچھی اوقات ان کا سامنے تھی، جنھوں نے فلم کی ماہ اختیاری تھی، کچھ سید شوکت حسین نے بھی ہنر باغ دکھائے، انھوں نے لاہور جانے پر آمادگی کا اظہار کر دیا۔

وہ لاہور پہنچے، اچند فلموں کے لیے گانے لکھے۔ اپنے مخصوص خاندانی ماحول کے زیر اثر وہ موسیقی پہلے سے جانتے تھے اور اس کے بنیادی اصول سے انھیں اچھی

واقفیت تھی، فلموں کے لیے یہ علم بہت مفید ثابت ہوا۔ بلکہ اس میں اور گہرائی پیدا ہو گئی، آواز سنی بہت اچھی تھی۔ یہ سب باتیں بعد کو مشاعرہ بازی کے طور پر بہت کار آمد ثابت ہوئیں۔ لیکن اصغین فلم کا خالص کاروباری ماحول اس نے آیا، ماحول نے گہری زمینداری دیکھی تھی، اگر چہ ان تک آنے آتے وہ رئیسانہ سخاوت باٹ سب ختم ہو چکا تھا، تاہم ابھی رستی کا بل نہیں گیا تھا، غرض کہ جلد ہی ان کا دل اچاٹ ہو گیا اور وہ واپس اعظم گڑھ چلے آئے۔

اعظم گڑھ میں اب ڈی لے وی اسکول کی وہ پہلی نوکری ان کی دسترس سے باہر تھی کیونکہ ان کی غیر حاضری میں وہاں اور انتظام ہو چکا تھا۔ اس کے علاوہ اب ان پر روتی کی کشش غالب آنے لگی، جو اردو، فارسی علوم کا بہتر مرکز تھا۔ انھوں نے بعض دوستوں سے اپنی خواہش کا اظہار کیا اور کوشش کرنے سے انھیں ۱۹۵۰ء میں اینگلو عربک ہارس بیکنڈری اسکول میں فارسی کسٹڈین کی جگہ مل گئی۔ وہ اپنی وفات کے وقت اسی ایسا ہی پر مشکن تھے۔

اصغین اختلاج قلب کا عارضہ بہت دن سے تھا، تو تم کے بھی شکار تھے، اسی باعث اکیلے سفر کرنے سے بالعموم اجتناب کرتے، کوئی نہ کوئی دوست یا ان کا اپنا بچہ ان کے ہمراہ جاتا۔ اس کے باوجود اس کا سان گمان بھی نہیں تھا کہ انجام اتنا قریب ہے۔ ۱۸ مارچ ۱۹۷۵ء شام کے وقت وہ ایک مقامی مشاعرے میں شریک ہوئے۔ وہیں طبیعت بگڑ گئی اور بیہوش ہو گئے۔ فوراً قریب کے اردن اسپتال میں پہنچا دیے گئے۔ معاینے پر تشخیص ہوئی کہ دماغ کی انس پھٹ گئی ہے۔ اگلے دن (۱۹ مارچ) صبح ساڑھے سات بجے بیہوشی کے عالم ہی میں جان بحق ہو گئے۔ جنازہ اسی شام اسٹا اور ان کی خواہش کے مطابق جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر کے قبرستان میں دفن کیے گئے۔ ”إِنَّا لِلّٰہِ وَإِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ۔“ ان کا جناح ۲۰ جنوری ۱۹۷۵ء کو نگرام کے میر حسن مسکری صاحب کی بڑی صاحبزادی کاظمی بیگم سے ہوا تھا۔ پرنسپل سر سید احتشام حسین (رحم) (ف: ۱۹۷۲ء) ان کے

ہزاف تھے۔ دونوں بڑا تیں ایک ہی دن گئی تھیں۔ بڑی بہن شمیم کے عقد نکاح میں آئیں اور چھوٹی ہاشمی ہانوی سیدہ احتشام حسین کے شمیم نے تین صاحبزادے اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔ سیدہ حسین اختر (عرف مراد) سیدہ بابر اختر (عرف حماد) اور سیدہ بابر اختر (عرف سلمان)۔ ان ناموں میں اختر کا لاحقہ شمیم مرحوم کے والد سید محمد اختر کی نسبت سے ہے۔

ان کے گھر کا ماحول علمی اور ادبی تھا۔ والد شاعر تھے؛ اختر ان کا تخلص تھا۔ بڑے منجیل سبائی اعظم حسین کا تخلص اعظم تھا۔ جکیم زکی حسین اور ان کے دونوں چھوٹے سبائی سید احمد علی، احمد اور سید محمد علی رساسب شاعر اور رشتے میں ان کے چچا ہوتے تھے۔ غرض ان کے بچپن میں ان کے ارد گرد شاعری کا چرچا تھا۔ اس کا اثر ہونا ہی چاہیے تھا، یہ بھی کسی میں کلمہ بندی کرتے تھے۔ خاندان کی مذہبی روایت کے باعث شروع میں سوز خوانی پر بھی توجہ رہی اور خود بھی سلام اور نوحے سمجھتے رہے۔ بعد کو غزل اور نظم کو ترجیح دینے لگے۔ چندے آرزو لکھنوی (دف: اپریل ۱۹۵۹ء) سے اصلاح لی۔ لیکن چونکہ اس زمانے میں ان کا رجحان نظم کی طرف زیادہ تھا، اس لیے آرزو سے استفادہ بہت محدود رہا۔

ان کی شاعری کا آغاز ہماری سیاسی تحریک کے متوازی رہا۔ اس دور میں ان پر جوش ملیح آبادی کا بہت اثر تھا۔ انھوں نے بھی سیاسی نظمیں لکھیں جن کا مجموعہ ”نیکو روشن اندھیرا“ کے عنوان سے چھپا۔ (۱۹۴۳ء) اس کا ساما خسرچ رفیع احمد قدوائی مرحوم (دف: اکتوبر ۱۹۵۳ء) نے اپنی جیب سے دیا تھا۔ ان کے بعض دوسرے شعری مجموعے یہ ہیں: ”برقی و باران“ (مطلوبات)، ”عکسِ گل“ (لکھنؤ: ۱۹۶۳ء)، ”حرفِ نیم شب“ (دلی: ۱۹۶۲ء) جانِ برادر (دلی: ۱۹۶۳ء) پروفیسر احتشام حسین کا مرقعہ، صبحِ فاران (دلی: ۱۹۶۲ء) انھوں نے پختہ جواہر لال نہرو مرحوم (دف: مئی ۱۹۶۳ء) کی فرمائش پر جنگِ آزادی کی منظوم تاریخ ”تلاشِ بحر“ کے عنوان سے لکھنا شروع کی تھی۔ اس کے متعدد ابواب موقت اشیاء جراثیم

شاٹ ہوئے تھے، لیکن انہوں نے نظم مکمل نہ ہو سکی۔ اور بھی معتد بہ غیر مطبوعہ کلام موجود ہے۔

ان کا کلام بید نچتہ اور بلیغ ہے، اس لیے بجا طور پر ان کا اس دور کے نصفِ اول کے شعراء میں شمار ہوتا تھا۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

برباد ہی لیکن، برباد غمِ دل ہوں _____ آنکھوں سے لگا لچکوں، گردِ درمِ منزل ہوں

جشنِ حیات ہو چکا جشنِ مہمات اور ہے

ایک براتِ آپچی، ایک برات اور ہے

ان کو شمیم! کس طرح نامہ آرزو لکھیں

لکھنے کی بات اور ہے، کہنے کی بات اور ہے

گراستخام، نہ ٹوٹا تھا کوئی آیینہ _____ شکستِ دل کی سہلا آپ کو خبر کیوں ہوا

کہیں نہ روٹنے والے بھی روٹ جاتے ہیں یہ بات پیار میں ہوتی تو ہے، مگر کہیں ہوا

دل سے شمیم! گفتگو، دیکھیے کب ملک چلے

رات بھی مختصر نہیں، بات بھی مختصر نہیں

جو میکہ سے میں ہو مجھڑا، تو پہلے یہ دیکھو

کہ میکہ سے میں کہیں شیخِ درہمیں تو نہیں

بہشت سے بھی زیادہ حسین نظر آئی _____ وہ سرزمین جو مالِ گناہِ آدم ہے

آدابِ جنوں مانگے، آئینِ وفا مانگے

کیا دل ہے کہ اک دنیا، دنیا سے جدا مانگے

اک جانِ طلب تم ہو، تم مل ہی نہیں سکتے

دنیا سے یہ دل آخر مانگے سہی تو کیا مانگے

دنیا کے اجالوں نے ٹوٹا ہے، شمیم! ایسا

دل بزمِ چراغاں میں، اندھی کی دعا مانگے

جہ تھاؤ کہ تبستم سہی ہے اک زخمِ کاتام _____ چاک ہے کس لیے انسان کا سینہ نہ کہو

احساس انا کیا ہے، احساس وجود اپنا
ہم کو نہ چھڑا ہم سے، رہ جا بیٹھے ہم تنہا
ہمیں بھی دیکھ کر شاید تجھے نہیں معلوم
”جہاں نگر“ مہر عالم ہے ”خود نگر“ تنہا
اب اپنے ساتھ ہجوم غم زمانہ ہے
چلے تھے جیب تو غم دل کھتا ہمسفر تنہا
نہ جانے مہربانِ اہل نظر پہ کیا گزرے
زمانہ سنگ بگت اور شیشہ گر تنہا
ایسا نہ ہو کہ جوش جنوں تھک کے بیٹھ جاتے
ہو قی رہے خود سے ملاقات گاہ گاہ

شگفتِ گل کا تبسم بھی حرفِ دلکش ہے مگر کہاں ترے اندازِ گفتگو کی طرح
تمہاری بات نہیں تم تو با وفا سٹھرے گلے سے، جو ایقانِ عہدِ شک جیسے
زخمِ جبین کا ماحرہ، تم سے، شبیم کیا کہیں!
کوچہ غیر سے نہیں، اپنی گلی سے آتے ہیں
مجھے ہے مفہومِ نظر کا، دل کا اشارہ جانے ہے
ہم تم چپ ہیں، لیکن دنیا حال ہمارا جانے ہے
گلی ہوائے اک جھونکے میں، کیسے کیسے پھول گرے
گلشن کے گل پوٹن نہ جائیں، گلشن سارا جانے ہے
شیعہ نثار پھیلے پر شک، درد کا آنسو بہ ہی گئی
شام کا تارا کیسے ڈوبا، صبح کا تارا جانے ہے
کیا کیا ہیں آئینِ تماشا، کیا کیا ہیں آدابِ نظر
چشمِ ہوس یہ سب کیا جانے، وہ تو نظارہ چلے ہے

اپنے شمیم رسوا کو تم جانو ہوا سب ان کوئی
 بستی ساری بچوانے ہے، محر اسارا جانے ہے
 شمیم! عہدِ گزشتہ کی گفتگو نہ کرو وہ دن گئے، وہ محبت گئی، وہ بات گئی
 سکون کی چمک پہ گرتے ہوئے، دیکھا ہے شیخ دبر بہن کو
 پھر میرے کندہ کی قیمت کیا، جب دبر و حرم یک جاتے ہیں
 جو کہ رہے ہیں کہ آئی نظر نہ منزلِ دوست
 وہ لوگ جانبِ دبر و حرم گئے ہونگے
 غمِ عشقِ دل کو بجھے، جولشا طِ جاودانی
 تو حیاتِ محقر کا غم بے ثبات کیا ہے
 جو مذاقِ رنگ و بو ہو، تو دلوں کا بے حد کیسا
 کہیں موجِ گل نے پوچھا کہ صبا کی ذات کیا ہے؟
 خاموش نہ تھا دل بھی، خواہیدہ نہ تھے ہم بھی
 تنہا تو نہیں گزرا، تنہائی کا عالم بھی

مانی ناگپوری، بشیر خان

ان کا خاندان دہلی سے اصل ہے۔ والدین کا رہنے والا تھا، جہاں سے ان کے جدِ مرحوم امیر خان ۱۸۵۷ء کی شورش کے زمانے میں ترک وطن کر کے ناگپور چلے آئے، اور پھر وہیں کے ہو کے رہ گئے۔

امیر خان کے چار بیٹے تھے: کریم خان، منیر خان، فیض خان، سب سے بڑے کریم خان ہی بشیر مانی کے والد تھے۔ کریم خان کی شادی ناگپور کے مشہور سپہ سالار گل میر خان کی دختر امتیاز بی سے ہوتی تھی۔ امتیاز بی اپنی ناسخیال کی طرف سے ایک نو مسلم گونڈ خاندان سے تھیں، جو گونڈ حکمرانوں کے یہاں ملازم تھے۔ بشیر خان سے بڑی ایک بہن عور خانم تھیں، ان کا منگواؤ بہ شباب میں انتقال ہو گیا۔ گویا اس کے بعد بشیر خان اپنے والدین کی اکلوتی اولاد رہ گئے۔

بشیر خان اپنی ناسخیال میں ۱۵ اکتوبر ۱۹۱۸ء کو پیدا ہوئے، جہاں ان کے والد کریم خان، خانہ داماد تھے۔ اپنے زمانے کی نارسہی، عربی، اور اردو تعلیم کے علاوہ دسویں و سب سے نچلے انگریزی بھی پڑھی۔ والد کا انتقال ۱۹۲۶ء میں ہو گیا، جب یہ آٹھ برس کے تھے! والدہ ۱۹۳۸ء میں سدھاریں۔ ان کی ساری تعلیم و تربیت ناناکائی نگرانی میں ہوئی۔ ان کا ۱۹۵۹ء میں انتقال ہوا، کہتے ہیں کہ اس وقت ان کی عمر ۴۱ سال کی تھی۔ والدہ معظمہ بالعتوب۔

بشیر خان شروع سے مخفی اور کمزور قوام کے ہمسکے باعث کسی محنت کے نام کے گونہیں
تھے۔ لہذا عمر بھر کہیں مستقل ملازمت نہیں کر سکے۔ چندے ایک قریب کی دیکھا گینز
کی کان میں کلر کی کی؛ معلیٰ کی؛ اور کچھ جگہوں پر بھی عارضی کام کرتے رہے۔ لیکن آخر
تک کم و بیش پریشان حال ہی رہے۔

ضعیف معدہ کے دائمی مزین تھے۔ پھر کچھ اور پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں۔ اس میں
متلا ہو کر سیو جنرل اسپتال، ناگپور میں علاج کی خاطر داخل ہوئے۔ وہیں ہفتے کے
دن ۲ مئی ۱۹۷۵ء شام کو ایک حقیقی کابلا وا آگیا۔ اور اگلے دن (۲ مئی) صبح
بعد موٹن پورہ کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

ان کی شادی اپنے چچا مینر خان کی صاحبزادی انوری خانم سے ۱۹۴۸ء میں ہوئی تھی
لیزہ دو سال بعد بیوی کا زچہ کی کے ایام میں انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد دوسرا
نکاح مرحومہ کی چھوٹی بہن طاہرہ خانم سے ہوا۔ اس بیگم کے بطن سے آٹھ بچے ہوئے:
چار بیٹے اور چار بیٹیاں۔ ماشاء اللہ سب زندہ و سلامت موجود ہیں۔

مافی ابھی اسکول کے آنری درجوں میں تھے کہ شعر گوئی کا شوق پیدا ہوا۔ اس زمانے
میں پروقیہ منظور حسین شورا اور محمد حبیب اللہ خان غفصنفر تمیذ شفیق اردووی
(ف: ۱۹۳۲ء) وہیں ہائی اسکول اسکول، ناگپور میں فارسی اور اردو پڑھاتے
تھے۔ شہر میں بھی مولانا ناطق گلڈوسٹی (ف: ۱۹۶۹ء) اور ان کے تلامذہ کی موجودگی
کے باعث شعر کے لیے فضا سازگار تھی۔ انی بھی شعر کہنے لگے۔ انھوں نے کوشش
کی کہ اتہال احمد فاضل اسمیل (ف: ۱۹۵۵ء) انھیں اپنی شاگردی
میں قبول کر لیں۔ لیکن مرحوم نے کسی وجہ سے معذرت کر دی۔ اس کے بعد مافی
نے کسی سے مشورہ نہیں کیا۔ طبیعت بھی عزت پسند اور نام و نود سے غصنفر تھی،
اس لیے کسی کے دہر نہیں گئے۔

انھوں نے مجبوراً کلام زندگی میں ناطق نہیں ہوا، اگرچہ اسے خود ہی مصنفہ مصنف کے نام
سے مرتب کر لیا تھا۔ اس کا مسودہ ان کے خاندان میں موجود ہے۔ اسی سے چند شعر

نوشے کے طور پر دریا کر رہا ہوں، جوان کے شاگرد عرفان تنوخی اور محمد عبدالعلیم (بکپڑا) کی ہمدانی سے حاصل ہوتے ہیں:

مہیا گر فتاری بڑھ جاتی، تو اچھا تھا
شرم آتی ہے گھر جاتے، چھوٹے ہوئے زنداں سے
سخن دلوں کا شعر میں خیال جیسے لڑ پڑے
جو بات ان کے دل میں ہے، وہی ہے میری آرزو

نواز گل غم و دواں سبھی پہ بیکساں ہے گناہ کا دل ہو کر بیگناہ کا دل

تیر و سناں، نگاہ کو باندھ گئے سخن طراز
چوٹا لگی ہے بھول سے زخم کھلے ہیں بات سے
کام کچھ گردش و دواں سبھی نہ آئی، مانی ا
پھر کہیں نوش کے وہ لیل و نہار آتے ہیں

اہل دانش نہ سنوا رہے جہاں کو، یارب! کوئی دیوانہ، اسی آب، اسی گل سے اٹھا

بادِ منو سجدہ گزاراںِ حرم صفا بستہ
تیری پلکیں میں کہ جہاں کا کعبہ میں جوم
کتنے دل ہو گئے احساسِ گناہ سے خالی
حسن نے دیکھ لیا، حبیب بیگناہ معصوم
جبصرے لاکھ ہو گئے، خالی رنجِ جاناں پر
ایک نکتہ ہے کہ کھلتا نہیں جس کا مفہوم

گم کردہ کیوں ہیں غلاؤں میں، یہ عالم تو کے دیوانے
مانی ایسی اپنی دنیا ہے شایان طوافِ شمس و قمر

بہتر ہے نگاہوں کی پناہ نگاہ مراد دل کہیں میں گرفتار نہیں ہوتے ہیں قاتل
دل کو خود ہی دانش یہ نہیں آتی ہے کچھ در علم سے اخذ آیا، نہ حکمت سے ملا
مانی! مہر کوئی مقام نہیں عشق کاراں، دابر پر سمجھا

مضطرب حیدری، دلاور حسین

ان کا قاتل ان آگرے کار چنے والا تھا، جہاں سے یہ لوگ ۱۸۵۷ء کے فوجی ہنگامے کے بعد ہجرت کر کے وئی، پھر گھنٹو اور پٹنے کے مختصر قیام کے بعد کلکتہ پہنچے۔ یہیں دلاور حسین ۱۹۲۰ء میں پیدا ہوئے

تعلیم کا آغاز مدرسہ عالیہ سے ہوا، جہاں پانچویں درجے تک رہے۔ وہاں سے فارغ ہوئے تو سان جینز اسکول میں پہنچے۔ لیکن کچھ صحت کی خرابی اور کچھ طبیعت کے آبائی پن کے باعث تعلیم میں کوئی ترقی نہ کر سکے، دسویں درجے کے امتحان سے پہلے ہی یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ اس کے بعد یہ گویا ڈرکٹا پننگ بن گئے، جس کا کوئی مرکز نہ رہا ہو۔

روزگار کی طرف سے ہمیشہ پریشان رہے۔ جب کلکتہ میں کوئی اطمینان کی صورت نہ نکلی، تو یو جی کی راہ لی کہ شاید وہاں کسی فلمی کمپنی میں محبت یا انگریز لکھے کا کام مل جائے۔ وہاں بعض احباب کے سہارے کچھ کام ملا، اور اسٹوڈیو نے ایک دو فلموں کے گانے لکھے بھی، لیکن کوئی مستقل انتظام نہ ہو سکا اور معاملہ بھی اتنا کم تھا کہ جلد ہی یہ دل برداشتہ ہو کر واپس کلکتہ چلے گئے۔

ان کا بچپن اپنے ماما بابا کی سرپرستی میں گزرا تھا، وہ شعر و موسیقی کے مہیا تھے۔ دلاور حسین بھی انہیں کے رنگ میں رنگے گئے۔ تعلیم کے دوران ہی میں ان کے بعض دوست شعر کہنے لگے تھے، ان سے بھی متاثر ہوئے۔ اور ماما جان الہ کو

پیارے ہو گئے۔ اب گویا سر پہ کوئی ڈرہا۔ انھوں نے انانا کے مختصر ذخیرہ کتب سے استفادہ کیا اور ان کا ہارمونیم لے کر موسیقی کی دھنیں بجانے لگے۔ رفتہ رفتہ خود شعر کہنے کی تحریک ہوئی، اور انھوں نے ۱۹۴۴ء میں باقاعدہ اس میلان میں قدم رکھ دیا۔ شعر پر مستقل اصلاح کسی سے نہیں لی جو کچھ کہا، اُسے اپنے مطالعے اور ذوقِ سلیم کے پھر دسے پر شاخوں میں سناتے رہے۔ البتہ کلکتے کے بیشتر بزرگ اساتذہ سے راہِ درسم تھی، انھیں کے مشورہ سے مستفید ہوتے رہے۔ ۱۹۶۷ء میں ایک مختصر مجموعہ 'جام جم' کے عنوان سے اردو سجا، کلکتہ کی طرف سے چھپا تھا۔ اس میں رباعیاں، غزلیات اور نظمیں ہیں۔

ان کے کلام میں ہمعصر سیاسی حالات پر تنقید بہت نمایاں ہے، ترقی پسند تحریک کے اثر سے بھی یہ غالی نہیں۔ انسکوس کہہ کرنے و فنانہ کی۔ وہ سچاس برس کی عمر میں کینسر کے عارضے میں مبتلا ہو گئے، جس سے صحتیابی کی کوئی امید نہیں تھی۔ اس سے گھر اکرا انھوں نے ۱۳ مئی ۱۹۷۵ء کی رات میں ڈوب کر خودکشی کر لی۔ اگلے دن لاش حاجی محمد حسن اسکوریر کلکتہ کے تالاب سے ملی۔ پسماندگان میں پوہ کے علاوہ دو بچے تحسانی یادگار چھوڑے۔

چمن والوں کے ہونٹوں پر ہیں شادابی کے افسانے
مگر افسردگیِ گلستاں کچھ اور کہتی ہے
سکوتِ بحر کو تم دائمی کہہ لو، مگر منظر!
سبک رفتاریِ موجِ رواں کچھ اور کہتی ہے
سوچا ہے کہ اک بت کو اب دل میں بسا بیٹھے
دیران رہیگا یہ اللہ کا گھر کب تک!

وقت پر محدودی تسلی بھی سکون افزا ہے
پھر بھی مضطر! یہ سر پہ درد کا دریاں تو نہیں

ہماری راستاں اب نامکمل رہ نہیں سکتی
 زیادہ کبھی گئی تو آنکھ سے آنسو رواں ہونگے
 خلوص ہو تو کہیں بندگی کی قید نہیں صنمکدے میں طوافِ حرم بھی ممکن ہے
 رات کی بات کیا، رات گئی، بات گئی۔ صبح سے آنکھ ملا ذکرِ سحر ہوتی ہے
 یہ رسم عام نہیں پھر بھی ہم نے دیکھا ہے
 خود اپنی آنکھ میں پروانے جلنے لگتے ہیں
 عجیب حال ہے اس دل کا ان دنوں مضطر!
 ہنسی ہنسی میں بھی آنسو نکلتے لگتے ہیں
 کینچ نفیس مقتل تو نہیں ہے، جان بھی اور لاکھوں پائے
 صحنِ چمن کا ذکر نہ چیر دو، بالِ مہر کا نام نہ لو
 تھے ان کی، میمانہ ان کا، جام ان کے ہشیشہ ان کا
 تلخی تھے کا خشکوہ کیسا! کیفِ و اثر کا نام نہ لو
 کل کی بات، ستمی کل تک، مضطر! چھوٹ تھی نہیں کھلنے کی
 آج قسم کھانے کے لیے بھی ان کے سر کا نام نہ لو

یہ ہمیں سنئے کہ بحرِ عم آپ کا رکھا ہم نے
 ہم کبھی حسرت و پیدار سے آگے نہ بڑھے
 حبش ہے تشنہ لبی کا شکوہ نظامِ نطرات سے میگسارو!
 نگاہِ ساقی بدل گئی ہے مشراب کی کچھ کی نہیں ہے
 رباب و تیشہ و سیف و قلم تراشے ہیں
 ہمیں خدا ہیں، ہمیں نے صنم تراشے ہیں
 یہ سنگ و خشت کو غفلت ہمیں نے بخشی ہے
 ہمیں نے دیر نہیں نے عزم تراشے ہیں

اضطرابِ دلِ ناقام سے ڈر جاتے ہیں
رات تو دوسرے ہم شام سے ڈر جاتے ہیں
تہمتِ عشق تو مریح ہے ہم کو مضطر!
ہو گئے ودا اور جوازام - سے ڈر جاتے ہیں

شبِ نئی رات تو صلتی ہے، ڈھلنے دو! کھل اسیکنا چن اُرت بدلنے تو دور
صبحِ روشن کا سورج نکلے تو دور، ہرکلی پھول بن کر نکھر جائیگی
ظلمتِ شب سے اے دل! ہراساں نہ ہو تارے گن گن کے ناحق پریشاں نہ ہو
لاکھ بجاری سہی، اُرت پھر رات ہے خود گزرتے گزرتے گزر جائیگی

ہم شہرے مدہوش شرابی، پہنکی باتیں کرتے ہیں
ذہن میں واقف کے بھی غلط ہوا، یہ بھی تو ہو سکتا ہے
اکسٹے کا اذنِ بستم بھی ہے بہت مایوس نہ ہو
عمر کا حاصل اک یہی پل ہو، یہ بھی تو ہو سکتا ہے
شامِ ابد کے دھندلے بادل چھاتے ہیں ہر سمت گر
رات گئے، پھر صبح ازل ہو، یہ بھی تو ہو سکتا ہے

مری چاہہ سازی کی فکرت ہے، مرے ساتھ تیرا بھی ذکر ہے
مرا حال دیکھ کے، چاہہ گر ترے نام تک تو پہنچ گئے
وہ نکلا و نالائقی ادھر، تو پیام تک تو پہنچ گئے
کبھی ہم کلام بھی ہو گئے ہم کہ سلام تک تو پہنچ گئے
اب تو اظہارِ تمنا سے بھی جی ڈرتا ہے
اتنے سہے ہوئے جذبات کہاں تھے پہلے

سنت جاں بھی ہے، جاں بلب بھی ہے
دل کا عالم جو کل تھا، اب بھی ہے

فطرتِ حسن کو قتی کیا سمجھے
 بے نیازی بھی ہے، طلب بھی ہے
 مضطر بروئے حشر بھی ٹھہرے گناہگار
 وہ بچ گئے وہاں بھی، عجیب اتفاق ہے
 فنا یہ خاموشی، یہ اشکِ غم، یہ شمعِ انجمن
 چیلروں کی کس نے بحری فتنوں میں پروا لے لی تھی
 کیا جانے کیسی آگ ہے، یہ شعلوں کا پتلا ہے، اندھ دھواں
 محسوس نہ ہوتا ہے یہی، جیسے کہ میں جلتا رہتا ہوں
 فطرت میں ازل ہی سے میری، نیرنگی و ندرت ہے مضطر !
 افسانہ تو ہوں میں ایک، گھر عنوان بدلتا رہتا ہے
 کچھ اندھ مسافر بھی ہیں ہمراہ ہمارے _____ ہم اپنے سفینے کو ڈبو بھی نہیں سکتے۔
 ان سفینوں کا ڈوبنا بہتر _____ جن کو ساحلِ نظر نہیں آتا
 ترے فراق کی لشد پہ ناز کرتا ہوں _____ حرا وصال تو خواب و خیال ہے اے دوست !
 شب کی تنہائیِ مزہ دینے لگی _____ دن بھی اب یوں ہی گزرا چاہیے
 منظرِ کل بھی تجھے کسی کے ہم _____ آج بھی انتظار کرتے ہیں
 کم نظروں کے اور اک وگماں سے لگے _____ اس مفسدہ پر دنا جہاں سے آگے
 اے قافلے والو ! نہ رہاں پر شہر و _____ منزل ہے ابھی دور یہاں سے آگے
 بجلی کی چمک قید کرو تو جا نہیں _____ کون سے کی بیک قید کرو، تو جا نہیں
 مانا کہ گلشن پہ تمہارا قبضہ _____ پھولوں کی ہلک قید کرو، تو جا نہیں
 میخانے میں یہ پسند و نصیحت کیسی !
 اسراف و ضاعت کی حکایت کیسی !
 مے اپنی ہے، جام اپنا، صبرِ راجی اپنی
 لے پیرِ مٹاں ! تیری اجازت کیسی !

ذوالفقار علی بخاری، سید

ان کے خاندان کا مسقط الرأس وسطی ایشیا کا مشہور مرکزِ علم اسلامیت شہر بخارا تھا، جہاں سے ان کے اجداد اسٹار جوہیں صدی عیسوی میں ہجرت کر کے کشمیر جنتِ نظیر میں آئے تھے۔ ایک زمانہ بعد ذوالفقار علی بخاری سے تین چار پشت اوپر یہ لوگ کشمیر سے نکلے، اور صوبہ سرحد کے دار الحکومت پشاور میں آ گئے۔ ان کے والد سید اسد اللہ شاہ بخاری کا شہر کے علما اور برگزیدہ اشخاص میں شمار ہوتا تھا شاہ صاحب مرحوم ہیر کی حیثیت سے بھی معروف تھے، اور ان کے مریدوں کا حلقہ خاص وسیع تھا۔

سید اسد اللہ شاہ بخاری کے تین صاحبزادے تھے۔ جن میں سے دو نے غامی شہرت حاصل کی۔ سب سے بڑے پیر سید محمد شاہ تھے۔ یہ شعر بھی کہتے تھے: رفعتِ تخلص سزا۔ منجملہ سید احمد شاہ بخاری تھے، جنہیں اردو دنیا "پطرس" کے نام سے جانتی ہے اور اگر چاہے بھی، تو انہیں سمجھا سکتی۔ ان کا ۵ دسمبر ۱۹۰۵ء کو نیویارک میں انتقال ہوا۔ اردو والوں کی عیسوی اور بتوفیقی کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہو گا کہ آج تک ان کی سوانحی نہیں شائع ہوئی۔

سب سے چھوٹے ہیں سید ذوالفقار علی بخاری تھے، جن کے بارے میں چند سطریں پیش کر رہا ہوں۔

ذوالفقار علی ۱۹۰۳ء میں پشاور میں پیدا ہوئے۔ دسویں درجے تک تعلیم بھی وہیں گورنمنٹ ہائی اسکول میں پائی۔ اس کے بعد مزید تعلیم کے لیے لاہور آ گئے۔ ان دنوں سبائیتوں نے ”پیر“ کے سابقے سے کس طرح چٹکارا پایا، اس کا قصہ ذوالفقار علی نے اپنی کتاب: ”سرگزشت“ میں بیان کیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ سبھائی جان کا پورا نام پیر سید احمد شاہ بخاری تھا، اور میرا پیر سید ذوالفقار علی شاہ بخاری۔ چونکہ والد مرحوم کے بعد ہم دونوں کسی سے بیعت لینے کے اہل نہیں تھے، لہذا ہم نے خیال کیا کہ ہمارا کوئی حق نہیں کہ پیر کا لفظ اپنے نام کا جزو بنائے رکھیں چنانچہ سبھائی جان ”پیر احمد شاہ“ سے احمد شاہ ہو گئے، اور میں ”پیر سید ذوالفقار علی شاہ“ سے ذوالفقار علی بخاری بن گیا۔ پشاور میں ان کے اسکول کے ہیڈ ماسٹر ڈاکٹر خٹہ۔ وہ احمد شاہ کی صلاحیتوں کے پیشین نظر اور خاص کر ان کی انگریزی میں قابلیت کے باعث ان سے بہت محبت کرتے تھے، اور انھیں صرف ”پیر“ کے نام سے پکارتے تھے۔ لیکن لفظ پیر کا لفظ اس طرح کرتے جس طرح یہ فرانسیسی میں بولا جاتا ہے، یعنی پیئر! بالکل اسی طرح جیسا کہ پیئر سوپ میں ہے (فرانسیسی پیئر، انگریزی میں پیئر ہے اور فرانسیسی میں پطرس۔ آپ نے حضرت عیسیٰ کے حواری سینٹ پیٹر کا نام سنا ہوگا! انھیں بھی یونانی میں (اور اسی سے عربی میں بھی) پطرس کہتے ہیں۔ عرض جب احمد شاہ نے لاہور کالج میں پہنچنے کے بعد انگریزی میں مضمون لکھنا شروع کیے تو ان پر وہ اپنے نام کی جگہ پیٹر لکھنے لگے، البتہ انھوں نے اپنے استاد سے اپنی عقیدت اور ارادت کا اظہار یوں کیا کہ ان مضامین کے ساتھ اپنا پورا نام پیٹر ڈاکٹر لکھتے رہے۔ چنانچہ اس زمانے میں ان کے جو مضامین لاہور کے انگریزی روزنامے ”سول اینڈ ٹری گزٹ“ میں چھپتے تھے، ان کے ساتھ نام پیٹر ڈاکٹر (Peter Watkins) ہی تھا۔

اب یہ قصہ ختم ہی کر لوں:

سید امتیاز علی صاحب (ف: اپریل ۱۹۷۰ء) نے ۱۹۱۸ء میں ماہنامہ ”کوکشاں“

جاری کیا، بڑے شٹاٹ کا پرچہ منجانبہ چونکہ اس وقت بیشتر صرف اول کے ایسوں سے تاج کے ذاتی مراسم تھے، وہ تاج کی فرمائش پر اس میں مضمون لکھنے لگے۔ انھیں میں احمد شاہ بخاری بھی تھے، یہ کالج میں تاج کے بہرامت بھی رہے تھے۔ بخاری نے ”کھکشاں“ کے لیے ایک سلسلہ مضامین لکھائے، یونانی حکماء اور ان کے خیالات“ اور موضوع کی مناسبت سے ان پر اپنے اصلی نام کی جگہ ”پطرس“ کا تلمی نام استعمال کیا۔ ان کی ہدایت تھی کہ میرا نام نہ چھپے اور نہ کسی کو بتایا جائے کہ یہ مضامین میرے لکھے ہوئے ہیں۔ پہلی دو تین جسطوں میں تو ان کی ہدایت پر عمل ہوا، لیکن اس کے بعد ایک قسط پر کاتب نے ”سہو“ ”پطرس“ کے ساتھ ان کا پورا نام ”احمد شاہ بخاری“ بھی لکھ دیا۔ اور یوں یہ راز فاش ہو گیا کہ ”کون“ مشوق ہے اس پروردہ زخمکاری ہیں؟ اب چونکہ سب کو معلوم ہو ہی گیا تھا، اس لیے اس کے بعد خود احمد شاہ بخاری نے سبھی یہ تلمی نام اختیار کر لیا اور کھلے بند دل سے اپنی تقریر دلیں استعمال کرنے لگے۔

تو اسی موقع پر یہ چھوٹے سہاجی ”ذوالفقار علی بخاری“ ہو گئے۔ اور بعد کو انگریزیت نے ترقی کی، تو اس میں تخفیف کر کے نیڈلے بخاری بن گئے۔

ان کے سرکاری ملازمت میں شامل ہونے کا واقعہ اتفاقاتِ زمانہ کی حیرتناک مثال ہے۔ ہوا یہ کہ ایک دن پشاور میں ان کے کسی دوست نے انھیں بتایا کہ اخبار میں بی نام کا اشتہار چھپا ہے کہ ایک ایسے شخص کی ضرورت ہے، جو انگریزی، اردو، فارسی، عربی، پشتو، پنجابی زبانوں سے واقف ہو۔ اس دوست نے مذاق سے کہا کہ سبلا بتاؤ، اتنی ساری زبانیں جاننے والا اس شخص کو کہاں ملیگا؟ وہ دوست تو صرف اتنا کہہ کر چلے گئے، ذوالفقار علی بخاری نے ”ٹریبیون“ اخبار کا وہ پرچہ تلاش کیا، جس میں اشتہار چھپا تھا اور چونکہ وہ کم و بیش یہ سب زبانیں جانتے تھے، لطف لینے کو مندرجہ اشتہار پتے پر درخواست بھیج دی، اور اس میں مشورہ طلبی کے لیے علامہ اقبال (ف: اپریل ۱۹۳۸ء)

اور پروفیسر محمد سعید کے نام لکھ دیے کہ اگر میرے بارے میں مزید پوچھ گچھ کرنا منظور ہو تو ان اصحاب سے رجوع کیا جائے۔ قصہ کوتاہ، وہ ان اصحاب کی سفارش پر ملازم ہو گئے۔ یہ ۱۹۲۵ء کی بات ہے جب ان کی عمر صرف ۲۱ برس کی تھی۔

خود رشیدیہ کالج، کلکتہ کے ختم ہونے پر حکومت ہند کے فوجی دفتر کے جنرل اسٹاف نے ایک ممتحنین کا بورڈ قائم کیا تھا، تاکہ اس کی مدد سے انگریز افسروں کی قابلیت اور اہلیت کی جانچ کی جاسکے۔ اس محکمے کا صدر دفتر ضلع میں سٹاف کے اشتہار اسی دفتر کی طرف سے شائع ہوا تھا، اور اسی بورڈ کے رکن ذوالفقار علی بخاری مقرر ہوئے تھے۔

یہ بہت لمبے دوری کا عہدہ تھا۔ ان سے پہلے شمس العلماء خان بہادر مولوی محمد ریست خان (وف: جون ۱۹۴۳ء) اس بورڈ کے رکن تھے جس جگہ بر ذوالفقار علی بخاری کا تقرر ہوا تھا، یہ ۱۹۲۰ء میں ریست خان کے فنش پر سبکدوش ہونے سے خالی ہوئی تھی۔ بخاری اس عہدے پر دس سال سے دس برس تک رہے۔

اگرچہ بھیڑی اور کلکتہ میں بعض لوگوں نے پہلے سے معمولی صلاحیت کے ریڈیو ٹرانسمیٹر لگا رکھے تھے، لیکن سرکاری محکمے کی حیثیت سے آل انڈیا ریڈیو بیجم جنوری ۱۹۳۶ء کو قائم ہوا۔ اس کی تنظیم و ترویج کے لیے بی بی سی، لندن نے حکومت ہند کی درخواست پر مشن فیلڈن (ف: لندن ۲۱ جون ۱۹۷۴ء) کو ہندوستان بھیجا۔ ظاہر ہے کہ فیلڈن کو موزوں کارکنوں کی ضرورت تھی، جو اس نئے محکمے کی تنصیب و ترقی میں ان کے معاون ثابت ہو سکیں۔ ذوالفقار علی بخاری کے ایک انگریز دوست نے فیلڈن سے ان کا نوکر کیا؛ بخاری نے بھی دھڑا بیچ دی، اور بالآخر انتہائی بورڈ نے ان کا ملی آپلیشن میں پروگرام ڈائریکٹر کے عہدے پر تقرر منظور کر لیا۔

فیلڈن آل انڈیا ریڈیو کے کنٹرولر جنرل تھے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ عہدے کا تمام

کچھ رکھ لیجیے، وہ ٹکٹے کے سیاہ و سپید کے مالک تھے۔ لارڈ ولفگنڈن والیرا سے ان کی ذاتی ملاقات ہی نہیں، گہری دوستی تھی۔ اس لیے حبیب بھی کوئی محکمانہ یا دھڑی قسم کی دشواری پیش نہ آئی جس سے فیلڈن کو اپنی من مانی کرنے میں رکاوٹ محسوس ہوئی، وہ سید سے ولفگنڈن کے پاس چلے گئے؛ اور ان سے جو حکم چاہا، جاری کر لائے۔

ذوالفقار علی بخاری کی فیلڈن سے پہلی ہی ملاقات میں دوستی ہو گئی تھی۔ اور دوستی بھی ایسی کہ دونوں ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔ تنقوڑے دن بعد فیلڈن کی خواہش پر پروفیسر احمد شاہ بخاری (پطرس) بھی وئی آ گئے۔ اوجھال دکی ریڈیو اسٹیشن کے ڈائریکٹر مقرر ہو گئے۔ اس پر ذوالفقار علی بخاری کو ترقی ملی اور یہ ان کے نائب اسسٹنٹ اسٹیشن ڈائریکٹر بن گئے۔ ذرا خیال فرمائیے، بڑا بھائی اسٹیشن ڈائریکٹر اور چھوٹا بھائی اسسٹنٹ ڈائریکٹر؛ اور کنٹرولر جنرل فیلڈن، ان دونوں کا یا ریخار، گویا ان کی حبیب ہیں۔ اس پر سرور دیوانی سنگھ مفتون (ف؛ جنوری ۱۹۵۵ء) نے سببتی کسی کہ ایک بی بی سی لندن میں ہے، اور ایک بی بی سی دہلی میں، یعنی بخاری برادرین کا رپورٹیشن جو آل انڈیا ریڈیو کی کرتا دھرتا ہے۔

تنقوڑے دن بعد حبیب ڈپٹی کنٹرولر کاؤس جی بہرام جی سیٹھنا کا بپتی تباؤلہ ہو گیا، تو ان کی جگہ پطرس ڈپٹی کنٹرولر بن گئے۔ اور ذوالفقار علی اسٹیشن ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ اسی زمانے کا ایک لطیفہ یاد آیا:

کسی نے پوچھا: حضرت! اب یہاں ریڈیو اسٹیشن پر دو بخاری ہیں۔ بات چیت میں جب تک پورا نام نہ بیا جلتے معلوم نہیں ہوتا کہ آپ ان دونوں میں سے کن صاحب کا ذکر کر رہے ہیں؟ بعض بخاری کہہ دیجئے سے التباس کا اندیشہ ہے۔ کوئی ایسا نشان مقرر ہونا چاہیے کہ پورا نام بھی نہ لینا پڑے اور یسین ہیں ہو جائے۔ سامع نے کہا کہ اس میں کبہا مشکل ہے، بڑے بھائی (احمد شاہ بخاری)

جین بخاری، اور چھوٹے (ذوالفقار علی بخاری) غلط بخاری، اس بات پر ایک تہقیر پڑا۔ لیکن یہ لطیفہ کچھ ایسا چپکے کے رہ گیا کہ اس کے بعد مختلف دوستوں کی مجلسوں میں ان دونوں سمجھائیوں کی طرف واقعی صحیح بخاری اور غلط بخاری کے ناموں ہی سے اشارہ ہوتا رہا۔

۱۹۳۷ء کے شروع میں حکومت ہند نے (یا کیسے فیلڈن نے) فیصلہ کیا کہ ہندوستان میں ریڈیو اور براڈ کاسٹنگ کو فروغ دینے کے لیے ہر صوبہ ہی ہے کہ بعض لوگوں کو انکسٹان بھیجا جائے جو وہاں بی بی سی میں کچھ دن رہ کر اپنے کام کی تعلیم و تربیت حاصل کر سکیں۔ اس پر دو آدمیوں کا انتخاب ہوا۔ ایک فیلڈن کے پرائیوٹ سکریٹری (مشر آجاریہ) اور دوسرے ذوالفقار علی بخاری کا۔ غرض سال بعد سے کچھ کم بی بی سی، لندن میں تربیت حاصل کرنے کے بعد بخاری واپس آئے، لیکن دلی پہنچنے پر انھیں معلوم ہوا کہ اب ان کا دلی میں قیام نہیں رہے گا چنانچہ یہ اسی عہدے پر بمبئی ریڈیو اسٹیشن بھیج دیے گئے۔ بمبئی ریڈیو کا موجودہ اسٹوڈیو اور دفتر انھیں کے زمانے میں تیار ہوا۔ قیام بمبئی کے دوران میں انھوں نے مدد مزہ کے کام کے لیے تجارتی اور مراعاتی دونوں زبانیں اچھی خاصی سیکھ لی تھیں، اگرچہ خود الگ الگ کے بات کرتے تھے، لیکن سمجھنے خوب تھے۔

۲ ستمبر ۱۹۳۹ء کو دوسری عالمی جنگ شروع ہوئی۔ جمہور حاضر میں جنگ صرف فوجوں یا میدان ہی تک محدود نہیں رہ گئی ہے، بلکہ فریقین کی پوری پوری آبادی اس کے نرغے میں آجاتی ہے۔ حکومت جب تک کہ اپنے لوگوں کو اس بات کا یقین نہ دلا دے کہ جنگ مفاد عامہ کے لیے لڑی جا رہی ہے، اور سرکار کا موقف صداقت اور انصاف پر مبنی ہے، اسے عوام کی ہمدردی اور اعانت حاصل نہیں ہو سکتی۔ نہ صرف یہ، بلکہ فریقین غیر جانبدار ممالک کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے بھی پوری سعی کرتے ہیں۔ صورتِ حال کی اس تبدیلی کا بہ اثر ہوا:

ہے کہ مروج تو رٹنے کو میدان جنگ میں جاتی ہے اور حکومت کے تمام ذرائع نشر و اشاعت حرکت میں آ جاتے ہیں، لوگوں پر سے دامن کرنے کو اور انہیں اس بات کا یقین دلانے کے لیے کہ حکومت جنگ کرنے پر اس لیے مجبور ہوئی ہے کہ ملک کی آزادی، بلکہ ہستی اور وہ تمام اقدار جن کی لوگ فائدہ کرتے ہیں، دشمن کی وجہ سے معرض خطر میں ہیں۔ عوام کا فرض ہے کہ وہ حکومت کے اقدام کی تائید کریں اور جنگ جیتنے کے لیے اس سے پورا تعاون کریں۔ چنانچہ جب جنگ شروع ہوئی، تو حکومت برطانیہ کی پراپیگنڈے کی مشین بھی پورے انداز سے حرکت میں آگئی۔ بی بی سی، لندن نے بھی اپنی سرگرمیاں چیز سے تیز کر دیں۔ اس کے سامعین میں اردو بولنے والے دو محاذوں پر تھے؛ ایک خود ہندوستان میں، دوسرے، وہ ہندوستانی فوجی جو یورپ اور ایشیا اور افریقا کے جنگ کے میدانوں میں ٹرے ڈالے پڑے تھے۔ اس لیے بی بی سی نے اپنے محلے میں کئی اردو دان حضرات کا اضافہ کیا، جو نہ صرف اس کے نشریات کو بہتر بنانے کے لیے مشورہ دیتے، بلکہ حسب ضرورت مختلف محاذوں پر جا کر ہندوستانی فوجیوں سے ملنے، ان کی حوصلہ افزائی کرتے، اور ان کی حالت کی بہتری کے لیے منصوبے بناتے اور سفارشاتیں پیش کرتے تھے۔

اسی سلسلہ میں ذوالفقار علی بخاری بھی لندن بلا لیے گئے۔ حکومت برطانیہ کی وزارت اطلاعات نے ایک اتحادی ادارہ نشر و اشاعت قائم کیا تھا، بخاری صاحب اسی ادارے کے ہندوستانی رکن کی حیثیت سے گئے تھے۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا، اس ادارے کے فراتر میں یہ بھی داخل تھا کہ مختلف ممالک کے صحابہ مجاز کو برطانی اور اتحادی پراپیگنڈے کی تائید پر آمادہ کرے۔ بخاری صاحب اس دوران میں یورپ کے کئی محاذوں پر دورے کو گئے تھے۔ اس زمانے میں انہیں عارضی طور پر میجر کا عہدہ بھی دے دیا گیا تھا۔

ان دنوں سے واپسی کے تھوڑے دن بعد ہی ان کا تبادلہ سکھتے ہو گیا۔ یہاں انہوں

لے بنگالی سکیں۔ ان کا بنگالی کاظم اور دھیارا گجراتی اور راتھی سے کہیں بہتر تھا۔ اس میں یہ خلقت تقریر کر سکتے تھے، سکتے سے انہیں پھر کہی جانا پڑا۔ ۱۹۴۷ء میں جب ملک کو آزادی ملی ہے، تو وہ یہی ہیں تھے۔

لیکن درمیان میں ایک بات رہ گئی۔ وہ یہی ہیں تھے کہ ۱۹۴۶ء کے اواخر میں انہیں امریکا کی مشہور فلسفہ سارکینسی میٹروڈ گالڈن میٹرنے تعلیم تیار کرنے کے لیے امریکا بلایا۔ انہوں نے حکومت سے رخصت لی اور امریکا صدارت سے وہاں کوئی چھ مہینے قیام رہا۔ واپس آئے، تو تقسیم ملک کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ۱۹۴۷ء میں یہ بھی پاکستان گئے اور وہاں ریڈیو پاکستان کے (یہ نام بھی انہیں کارکھا ہوا ہے) اس سے پہلے نام پاکستان براڈ کاسٹنگ کارپوریشن تھا) ڈائریکٹر جنرل مقرر کئے گئے۔ وہ اس عہدے سے ۱۹۶۱ء یا ۱۹۶۲ء میں سبکدوش ہوئے۔ اگرچہ اس کے بعد بھی وہ اپنی وفات تک ریڈیو پاکستان سے بحیثیت مشیر وابستہ رہے۔

آخری تین چار سال دل کے عارضے میں مبتلا رہے۔ ۱۹۷۷ء میں وہ علاج کے لیے لندن گئے تھے۔ علاج سے مرض میں کچھ افاقہ ہو گیا، اور وطن واپس آ گئے۔ آغاز جولائی ۱۹۷۵ء میں واپس آ گئے، اور ان کے سولے کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ کمریشن ہوا، اتنے میں دل کی تکلیف بڑھ گئی۔ اس پر اسپتال میں داخل ہوئے، جہاں ان کا ہفتے کے دن ۱۲ جولائی ۱۹۷۵ء (یکم صبح ۱۳۹۵ھ) کو انتقال ہو گیا جنازہ اگلے دن الورا کو اٹھا، اور انہیں پی سی، پی سی، سو سائٹی کراچی کے قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔ اولاد میں تین بیٹیاں ان کی یادگار ہیں۔

بہت لوگوں نے ان کی تاریخ وفات کہی۔ نیاں اکبر آبادی کا قطعہ تاریخ ہے: خرمگ ریڈیو بھاری کی سن کر مری آنکھ سے ہو گئے اشک جاری یہ تاریخ فکر رسا سے لی ہے جہاں سے اٹھے آج ریڈیو بھاری

(۱۳۹۵)

رئیس امر ہوی کے قطعے میں ذوالفقار حقانی پناہ سے ۱۳۹۵ ہجری

ہیں۔

اس برصغیر — ہندوستان اور پاکستان میں ریڈیو اور براڈ کاسٹنگ کے فروغ اور ترقی میں ذوالفقار علی بخاری نے جو نمایاں خدمات انجام دیں۔ ان کا انکار ممکن نہیں۔ ان کی زبانیت اور طباعتی کا ایک راز معترف ہے۔ میں انہیں ۱۹۳۶ء سے جانتا تھا۔ اس میں شمسہ سحر مبالغہ نہیں کہ ان کی بذلہ سخی، ہاخڑ جوابی، معاملہ فہمی کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ جن لوگوں کو ان سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا، ان سے کچھ کہا جاتے، تو انہیں مشکل سے اعتبار آئیگا۔

ڈراما اور موسیقی ان کے محبوب موضوع تھے۔ علماً اور عملاً دونوں طرح۔ اور انہیں ان میں ایسی گہری بصیرت حاصل تھی کہ بڑے بڑے جُغادری ان کا لوہا مانتے تھے۔ غالب نے ایک جگہ عیش کی تعریف یہ کی ہے کہ کسی کو اپنا دلپسند مشغلہ بطور پیشہ اختیار کرنے کا موقع مل جاتے۔ یہی ذوالفقار علی کے ساتھ ہوا، اور وہ زندگی سحر عیش کرتے رہے۔

انہیں نظم و نثر دونوں پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ افسوس کہ ان کی تحریریں، عموماً شائع نہیں ہوئیں اے وہ ہمیشہ خوب سے خوبتر کی جستجو میں رہے۔ خدا کرے اب شائع ہو جائیں!

انہوں نے ”خرمیت“ کراچی کے لیے اپنی یادداشتیں فلمینڈ کی تھیں۔ یہ ۱۹۶۳ء اور ۱۹۶۴ء میں ہفتہ وار اس پرچے میں چھپتی رہیں۔ بعد کو ان کا مجموعہ ”سُرگشت“ کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع ہوا (کراچی ۱۹۶۶ء) معلوم ہوا ہے کہ انہوں نے اس کا دوسرا حصہ بھی مرتب کر لیا تھا؛ یہ سبھی چھپ جانا چاہیے۔ ذوالفقار علی بخاری شعر بھی کہتے تھے۔ وہ کلاسیکی انداز کے خوش فکر شاعر تھے۔ اگرچہ وہ نئے طرز فکر سے واسطے نہیں گزرتے، لیکن بنیادی طور پر انہوں نے روایتی اسلوب سے روگردانی بھی نہیں کی۔ افسوس کہ ان کا مجموعہ کلام شائع نہیں ہوا۔ ذیل میں نمونے کے طور پر ان کے چند شعر پیش کیے جاتے ہیں:

اے میرے شہر سے آنے والو! کچھ تو کہو، ہاں کچھ تو کہو
 اس شہر کے گھر آباد ہیں، یا آیا وہیں زنداں؟ کچھ تو کہو
 دامن کے چاک سے دور ہے کتنا چاک بگریاں، کچھ تو کہو
 یا اب کے بھی میسر فرمے گزری فصل بہاراں، کچھ تو کہو
 کیا جوش جنوں کا رنگ رہا؟ کیا دھشت کے سلاں ہوئے؟
 یا اب کے بھی بے فیض رہی پرسی رحمت بہاراں، کچھ تو کہو
 کیا صبح کو اب بھی بارِ صبا، پیغامِ محبت لاتی ہے؟
 کیا شام کو اب بھی بہرائی ہے کاہلی پیپاں؟ کچھ تو کہو
 کیا بزم میں اب بھی ساغر رتے سے چہرے روشن ہوتے ہیں؟
 کیا شام میں اب بھی ہوتا ہے مغل میں چراغاں؟ کچھ تو کہو
 وہ شہر کا دامنِ جوہر ایک پہ کفر کا فتویٰ جسے تاسوتا
 کس حال میں ہے وہ مروجہ؟ اے مردِ مسلمان! کچھ تو کہو
 ہاں موت بھی کو آتی ہے، ہم سب کو مرنا ہے، یہی
 اس شہر میں زندہ رہنے کا بھی کوئی ہے انکاں؟ کچھ تو کہو
 گم کردہ راہ، خاک بسر ہیں، ذرا شہر
 اے تیز رو! غبارِ سفر ہوں، ذرا شہر
 رقصِ نمود یک دو نفس اور بھی سہی
 و دشمن ہوا بہ مثلِ شر ہوں، ذرا شہر
 اپنا خرام تیز نہ کر، اے سیم زبست!
 بجھے کو ہوں چراغِ سحر ہوں، ذرا شہر
 مرموم سی ایبا ہوں، مجھ سے گریز کر
 اپنا کسی دعا کا اثر ہوں، ذرا شہر

سجدۂ شوق کرے کون ادا، میرے بعد
آپ پھرتے رہیں، بن بن کے خدا، میرے بعد
ایک میں ہوں کہ مری یا و دلوں سے نہ مٹی
ورنہ ٹٹے کو تو کیا کیا نہ مٹا ! میرے بعد
میں ہوں سرسبز نواں میں بھی بہاروں کی طرح
کس کو اس آئیگی یہ آبِ دہوا، میرے بعد
کس کو آئیکا اسیری میں رہائی کا مزا
کس کو پہنا تیغے زنجیرِ وفا، میرے بعد

موجِ دل ہتابِ طلب ہے	وصل کی شب بھی ہجر کی شب ہے
تو آقا ہے، میں بندہ ہوں	تجھ سے شکوہ، سو یاد ہے
میرا جینا تیرے خاطر	مرنے کا بھی کوئی سبب ہے
جس نے مجھ کو دل بخشا ہے	سادہ دنیا کا وہ رب ہے
دل کا آنا، دل کا جانا	ایک سے بڑھ کر ایک غصہ ہے
مجھ کو بس تیرا ہی جنوں ہے	میرے جنوں میں بھی اک ڈھب ہے
اس دنیا میں، اس دنیا میں	جس کی طلب تھی اس کی طلب ہے
ہم ہیں اور دیوار کا سایہ	کوئی ہمارا بھی منصب ہے
حسن کا نفع، اللہ اللہ	عشق کا مطرب ہر لب ہے
وہ بھی میرے دوست نہیں ہیں	جن سے عداوت جب تھی ذاب ہے
دل حاضر ہے، دل کے مالک!	مالِ عرب تھا، پیشِ عرب ہے

تیرا میرا منہ تکتے ہیں	سب پیارے ہیں، کون چلائے
حسن کا جلوہ، اللہ اللہ	آنکھیں دیکھیں، جی چلائے
ایمانوں کا اللہ سیل	جب وہ کافر سامنے آئے

اللہ دے، اُکشیاء پر خدا کی کشش

صحرے سے لوٹ لوٹ کے آتا ہوں گھر کو میں
ہم شننا سا بھر کی تہ کے ہوئے
اور ساحل کے تہم سہ کے ہوئے
اس توقع پر رہے کاٹنے طعنے
دیکھ لوں دو گھل کہیں مکے ہوئے
ہم کو دیکھو، میکدے کے دشمنو!
جو بھی کچھ ہم ہیں یہیں وہ شے ہوئے

پھر ہے گرا ہویں کی بھد کو تلاش
پھر کوئی را پیر نہ ہو جائے
بھد کو محفل میں بارِ باب کردا
سجدہ عکاء، شائبہ دور نہ ہو جائے
دانا دانا بہم شو و خسر من
بھلیوں کو خبر نہ ہو جائے

عینب کی ودیعت عشق، عشق کی عنایت غم
عم ہزار لغت ہے، کوئی غم کو کیا جانے
اک صدا ہے جس پر ہم دھن کرتے رہتے ہیں
وعد میں جو آ جائے، ایزد ہم کو کیا جانے!
نرم میں تو ہم دلوں اجنبی سے رہتے ہیں
کوئی تم کو کیا سمجھے، کوئی ہم کو کیا جانے

ہن ہو چکے، جو درد دل کو درد دل سمجھتے ہیں
غمز ہم درد دل کو ذیبت کا حاصل سمجھتے ہیں

عشق ہے آخر موت نہیں ہے
ٹل جا میر کا ٹلتے ٹلتے

تیرے لطافتِ گزشتہ مجھ یاد آتے ہیں
غم فراغِ ش تو ہوں، لطف فراغِ ش نہیں

شویشِ عقل ہے برہم کن جمیع حال بہ تن حرف ہے تو میں بہ تن گوش نہیں
مندرجہ ذیل ان کی آخری غزل ہے، جو انھوں نے اپنی دنات سے چند دن پہلے کہی
تھی :

شام ہو، دوست ہوں، مٹو بھی ہو	اور خدا رکھے تجھ کو، تو بھی ہو
ہو کر حق میں، ہوں صوفیائی کرام	میگساروں کی باد ہو بھی ہو
بزمِ یاداں میں، با سحر آداب	تو ہی موضوعِ گفتگو بھی ہو
ہو اگر تیرا طرزِ دستار	گل کی گلشن میں آبرو بھی ہو
اور باتوں کے ساتھ حسبِ محل	آنکھوں آنکھوں میں گفتگو بھی ہو
کچھ تو آئے نظر، سراب ہیں	کچھ تو انعامِ حبتو بھی ہو
ابنِ کافریہ دلِ مسلمان ہے	ان میں ممکن ہے، دبدو کجا ہو

نشر جاندھری، محمد عبدالحکیم خان

نشر جاندھری (پنجاب) میں ایک چھوٹا سا گھڑا میاں والی مولویاں (تفصیل دیکھو) ہے محمد عبدالحکیم خان وہیں ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوئے، ضلع کی نسبت سے اپنے نام کے ساتھ جاندھری لکھتے تھے۔ بچپنی بڑی مردم خیز رہی ہے جو ہر مناسبت کے بعض شہرہ علماء یہاں کی خاک سے اٹھے۔ اورنگ زیب عالمگیر کے مرشد حضرت بدیع الدین ادیبار جب کابل سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے، تو انھوں نے بھی یہیں قیام کیا تھا، بلکہ میاں والی مولویاں کی بنیاد ہی انھوں نے رکھی تھی۔

نشر کے والد مولوی محمد شرف خان مقامی پرائمری اسکول کے صدر مدرس تھے۔ نشر کا تعلیمی دور بہت متاثر ہوا؛ اپنے درجے میں ہمیشہ اول آتے۔ دسویں کا امتحان انھوں نے گورنمنٹ ہائی اسکول، کوئٹہ سے پاس کیا تھا، جہاں اس وقت ان کے سہائی مولوی عبدالغفور خان مقیم تھے۔ اس امتحان میں بھی اول آئے، اور اس طرح لالہ جمعیت رائے گولڈ میڈل کے مستحق ٹھہرے، جو وہاں کے ایک رئیس لالہ جمعیت رائے نے اپنے مرحوم اکلوتے بیٹے کی یاد میں جاری کیا تھا۔ اس کے بعد وہیں اسلامیہ اسکول کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہو گئے۔

شاغری بہت کئی میں شروع کی۔ جب ایک مرتبہ گرمی کے زمانے میں اس باراں سے غلطی خدا بہت پریشانی تھی، ان کے استاد نے درجے کو بارش پر مضمون

مجھے کوکھا، لیکن میں تو نثر میں لکھا، لیکن اس کے آخر میں اس شعر کا اضافہ کر دیا :

الہی! قبول اس کی کرے دعائیں
کہ مہینہ کو نثر سنی ہے ساری خدائی

اس وقت ان کی عمر بمشکل دس برس کی ہو گی۔ کوئٹہ میں فوجی ملازمت کے اہلکاروں کے لیے کیڈٹ کالج قائم تھا۔ اس میں اردو کے استاد کی جگہ خالی ہوتی لیکن میں نے سبھی ٹیچر شپ کا امتحان پاس کر کے درخواست دے دی۔ اور مقابلی کے امتحان میں یہاں بھی اول آئے۔ اس پر کالج کے پرنسپل نے انہیں ڈیڑھ سو روپے کے مشاہرے پر ملازم رکھ لیا۔ یہاں بعض اوقات اساتذہ کو فیلڈ سرورس پر یعنی باہر بھی جانا پڑتا تھا۔ لیکن میں نے فیلڈ میں جانے سے انکار کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ترقی کے تمام راستے بند ہو گئے، اور عمر ستر ڈیڑھ سو روپے سے آگے بڑھنے کی امید نہ رہی۔ اس پر انہوں نے کچھ مدت بعد ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔

اس کے بعد چندے، وکیل، (امر قسرا) کے ایڈیٹر رہے اور سچ لاہور آ گئے۔ اب انہوں نے مختلف ناشرین کے وہاں کام کرنا شروع کیا۔ بیسیوں کتابیں معمولی اجرت پر لکھ کر دوسروں کے حوالے کر دیں، جو ان اصحاب کے نام سے شائع ہوتیں۔ غرض ناشرین کے وارے باریے ہوتے رہے، لیکن نثر غریب نے زندگی بھر بھی غلامی کا مستونہ دیکھا۔ شہنوی مولانا روم کا منظوم ترجمہ سیما ابکر آبادی (دف جنوری ۱۹۵۱ء) نے کیا تھا۔ اس کے لیے مشہور ناشر مولوی فیروز الدین (دف: اپریل ۱۹۴۹ء) نے انہیں دو پیسے فی شعر معاوضہ دیا تھا۔ سیما ابکر ابکر نے اسے اسٹیم روپے کی ضرورت تھی۔ بیماری کی حالت میں بھی انہوں نے اس کے پانچ دفتر کا ترجمہ مکمل کر دیا اور اس کے بعد کام چھوڑ دیا۔ لیکن میں نے صرف اس ترجمے پر نظر ثانی کی، بلکہ خود چھپنے والے دفتر کا ترجمہ اضافہ کر کے کتاب مکمل کر دی۔ یہی ترجمہ بعد میں ابام منظوم کے عنوان سے فیروز الدین اینڈ سنز کی طرف سے شائع ہوا۔

اس دوران میں نشتر نے ۱۹۲۳ء میں منشی فاضل اور ۱۹۲۵ء میں انٹر کے امتحان پاس کر لیے تھے۔ بی اے کی تیاری کر رہے تھے کہ شادی ہو گئی۔ اس کے بعد کسبِ روزگار کا مسئلہ کھڑا ہو گیا اور بیویوں کی تعلیم سے دست بردار ہونا پڑا۔

نشتر کے شروع میں کچھ دن نظم و نثر لکھنا ہی تھا، لیکن جلد ہی اشنا و نفاذِ فارغ الاصل کے قرار دے دیا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ نشتر کو مجاہدِ امناف بنی ہر پوری قدرت حاصل تھی۔ ان کے اپنے نام سے جو کتابیں شائع ہوئیں، ان میں سے بعض نام یہ ہیں: نشتر ادب، روضۂ ادب، شرحِ بابِ جبریل وغیرہ۔

اتوار ۲۲ جون ۱۹۷۵ء کو لاہور میں انتقال ہوا۔

افسوس کہ باوجود تلاش، ان کے دونوں دیوان مہیا نہ ہو سکے۔ ایک تذکرے میں تین نوٹس ملیں، انہیں میں سے چند ضمیمہ طور نمونہ پیش کر رہا ہوں۔

خصت ہوا شباب، زمانہ محمد رگیا
وہ ہم نہ وہ جواب، زمانہ بدل گیا
پہلی سی وہ زمین نہیں، وہ آسمان نہیں
دنیا ہے جیسے خواب، زمانہ بدل گیا
ہنگامے عشقِ حسنہ کے افسانہ ہو گئے
اتر انقلاب، زمانہ بدل گیا
ارشاد جو حضور کا ہے، ہاں بجا اور مست
بدلے نہیں جواب، زمانہ بدل گیا
نشتر جو شکوہ کسبِ نفاذِ نفل ہوا کبھی
ہنس کر دیا جواب: ”زمانہ بدل گیا“

یہ مکر نہ بھر ہے، ساحل ہے موجِ موجِ اس کی
بظاہر ایک بھی ساحل نظر نہیں آتا

رواں دواں میں مسافر تلاشِ منزل میں
اگرچہ جادۂ منزلِ نظر نہیں آتا
یہ اشکِ اشک نہیں، اشکِ اشک ہیں، نشتر
جگر کا خون جو شاملِ نظر نہیں آتا

جو گلشن میں بہارِ فتنہ ساماں دیکھ لیتا ہوں
تو دامنِ دیکھ لیتا ہوں، گریباں دیکھ لیتا ہوں
نگاہِ ویرانی، دوزخ ہیں تصویرِ محبت کے
سکستاں دیکھ لیتا ہوں، بیاباں دیکھ لیتا ہوں
خود اپنا رہنما ہوں میں، بیابانِ تنہا میں
کہ ہر ذرے میں کوئے جاناں دیکھ لیتا ہوں

منظر لکھنؤی، سید منظر حسن

غیبِ الطرفین یعنی دوصیالی اور ناسیالی دونوں سلسلے امام و محمد حضرت باقی علیہ السلام سے جاتے ہیں۔ ان کے بزرگوں میں ایک صاحبِ نجم الدین سب سے پہلے سبزواری سے ہندوستان آئے۔ یہی لکھنؤ کے مشہور خاندانِ اجنبیہ کے بھی مورثِ اعلیٰ ہیں۔ یہاں ان کی مناسب آؤ بجلت ہوئی اور نصیر آباد کا علاقہ بطور بجاگیر عطا ہوا۔ ایک زمانے تک خاندان نے خوشحالی کا دور دیکھا۔ لیکن کسی چیز کو وہ امنیں غفہ رفتہ حالات بگڑتے گئے، یہاں تک کہ ان کے جدِ اجد سید وارث حسین عرف رئیس روضہ (ضلع رائے بریلی، یو، پی) ہو کے رہ گئے۔ منظر کے والد بزرگوار شمس العلماء مولانا سید سبط حسن کسی تعارف کے محتاج نہیں؛ بلحاظِ خطیب ان کا ملک بھر میں مشہور تھا۔ ان کا پختہ ۲۸ محرم ۱۳۵۲ء (۲ مئی ۱۹۳۵ء) کو لکھنؤ میں انتقال ہوا اور وہیں امام باطنیہ غفرانِ مآب میں دفن ہوئے۔

منظر کی شکیکہ ناسیخ ولادت تو معلوم نہیں ہو سکی، لیکن اندازہ ہے کہ وہ ۱۹۱۴ء کے شروع میں اپنے آبائی مکان (بنجاری ٹولہ) لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی عربی و فارسی کی تعلیم گھر ہی پر مولانا آغا جون مرحوم کی نگرانی میں ہوئی، پھر خاندانِ اجنبیہ مادہ، سید باسط حسن امیر لکھنؤ، مرزا محمد اشفاق (شہید کالج لکھنؤ)، کاظم علی خان صاحب (شہید کالج لکھنؤ)

کے فرد تھے۔ اس کے بعد سلطان المدارس لکھنؤ میں داخلہ لیا، لیکن بدقسمتی سے اسی دوران میں ان کے والد مولانا سبط حسن کا انتقال ہو گیا، مجموعاً اس کے بعد انھیں تعلیم کا سلسلہ منقطع کرنا پڑا۔

تعلیم ناممکن رہ جانے سے قدرتاً دینی ترقی کی سب راہیں بند ہو گئیں، جس سے لازماً عمر بھر قلیل، بلکہ ناکافی آمدنی میں گزارا کرنا پڑا۔ زندگی سہر مختلفہ پیشانیوں کی آماجگاہ بنے رہے۔ صحت ہمیشہ متوسط درجے کی رہی، نہ بہت اچھی، نہ بُری، لیکن آرام و آسائش کے مسلسل فقدان کے رفتہ رفتہ رنگ دکھایا، ۱۹۷۲ء میں تپ دق میں مبتلا ہو گئے۔ کافی دسائل نہ ہونے کے باعث مناسب علاج بھی نہ ہو سکا۔ تپ دق اب مہلک نہیں رہا اور قابل علاج ہے۔ لیکن اس کا صرفہ ہنوز خاصا گراں ہے! اور اسی کا سامان ان کے پاس نہیں تھا۔

بالآخر اسی مرض سے ۲۲/۲۳ جون ۱۹۷۵ء کی شب میں تقریباً قریباً (یعنی ۲۳ جون کے ابتدائی حصے میں) اپنے گھر پر جان، جان آفرین کے سپرد کر دی۔ ۲۳ جون دوپہر کے وقت امامبارہ غفران مآب (لکھنؤ) کے اندرونی صحن میں (شمالی پہاڑ کے مقابل) سپرد خاک ہوئے۔

بہت کم عمری میں شعر کہنے لگے تھے، اور یہ اثر شرفا خاندانی ماحول کا۔ والد کا میدان علم و فضل میں ڈنکا بجاتا تھا۔ وہ شعر بھی کہتے تھے، خاطر خالص تھا۔ منظر کے ایک چچا مولانا ظفر مہدی ماہنامہ ”سہیل بین“ لکھنؤ کے مدیر تھے؛ دوسرے مولانا سید کامل حسین کاکی (سکریٹری انس جعفر علی خان اثر رامپوری) شعر کہتے تھے اور مختلف علوم و فنون میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ خود منظر کے بڑے بھائی سید محمد حسن سالک تخلص اور چھوٹے بھائی سید باسط حسن ماہر بھی شعر کہتے تھے۔ (تیسرے بھائی سید محمد وارث حسن انگلستان میں مقیم ہیں) غرض یہی شعر کہنے لگے۔ ساری عمر کسی سے اصلاح نہیں لی۔

ان کے قطعات کا مجموعہ ”ہفت رنگ“ کے عنوان سے چھپ چکا ہے۔ معلوم ہوا تھا

کہ ان کے برادرِ خرد و ماہرِ حساب ان کے قصائد "منظر و نظارہ" کے نام سے مرتب کیے گئے ہیں۔ ان کے کچھ شائع نہیں ہوئے (۱۹۷۱ء) اس کے علاوہ بھی ان کا بہت غیر مطبوعہ کلام (سلام، نزل و غیرہ) ان کے خاندان میں موجود ہے۔

منظرِ مرحوم ساری عمر بحرِ دریا کے کنارے ہی نہیں۔ بڑی بندرگاہ، فگفتہ اور باغ و بہارِ طبیعت پائی تھی۔ صاف دل اور سرخاں مریخ کسی کے بڑے میں نہیں تھے۔ اپنے قریبی حلقہٴ احباب میں سب انہیں "منظرِ سجیا" کہہ کر پکارتے! اور وہ اس سے بہت خوش ہوتے تھے۔

اتالیتد و اتالیتد راجیون

کلام میں کوئی خاص بات نہیں۔ زبان پر قدرت ہے۔ فنی پہلو سے بھی بے عیب ہے۔

چند تعلقات ملاحظہ ہوں:

آبلہ دل کا چھوٹ جائیگا	رشتہ بھر ٹوٹ جائیگا
جام ہاتھوں سے چھوٹ جائیگا	مسکرا کر نہ دیکھیے، ورنہ

جو حجابات ہیں، وہ اٹھا دیجیے	دل کی خاموش دنیا جگا دیجیے
ہو سکے، تو صدا پر صدا دیجیے	آسے ڈھونڈتی ہے نگاہِ وفا

نرا دنیا سے ہٹ کر دیکھ لیجیے	نقابِ درخشاں کر دیکھ لیجیے
بہانے سے، پلٹ کر دیکھ لیجیے	اگر بے مصلحت سے چشمِ پوشی

نرا کچھ محبت کے ماروں سے کہہ دو
جہیں کس طرح جاں نثاروں سے کہہ دو

بتاؤ تو، کیا فیصلہ ہے تمہارا !
جو منہ سے نہ بولو، اشاروں سے کہہ دو

زباں سے نہ رُودادِ غم کہہ سکیں گے
نہ ایذا سے شامِ اُم، کہہ سکیں گے
یونہی دل کے ارمان، دل میں رہیں گے
نہ تم کہہ سکو گے، نہ ہم کہہ سکیں گے

اب اوقیت، اوقیت نہیں ہے رخصتِ شامِ فرقت نہیں ہے
یہ ندامت سرِ قبر کیسی اُسی جاؤ، کوئی شکایت نہیں ہے
وقت کے ساتھ پھل کے نکل جاؤ گے
پھیر لو گے نظر، چال چل جاؤ گے
تھام کر ہم یکجہ کو رہ جائیں گے
تم بدلتے بدلتے، بدل جاؤ گے

حامد اللہ آبادی، حامد حسین

شیوخ صدیقی کے ایک متوسط الحال، لیکن معزز گرانے کے چشم چراغ تھے۔ ضلع
الہ آباد کی تحصیل چائل میں ایک مختصر موضع "بہکا" ہے۔ یہ اٹلی کے بزرگوں نے آباد
کیا تھا، جب وہ ہندو عالمگیری کے آخری زمانے میں یہاں آکر بس گئے تھے۔ حامد حسین
جون ۱۹۳۲ء میں بہکا میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد حکیم اختر حسین خاصی سماجی
جہت کے مالک تھے۔ بزرگوں کی پیدائش کو دیکھ کر وہ جاوید ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی نذر
ہو گئی، انھوں نے اپنی محنت اور معاملہ فہمی، سوجھ بوجھ اور اخلاقی قابلیت سے
خاندان کو سپر سے اپنے پائوں پر کھڑا کر دیا۔ اس سے املاک میں بھی وسعت ہوئی،
اور وقار میں ترقی بھی۔

حامد حسین اپنے والدین کی سب سے بڑی اولاد تھے۔ ۱۹۵۸ء میں ان کے والد
حکیم اختر حسین کسی مقدمے کے سلسلے میں پکڑی گئے تھے، وہاں بھری عدالت
میں کسی مخالف نے انھیں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اب خاندان کی پوری ذمہ داری
حامد حسین کے کندھوں پر آ پڑی۔ یہی مصیبت کیا کم تھی کہ کچھ مدت بعد ۱۹۵۹ء
میں حکیم اختر حسین کے بعض مبینہ قاتلوں کا پراسرار طریقے پر قتل ہو گیا اور اس
سلسلے میں جو ہندو قاتل استعمال ہوئے تھے، بد قسمتی سے تعینات ہو چکے تھے کہ وہ خود
حامد حسین کی کھٹی رجو قاتلوں نے اسی جرم کے الزام کے لیے چوری کی تھی، اس

پر حامد حسین گرفتار کر لیے گئے۔ مقدمہ چلا اور اس سلسلے میں آٹھ مہینے غنیمتی تال جیل میں کاٹنا پڑے۔ لیکن بالآخر استغاثہ جرم ثابت نہ کر سکا اور یہ باعث بری کر دیے گئے۔

دسویں درجے تک تعلیم باقاعدہ اسکول میں پائی تھی۔ اس کے بعد سازگار حالات کے باعث یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ ملازمت کے دوران میں پرائیویٹ طور پر انٹر اور ادیب ماہر اور ادیب کامل کے امتحانات پاس کر کے آخر کار بی۔ اے کی سند بھی لے لی۔ ملازمت محکمہ تعلیم میں رہی جہاں نیک نامی سے بسر ہوئی۔

وہ شعر تو بہت ابتدا میں کہنے لگے تھے، لیکن ۱۹۵۰ء سے اس پر زیادہ توجہ دینے لگے۔ یہ شوق انہیں گویا ورثے میں ملا تھا۔ ان کے والد حکیم اختر حسین بھی شعر کہتے تھے، اختر اور سیم تخلص کرتے تھے۔ ان کے تین چار شعر دیکھیے، جن سے ان کے انداز سخن کا کچھ اندازہ ہو جائیگا (اس سے مقصد یہ بھی ہے کہ اس طرح ان کے چند شعر محفوظ ہو جائیں)

حریص لذت آزار، مجھ کو دیکھ کر، ہمدم!
کسی نے میرے دل میں جوئے لامکاں رکھ دی
حاضر ہیں آپ کے در دولت پر دیر سے
ہوش و حواس عقل و خرد جسم و جان سے ہم
اک بے نیاز، مشق و محبت کی یاد میں
اختر! خدا گواہ، گئے دم جہاں سے ہم
کبھی بے آئینہ جلوں کی انسانی سخی دیکھی ہے
اگر مقصود ہو، لاشیشہ دل، دیکھنے والے
بساط کون دکاناں پر یقین کی چال چلا
تو راز مجھ پہ کھلا کہ کیا ہوں میں

پہلے مدتوں حامد بیکاوی کے نام سے لکھتے رہے، بعد کو احباب کے کہنے پر حامد حسین

عامہ کہنے لگے۔ ”الہ آباد کے ماہنامے ”مشجون“ سے اس کے روزناموں سے تعلق پیدا ہو گیا تھا۔ اگرچہ انھوں نے ابتدا غزل سے کی تھی، لیکن ”مشجون“ سے تعلق کے بعد نظم پر بھی توجہ کرنے لگے۔ اور اس میں کامیاب بھی رہے۔ ”مشجون“ میں کبھی کبھی تبصرے بھی لکھا کرتے تھے۔ ۱۹۶۷ء میں شہور نقاد شمس الرحمن فاروقی کے ساتھ مل کر انھوں نے جدید شاعری کا ایک نمایندہ انتخاب ”نئے نام کے عنوان سے مرتب کیا تھا۔ اس کے علاوہ انھوں نے بچوں کے لیے بھی بہت کچھ لکھا؛ ان میں سے دو کتابوں ”ایجادات کی کہانی“ (۱۹۷۳ء) اور ”سجارت کے نامور سائنسدان“ (۱۹۷۴ء) پر انھیں یو پی اردو اکیڈمی نے انعام دیا تھا۔

افسوس کہ ان کا مجموعہ ”کلام ان کی زندگی میں شائع نہ ہو سکا، اگرچہ اس کا نام ”الفاظ کی خوشبو“ مشہور ہو چکا تھا۔ اس میں کچھ ان کی بے نیازی کو بھی دخل رہا۔

۱۵ اگست ۱۹۷۵ء کو معمولی بیمار میں مبتلا ہو گئے؛ علاج ہونے لگا۔ انھیں شذریہ قید کے زمانے سے دل کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا، اور دل پہلے سے کمزور تھا؛ اب کچھ پیچھے بھی متاثر پائے گئے، تو علاج کے لیے میڈیکل کالج، الہ آباد میں داخل ہو گئے۔ پانچ دن تک زیست اور موت کی کشمکش میں رہنے کے بعد ۱۷ دسمبر ۱۹۷۵ء کو رحلت کی۔ لاش ان کے وطن بہار گئی اور وہاں خاندانی قبرستان میں سپرد خاک ہوئی۔

۱۹۵۱ء میں ان کی شادی الہ آباد کے حواری کے ایک مقام ”مید سراجاں“ میں ہوئی تھی۔ جسمانی اولاد میں چار بیٹے (اعظم، معظم، اسلم، اکرم) اور دو بیٹیاں (سرینا اور تمکین) اپنی یادگار چھوڑیں۔

افسوس کہ کلام آج تک جمع نہیں ہو سکا۔ کچھ غزلیں ماہنامہ ”مشجون“ میں ملیں۔ ان کی بیاض سے کچھ کلام شمس الرحمن فاروقی صاحب نے مہیا کیا جس کے لیے ان کا ممنون ہوں، اسی کا انتھار، لطافہ، زیرہ پیش ہے :

پامال جنوں مشہور تھا سبھی کرینگے
یہ شرط اگر ہے تو ہم ایسا بھی کرینگے
مستقبل زرتیں پہ سب رو سنا بھی کرینگے
جینا ہے تو جینے کا سہارا بھی کرینگے
خاکستر ارضی میں خسر نہ مرنے والے!
کہتے ہیں کہ راہوں میں آجلا بھی کرینگے
ہم برس برس بیکار ہیں امر و نہ کے غم سے
ہاں، ہم ہی علاجِ غم دریاں بھی کرینگے
دشوار کی حالات، حوادث کے تجویز
منزل کا یقین ہے تو گورا بھی کرینگے
یہ ہزم کا عالم ہے، تو پھر اہل قسٹ
ساتی سے توجہ کا تقاضا بھی کرینگے
پیداری غم آج کہ ہر اک پہچاں ہے
کیا اہل جہاں اس سے کنارہ بھی کرینگے؟

کتابِ شوق، لیکن بے ورق ہوں بیکے از کشتگانِ ماخلق ہوں
مری پہنا تیوں کا راز سمجھو مجھ دیکھو، طبقِ اندر طبق ہوں
ہزاروں طور ہیں فاشاک جن سے انہیں سپا تیوں کی میں ریش ہوں
ہزاروں لفظ ہیں لیکن ہر اک کی جیب خالی ہے
یہ افلاسِ لباسِ شاعری، یارو! مثالی ہے
لگے ہیں کان آوازوں پہ، لیکن لفظ گونگے ہیں
گذرے موسموں کی داستان سب سے نرالی ہے
کسی تعریفِ ہی کی روکشی میں آٹھو کھلتی ہے
بتانے کی ضرورت ہے، یہ کالی رات کالی ہے۔

ہیں تنہا نہیں ہیں جستجو کی دوڑ میں، لیکن
 ہمیں سے کس لیے پھر آج ہر ذرہ سوالی ہے
 یہ یکتائی ہماری، ہم سے ہی منسوب ہے، حامد !
 یہ اپنی وضع، اپنی طرز خود ہم نے نکالی ہے

اک شخص تھا سواب وہ بیاباں نورد ہے
 اس شہر میں ہمارے سوا کون مرد ہے
 چہرہ ہر ایک متر مقابل کا نرد ہے
 عشقِ نبرد پیشہ طلب گارِ مرد ہے
 یک جہتی نگاہ کو آواز کون دے
 ہر دفرِ خیال یہاں فرد فرد ہے
 اس جستجو کی دوڑ میں یہ سبید بھی کھلا
 رنگِ سخن تلاشِ معانی کی گرد ہے
 غرنے سے لے لے کے جھانکنا اصل رنگ
 چہرے پہ ہم سبھوں کے اگر آبِ زرد ہے
 دستِ سخن میں تیشہ باطل نہ دیکھیے
 دشمن اگر چہ راہ کا ہر سنگِ سرد ہے
 اس میں حرارتوں کی نئی روح پھونک دو
 خواہش کی لاش ایک زمانے سے سرد ہے

یقین کی حد سے گزر کر گماں نکلتے ہیں	کہاں سے اہل محبت کہاں نکلتے ہیں
یہیں تو ختم نہیں راہِ جستجو "رود دست !"	چراغِ دل کے سہارے جہلِ ننگ لے ہیں
روایتوں کے سند کو پیر کر، ہم لوگ	مقامِ عشقِ حقیقت نشانِ ننگ لے ہیں
تھمارے ہام سے، تم کو خبر بھی ہو شاید	ہزار سنگِ سیر و ستارِ ننگ لے ہیں

منزلِ درہ کا یقین کیسا جل پڑے آپ تو چلتے رہیے
پہنی تشویر کی خاطر ہی سہی مگر سے باہر بھی نکلتے رہیے
مُدح کی موت سے بچنے کے لیے اپنے قالب کو بدلتے رہیے

کچھ گفتگو سے اس کو سروکار بھی تو ہو یہ خاشی ملا دستِ انہار بھی تو ہو
بچتے ہیں ہم بھی، کوئی خریدار بھی تو ہو بازار کی طرح کوئی بازار بھی تو ہو
جس کی بشارتیں ہیں کتابوں میں جا بجا وہ صبحِ زندگی کی نمودار بھی تو ہو
یہ کاروانِ شوق، یہ راہیں، یہ منزلیں حائل کسی جگہ کوئی دیوار بھی تو ہو
تاریخوں میں ہم سبھی اماں زحونڈتے چلیں لیکن وجودِ صبح سے انکار بھی تو ہو

آؤ، ان لمحوں کو ہم لوگ متقید کر لیں
تا کہ آنکھوں میں یہ اندازِ جہاں رہ جاتے
بات بٹنے کی نہ صورت، نہ کوئی شکلِ فرار
پاس لے دے کے اگر، عجزِ ریاں رہ جاتے

آنکھوں کے ساتھ ذہن کا دروازہ بند کر
ہر صاحبِ کمال پر یوں نہ ہر خند کر
یہ ایسی ویسی بات نہیں ہے، اگرہ میں رکھ
جو تہجد کو مل گیا، اسے مٹی میں بند کر
وہ تیرگی کا ذہر، یہ تابندگی کا قہر
اب تجھ کو اختیار ہے، جو بھی پسند کر

راشدان، ہم (نذر محمد)

پاکستان کے ضلع گوجرانولہ میں، وزیر آباد در لاول پور لائن پر ایک خاصا بڑا قصبہ (جو اب شہر کی حیثیت اختیار کر گیا ہے)، اہلی پور چٹہ ہے، یہ تحصیل کا صدر مقام بھی ہے تقسیم ملک سے پہلے اس کا نام ”اکال گڑھ“ تھا۔ اس زمانے میں یہاں کا لوہاں کا خاندان مائیں شہر میں شمار ہوتا تھا۔ شاید اب بھی ہو۔ اگرچہ یہ لوگ قوم کے جوئے تھے، لیکن انہوں نے دنیا کی کو اپنا پیشہ بنایا، اور پشتوں تک بنو عرب کے مکین رہے۔ سکھوں کے عہد میں ان کی خاصی عزت تھی اور ان کا یہ مقام انگریزی زمانے میں بھی قائم رہا۔ اسی خاندان کے ایک فرد جناب فضل الہی چشتی صاحب کے محکمہ تعلیم میں ملازم تھے۔ وہ بتدریج ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس کے عہدے تک پہنچے اور وہیں سے پنشن پر سبکدوش ہوئے۔ ان کے دو بیٹے تھے: نذر محمد اور عبدالماجد۔ یہی نذر محمد بعد کو، ان ہم راشد کے نام سے دنیا سے شعرا و ادب میں مشہور ہوئے۔ ماجد صاحب بھی مدتوں محکمہ تعلیم سے منسلک رہے۔ وہ کسی زمانے میں ملتان میں سبکداری تعلیم کے دفتر میں کام کرتے تھے۔ آج کل غالباً کسی ناشر کے کتب کے یہاں نوکر ہیں

راشد صاحب یکم اگست ۱۹۱۰ء کو اکال گڑھ میں پیدا ہوئے۔ ”خضر عمر“ تاریخی

سے ایک صاحب نے مقام ولادت ”کیلیان والا“ کہا ہے یہ شیک نہیں

نام ہے جس سے (۱۹۱۰ء) بچکے ہیں۔ ابتدائی تعلیم مقامی گورنمنٹ ہائی اسکول میں پائی جہاں سے ۱۹۲۶ء میں دسویں کی سند ملی۔ اس کے بعد گورنمنٹ انسٹرکٹ لائن پور پہنچے اور ۱۹۲۸ء میں وہاں کا نصاب مکمل کر کے لاہور چلے آئے اور گورنمنٹ کالج میں داخلہ لے لیا۔ یہیں سے چار برس بعد ۱۹۳۲ء میں ایم اے (تفصیلیات) کی سند حاصل کی۔

ان کی شعر گوئی اکال گڑھ کی طالب علمی کے زمانے میں شروع ہو چکی تھی۔ روایت ہے کہ انھوں نے سب سے پہلی نظم ۱۹۱۱ء میں ”انسکڑا اور نکھیاں“ کے عنوان سے سات برس کی عمر میں کہی۔ ہوا یہ کہ ایک انسکڑا صاحب ان کے اسکول کا مایہ نہ کرنے کے لیے آئے۔ ان کے سر کے گرد منجبتوں کا جھرمٹ منڈلا ہوا تھا، جو ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں ان کے ساتھ منتقل ہوتا رہا۔ یہ نظارہ دیکھ کر نذر محمد کو سخت تعجب ہوا اور اس پر انھوں نے یہ نظم لکھی۔ اس نظم میں انھوں نے اپنا خالص ”کلاب“ لکھا تھا۔ ان کے والد جناب فضل الہی نے نظم دیکھی، تو بہت خوش ہوئے اور اس پر بیٹے کو ایک روپیہ انعام دیا۔ خود ان کے والد (یعنی راشد کے دادا) جناب غلام رسول جو پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر تھے، اور اردو، فارسی میں شعر بھی کہتے اور ”غلامی“ خالص کرتے تھے، جناب فضل الہی نے بیٹے کی یہ نظم اپنے ابا کی خدمت میں بھیج دی۔ دادا نے اس پر ہونہار پونے کو یہ شعر لکھا:

میرے میاں محلاب! دہن میں محلاب ہو

خوشبو سے تیری بابا ترا نیکیاں ہو

اور کہا کہ شعر گوئی سے اجتناب کرو، ورنہ کسی کام کے نہیں رہو گے؛ بس اپنی تعلیم سے کام رکھو۔ لیکن یہ نشہ ایسا نہیں، جسے ترستی اتار دے۔ چنانچہ ان کا یہ مشغلہ جاری رہا۔ کالج پہنچے، تو اس شوق نے اور ترقی کی اور پختگی اختیار کر لی۔ گورنمنٹ کالج لاہور کے زمانے میں یہ کالج کی بزم سخن کے سکتر اور کالج کے

ماہانہ رسالے "مادی" کے اردو حصے کے مدیر مقرر ہو گئے۔ اسی زمانے میں ان کی غزلیں اور نظمیں ہمایون انڈسٹریز میں بھی شائع ہوتیں۔ وہ شری بھی لکھتے تھے؛ اس میں زیادہ توجہ تنقید پر تھی۔ غرض کہ کالج سے فارغ ہونے سے پہلے وہ لاہور کے ادبی حلقوں میں شاعر اور ادیب کی حیثیت سے متعارف ہو چکے تھے۔

اس زمانے میں وہ "راشد جدیدی" کے نام سے لکھتے رہے۔ یہ نسبت انہوں نے اپنے خاتون محمد وحید کیلانی سے انہماکِ ارادت کے طور پر اختیار کی تھی کیلانی صاحب سہائی دروازہ، لاہور کے اسلامیہ ہائی اسکول، میں مدرس ثانی (سیکنڈ ماسٹر) تھے۔ ۱۹۲۳ء میں نیرنگ خیال جاری ہوا؛ اور واقعاً "ستارہء درخشاں" کا مکمل مثالی بات ہو گئی۔ تاثیر اس کے ایڈیٹر تھے۔ ان کے ساتھ "پوسٹا" نیا زندان لاہور کا حلقہ ان کی پشت پر؛ چغتائی کی مصوری کے شاہکار بھی ہر شمارے میں شامل ہوتے۔ اور ان تمام خوبوں کے باوجود چندہ صرف تین روپے۔ لاہور! چھ بیٹے بھی نہیں گزرے تھے کہ پرچے کی اشاعت پانچ ہزار تک پہنچ گئی۔ اس پر لبض اور اصحاب کے منہ میں بھی پانی بھر آیا۔ حافظ محمد عالم نے "عالمگیر" اور وحید کیلانی نے "توس قزح" جاری کیے۔ "عالمگیر" تو چل نکلا، کیونکہ حافظ محمد عالم کا اپنا مطبع تھا اور ان کی مالی حالت بھی بودی نہیں تھی؛ لیکن "توس قزح" نے دو ہی برس (۱۹۲۷-۱۹۲۹ء) میں دم توڑ دیا۔ خیر یہ تو جملہ مقررہ تھا جو زرا طویل ہو گیا۔ کہ یہ رہا تھا کہ ان، ام راشد ان دنوں راشد جدیدی کے نام سے لکھا کرتے تھے۔ راشد تخلص بھی کیلانی صاحب ہی نے دیا تھا۔

کالج کے دور میں وہ اسی نام سے روایتی شاعری کرتے رہے۔ اس زمانے میں وہ اختر شیرانی (ف، ستمبر ۱۹۲۴ء) اور روش صدیقی (ف، جنوری ۱۹۲۷ء) اور سید عابد علی عابد (ف، جنوری ۱۹۲۷ء) کے زیر اثر رہے، بلکہ ایک مرتبہ روش صدیقی نے خود محمد سے کہا تھا کہ ابتدا میں راشد نے اپنے کلام پر ان سے اصلاح

لی۔ لیکن جلد ہی وہ مدائنی عشقیہ اور غنائیہ شاعری کو ترک کر کے میراجی (فدہ نمبر ۳۳۴) اور نصرت حسین خالد کے ساتھ مل کر آزاد نظم نگاری کرنے لگے۔

ایم اے کرنے کے بعد اپنی افتادِ طبع کے باعث، اسٹوڈنٹوں نے چاہا کہ والد کے اثر سے کہیں محکمہ تعلیم میں ملازمت، مل جائے۔ جناب فضل الہی اس زمانے میں پنجوڑیہ میں تعینات تھے۔ یہ ان کے پاس پہنچے، لیکن یہاں کوئے کامیابی نہ ہوئی۔ جلد ہی والد کا تباہ و برباد ملتان ہو گیا، اور یہ بھی ان کے ساتھ وہاں چلے گئے۔ یہ وہ زمانہ ہے، جب حکومت پنجاب نے دیہات سدھار کا کام وسیع پیمانے پر شروع کر رکھا تھا۔ (سر) مالک ڈارلنگ اس محکمہ کا کڑا دھڑا اور مشرورین ان کے دستِ راست تھے۔ من جملہ اور باتوں کے مختلف مقامات سے ایسے رسالے شائع ہونے لگے جن میں دیہاتی زندگی کی بہتری اور دیہاتیوں کی بہبودی کے موضوع پر مضامین چھپتے تھے۔ اسی طرح کا ایک ماہنامہ "ملتان" ملتان سے بھی نکلتا تھا۔ شاید اس کے ادارہ تحریر سے وابستہ ہو گئے جہاں وہ دوبرس رہے، اور پھر ۱۹۳۳ء میں واپس لاہور آ گئے۔

لاہور کے علمی حلقوں میں وہ اجنبی نہیں تھے۔ مولانا احسن الدین "تاجور نجیب آبادی" (۱۵ جنوری ۱۹۱۶ء) اس زمانے میں اپنا مشہور ماہنامہ "شاہکار" شائع کرتے تھے۔ انھوں نے راشد کو نائب مدیر کی جگہ پیش کی۔ شاہکار صرف ۳۵ روپے تھا، لیکن مزنا کیا نہ کرتا، تنخواہ کم ہونے کے باوجود راشد نے پیشکش قبول کرنی۔ مگر یہاں کی فضا سے جلد ہی دل اچاٹ ہو گیا۔ تاجور نے رسالے کا کاروباری صیفہ اپنے برادرِ بقی سلیمان خان کے سپرد کر رکھا تھا، راشد کی ان سے کسی بات پر چل گئی۔ تنخواہ پہلے ہی ناکافی تھی، ۱۹۳۵ء میں شادی بھی ہو گئی تھی جس سے ذمہ داریاں مضاعف ہو گئیں۔ انھوں نے تنخواہ میں اضافے کی درخواست کی، جو مولانا تاجور نے رد کر دی۔ اس پر دل برداشتہ ہو کر راشد نے استعفیٰ دے دیا اور ملتان کی راہ لی! اور وہاں کٹنر کے دفتر

میں کلرک بن گئے۔

ملتان کے زمانہ قیام کا ایک واقعہ ذیل ذکر ہے :

یہ خاکسار تحریک کے شباب کا زمانہ تھا۔ یہ تحریک علما و عنایت اللہ مشرقی (ف) :
اگست ۱۹۶۳ء نے ۱۹۶۱ء میں شروع کی تھی۔ یہاں اس کے حساس قیام پر بحث
کرنا بھل ہو گا۔ جن لوگوں نے اس زمانے میں خاکساروں کو خاکی دروی ڈالنے،
مذہبوں پر سیلے رکھے، بازاروں میں نوحی مارچ کرتے دیکھا ہے، وہی کچھ ان کے
عزائم کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ راشد شروع سے نظم و ضبط کی زندگی کے قائل
رہے تھے۔ انھیں خاکساروں کی تنظیم اور باقاعدگی بہت پسند آئی۔ غرض وہ
اس تحریک میں شامل ہو گئے اور رفتہ رفتہ ضلع بھر کے رضا کاروں کے سالار
کے عہدے تک پہنچ گئے۔ لیکن ان لوگوں کی آمریت ان کے خلق سے نہ اتر سکی
اور سال ہی بھر بعد وہ اس سے الگ ہو گئے۔

ملتان کا یہ زمانہ ان کے لیے بہت تکلیف دہ تھا۔ انھوں نے اپنی آمدنی میں اضافے
کی غرض سے روسی مصنف ایگنرینڈ کو پرین کے ناول "یاما" کا اردو میں ترجمہ
کیا کہ شاید اس سے کچھ یافت ہو لیکن ناشر نے انھیں ایک جہہ بھی نہ دیا، بلکہ
کتاب پر سمیٹیت مترجم ان کا نام تک شائع نہیں کیا۔

انقص صورت حال سخت نا تسلی بخش تھی۔ خانہ داری کی روز افزوں دود و دیا،
تنخواہ قلیل، اور کام ان کے مذاق کے بالکل خلاف۔ ان کے لیے ملتان میں کوئی
ادراکشش بھی نہیں رہی، لیکن احتیاج انسان کو سب کچھ برداشت کر لینے
پر مجبور کر دیتی ہے۔ بہر حال وہ یہاں سے نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتے رہے۔
اور بالآخر مئی ۱۹۶۱ء میں آل انڈیا ریڈیو، لاہور کے دفتر میں پروگرام اسٹنٹ
کی نوکری مل گئی چند ہفتے بعد اسی عہدے پر دہلی تبا دلہ ہو گیا اور یہاں
ترقی کر کے پروگرام ڈائریکٹر کے عہدے تک پہنچے۔ ۱۹۶۹ء میں دوسری
جنگ عظیم شروع ہو گئی اور ریڈیو کے محکمے کے ڈائریکٹر جنرل سید احمد شاہ

بھائی پطرس^۹ مرحوم (ف: دسمبر ۱۹۵۸ء) نے ادیبوں کی کمیپ کی کمیپ کو فوج میں عارضی کمیشن دیا اور محکمہ تعلقاتِ عامہ میں سبقتی کرا دیا۔ اسی ریلے میں راشد بھی کہتان بن گئے اور عراق، ایران، مصر، سری لنکا (سبیلون) میں چار برس گزار کر وسطِ م ۱۹۶۱ء میں وطن واپس آئے، اور دوبارہ آل انڈیا ریڈیو سے منسلک ہو گئے۔ تھوڑے ہی دن لکھنؤ میں اسٹنٹ اسٹیشن ڈائریکٹر رہے تھے کہ ملک تقسیم ہو گیا اور پاکستان چلے گئے۔ پشاور ملا ہو کر میں دو ڈھائی سال گزارنے کے بعد ان کا ریڈیو پاکستان کے مرکزی دفتر کراچی میں بحیثیت مدیرِ تعلقاتِ عامہ تقرر ہو گیا۔ اس کے بعد کوئی دو سال پشاور میں ریجنل ڈائریکٹر بھی رہے۔

۱۹۵۲ء میں انھیں اقوامِ متحدہ (نیویارک) میں ملازمت مل گئی۔ اس سلسلے میں انھوں نے نیویارک، انڈونیشیا، پاکستان، ایران میں ۱۵-۱۶ برس گزارے ۱۹۷۳ء میں ملازمت سے پنشن پر سبکدوش ہوئے، تو مستقل سکونت انگلستان میں اختیار کر لی۔ پہلے لندن میں ایک کرایے کے مکان میں قیام رہے ۱۹۷۵ء کے اواخر میں "چیلینج" میں اپنا مکان خرید لیا۔

ان کی پہلی بیوی ان کے ماموں کی بیٹی تھیں۔ اس بیگم سے ان کے پانچ بچے ہوئے، چار بیٹیاں: نسرین، یاسمین، اشاہین اور حمزہ؛ اور ایک بیٹا: شہزاد۔ بغضِ سب سے زندہ ہیں۔ شہزاد پاکستانی سفارتخاں برسلز (بلجیم) میں ملازم ہیں۔ (۱۹۷۵ء) بڑی دونوں لڑکیوں کی شادی ہو چکی ہے۔

اس بیگم کا اکتوبر ۱۹۶۱ء میں انتقال ہو گیا۔ اس زمانے میں وہ نیویارک میں مقیم تھے۔ یہاں ان کی چھوٹی بچی تمیزین یو این او کے اسکول میں پڑھتی تھیں۔ اسکول میں اس کی اسٹانی مس شیلہ انجیلینی تھیں۔ اس خاتون کے والد اطالوی نسل کے اور ماں انگریز ہے۔ وہ خود ڈرامہ نگار ہیں۔ سوتوں روم (اطالیہ) کے انٹرنیشنل اسکول میں پڑھاتی رہیں اور جس زمانے میں راشد نیویارک میں تھے،

یہ وہاں یوں رہا، اس کے انٹرنیشنل اسکول میں ملازم تھیں جب راشد کی بیوی کا انتقال ہو گیا، تو انھوں نے دو سال بعد ستمبر ۱۹۶۳ء میں ان سے شادی کر لی۔ ان کے بطن سے ۱۹۶۷ء میں بیٹا پیدا ہوا جس کا نام انھوں نے 'نزیل' رکھا۔

جون ۱۹۷۵ء میں ان کے خسر مسٹر نجیبی کا لندن میں انتقال ہو گیا، اور ان کی لاش جنو بی لندن کے برقی شمشان میں جلائی گئی۔ راشد بھی جناح سے کے ساتھ تھے۔ جب لاش جل رہی تھی انھوں نے وہاں کے منتظمین سے دریافت کیا کہ اس کا طریقہ کیا ہے؟ جب انھیں بتایا گیا، تو کہایہ تو بہت آسان اور صاف خطرناک طریقہ ہے۔ بیوی سے کہنے لگے کہ جب میں مردوں، تو میری لاش بھی اسی طرح جلائی جائے۔ یہ بات انھوں نے بیوی سے پھر ایک موقع پر دہرائی، بلکہ جب ان کا بیٹا شہر بار برس لے گئے تو لندن آیا، تو اس سے بھی کہا کہ 'میاں، میرے مرنے پر میری لاش برقی شمشان میں جلا دینا'۔

مسٹر شیلہ راشد کا بھائی روما میں تھا۔ اس کی موت کا تاریخ شہر بردہ روماء چلی گئیں۔ رومائی سے پہلے انھوں نے راشد سے کہا تھا کہ آپ بعد کو میری والدہ کو ساتھ لے کر دما آجائیے گا۔ راشد ۹ اکتوبر کو اپنے مسکن چیلش ہم سے وائی اسٹیڈ آئے۔ اسٹیشن پر اترنے کے بعد وہ کس ہاتھ میں بے پیدل اپنی خوشدامن کے مکان گئے۔ انھیں انجانا کی شکایت پہلے سے تھی۔ ہاتھ میں بو جھل جس لیے تقریباً میل بھر کے اس پیدل سفر نے انھیں بالکل نڈھال کر دیا۔ منزل مقصود پر پہنچنے کے کوئی دس منٹ بعد شام کے ساڑھے سات بجے ان پرول کا دوسرا پڑا اور اس سے پیشتر کہ کوئی طبی امداد پہنچ سکے، وہ جاں بحق ہو گئے۔ یکم روماء سے اور بیٹا شہر بار برس لے آئے تو ۱۴ اکتوبر ۱۹۷۵ء دن کے چار بجے ان

یہ نام انھوں نے اپنے نام (ذکرہ) کے پہلے خلیفہ اور بیوی کے نام (شیلہ) کے آخری حصے سے ترکیب دیکر بنایا ہے (وہ بیوی کو شیل کے نام سے پکارنے لگے تھے) یوں عربی میں نزیل کے معنی ہیں کہلا

کے جسہ رخا کی کو ان کی خواہش کے مطابق، جنونی لندن کے سرقی شمشان میں نذر آتش کر دیا گیا۔

چونکہ لاش کا جلانا، اسلام کی روایات کے خلاف ہے، اس لیے لندن میں قیام میسر مسلمانوں نے تجبیز و تکفین اور جنازے میں شمولیت نہیں کی تھی، مشکل سے آٹھ دن آدمی جنازے کے ساتھ تھے اور وہ بھی ان کے ذاتی دوست۔

راشد کے تین مجربے چھپ چکے ہیں: (۱) مادرا (۱۹۴۲ء)؛ (۲) ابرار میں اجنبی (۱۹۵۵ء)؛ (۳) لا۔ انسان (۱۹۶۹ء)۔ بعد کا کلام بھی مدون شدہ موجود ہے، اور یقیناً چھپ جائیگا۔ اس کے علاوہ انھوں نے بعض ترجمے کیے تھے، ان میں سے سبھی تین شائع ہو چکے ہیں، گوہرین کے ناول ”یاما“ کا ذکر اوپر آچکا ہے، ولیم سیروین کے ناول (The 11th Hour) کا ترجمہ اور نورین آیز نے

کا ناول (وقت کا آسمان) بھی چھپ چکے ہیں۔ آخری زمانے میں وہ جدید فارسی کا وسیع مطالعہ کر رہے تھے، اور انھوں نے ۲۰-۲۲ ایرانی شاعروں کی تخلیقات کا اردو میں ترجمہ بھی کیا تھا، یہ تراجم بھی شائع ہو رہے ہیں

یہ کہنا مبالغہ نہیں ہو گا کہ جب ۱۹۴۲ء میں ان کا پہلا مجموعہ ”مادرا“ شائع ہوا ہے، تو ادبی اور تنقیدی حلقوں میں گویا سہو خیال سا آگیا۔ اس سے پہلے ہیئت کے تجربے تو ایک زمانے سے ہو رہے تھے، لیکن کہا گیا کہ انھوں نے صنعتِ ابہام کو بدنامی حد تک استعمال کیا ہے اور غنئی عربانی کھلے بندوں ان کے ہاں ہے، انہی اس سے پہلے کہیں اور نہیں تھی۔ یہ جارحانہ تنقید میسران اصحاب کی طرف سے ہوئی، جو دکتوریائی مہر کے اخلاقی قواعد و ضوابط کے زیر اثر عورت اور اس کے متعلقات کا برسرِ عام نوکر بھی بد اخلاقی (بلکہ گناہ) تصور کرتے تھے۔ حیاتِ انتہائی نے تو اپنی تنقید ”نم راشد پر“ کے عنوان سے کتنا نیچے کی شکل میں شائع بھی کر دی تھی۔ مئی نومبر ۱۹۴۵ء) لیکن ان کے بچے راشد نے ان مخالفانہ حملوں کی پروا نہ کی، اور اپنی انتخاب کردہ راہ پر گامزن رہے۔ ”لا۔ انسان“ کے شروع میں

ان کا ایک طویل مصاحبہ (انٹرویو) چھپا ہے، جس سے ان کی شاعری کے کئی گوشے
مکشفی میں آتے ہیں، اور اس سے ان کے کلام کے سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔
بہر حال، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اردو شاعری کی تاریخ میں راشد کا مقام محفوظ
ہے۔

نمونے کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

بوئے آدم زاد

بوئے آدم زاد آئی ہے کہاں سے ناگہاں ؟

دیو ہں جنگل کے ستارے میں ہیں

ہو گئے زنجیر پا خود ان کے قدموں کے نشاں !

یہ وہی جنگل ہے جس کے مرغزاروں میں سدا

چاندنی راتوں میں وہ بیخوف و غم رقعاں رہے

آج اسی جنگل میں ان کے پاؤں شل ہیں، ہاتھ مرد

ان کی آنکھیں نور سے محروم، پتھرائی ہوئی

ایک ہی جھوکے سے ان کا رنگ زرد

ایسے دیوؤں کے لیے بس ایک ہی جھونکا بہت

کون ہے بابِ برد ؟

ایک سایہ دیکھتا ہے چھپ کے ماہ و سال کی شاخوں سے آج

دیکھتا ہے بے صدا اثر و لیدہ شاخوں سے انہیں

ہو گئے ہیں کیسے اس کی بو سے ابتر حال دیو

بن گئے ہیں موسم کی تشال دیو

ہاں اترا تینکا آدم زادان مشائخوں سے رات
حوصلے دیووں کے مات !

گداگر

جن گندہ گاہوں پہ دیکھا ہے بچا ہوں نے لہو
یا سیہ عورت کی آنکھوں میں یہ سہم
کیا یہ اونچے شہر رہ جائینگے بس شہروں کا وہم
میں گداگر اور مراد یوزہ فہم

راہ سپانی معا اور عافیت کوشی گدا کا ننگ پا ،
آ رہی ہے ساحروں کی ، شعبہ سازوں کی صبح
تیز پا ، گرداب آسا ، ناچتی ، بڑھتی ہوئی
اک نئے سدرہ کے نیچے ، اک نئے انسان کی ہو
تابہ کے روکینگے ہم کو چارٹو

کیا کہینگے اس نئے انسان سے ہم
ہم تھے کچھ انسان سے کم ؟
ننگ پر کرتے تھے ہم باران سنگ
سختی ہماری ساز و گل ، نغمہ و محبت سے جنگ
آدمی زادے کے سایے سے بھی ننگ ؟

داشتہ

میں ترے خندہ بیباک سے پہچان گیا
کہ تری رُوح کو کھاتا سا چلا جاتا ہے

کھوکھلا کرنا چلا جاتا ہے، کوئی اہم ذرہ گداز
میں تو اس پہلی ملاقات میں یہ جان گیا

آج یہ دیکھ کے حیرت نہ ہوئی
مگر تری آنکھوں سے چپ چاپ برسنے لگے دھنکوں کے سحاب
اس پہ حیرت تو نہیں تھی، لیکن
کسی دیرائے میں سمنے ہوئے خوابیدہ پرندے کی طرح
ایک مبہم سا خیال
دفعۃً ذہن کے گوشے میں ہوا بال فشاں
کہ تجھے میری تمنا تو نہیں ہو سکتی
آج لیکن مری باہنوں کے سہارے کی تمنا ہے ضرور
یہ ترے گریہ فناک سے میں جان گیا —
تجھ سے وابستگی شوق بھی ہے
جو چٹکی پیلنے میں سیار وہ دلسوزی بھی
مجھ سے، مجبورِ ازل جس پہ ہیں مجبورِ ازل !
نفسِ خود ہیں کی تسلی کے لیے
وہ سہارا بھی تجھے دینے کو آمادہ ہوں
تجھے اندوہ کی دلیل سے جو آزاد کرے !
کوئی اندیشہ ہے تو یہی
تیرے ان آنکھوں میں اک لمحہ کی نو میدی کا پرتو ہو لیکن
اور عجب وقت کی امواج کو ساحل مل جاتے
یہ سہارا تری رسوائی کا اک اور بہانہ بن جاتے
جس طرح شہر کا وہ سب سے بڑا مرد لٹیم

جسم کی مژدہ شبانہ دے کر
 بن کے رزاق، تری تذلیل کیے جاتا ہے
 میں بھی باہنوں کا سہارا دے کر
 تری آئینہ کی توہین کا مجرم بن جاؤں
 سبا ویران

سلیماں سر بزانو اور سبا ویران
 سبا ویراں، سبا آسیب کا مسکن
 سبا آلام کا انبار بے پایاں
 گلیاں و سبز گل سے جہاں خالی
 ہوائیں تشدّ با ماں
 طہور اس دشت کے منقار دیر پُر
 تو سرمہ در گلو انسان
 سلیماں سر بزانو، اور سبا ویران

سلیماں سر بزانو، ترشتر و غمگین، پریشاں مٹو
 جہاں گبری، جہانپانی، فقط طر آئے آہر
 محبت شعلہ پڑاں، ہوس بوسے گل بے بو
 ز، زانو دہر کتر چو
 سبا ویراں کہ اب تک اس زمیں پر ہیں
 کسی عیار کے غار نگروں کے نقش پا باقی
 سبا باقی، نہ ہر دے سبا باقی
 سلیماں سر بزانو

اب کہاں سے قاصدِ فرخندہ لے آئے
 کہاں سے، کس سبب سے کاسۂ پیری میں لے آئے

شورش کاشمیری، عبدالکریم (آغا)

ان کا خاندان کشمیری، ذات برہمن، گوت ڈاوتھی۔ بزرگوں میں کوئی مشرف باسلام ہو گیا تھا۔ بچا بچا ان کے پردا سرینگر سے ہمارا جاگلاب سنگھ کے عہد میں تغل مکان کر کے امرتسر (پنجاب) میں آئے تھے۔ لیکن ان کے دادا امیر بخش اس بات پر ان سے ماضی ہو کر لاہور چلے آئے، اور ایک دو ڈالار (دو روپے) پر ایک تودھکا کر کشمیری باقر خانی اور چلیے بچھنے لگے۔ خوب کما اور خوب اڑایا۔

ان کے دو بیٹے تھے، ایک عبدالکریم کے والد نظام الدین (ف: ۱۳۰۶) پرلی ۱۹۵۶ء اور دوسرے ان سے بڑے جن، کامیں غنواں شباب میں بعمر ۱۶-۱۷ سال تپ بھرق سے انتقال ہو گیا۔ باپ کی توہم پرستی نے انہیں سمجھا یا کر بٹیا اس لیے ہاتھ سے نکل گیا کہ سہ وقت بکھنے پر جتنے میں مشغول رہتا تھا۔ انہوں نے حفظہ باقاعدہ کے طور پر چھوٹے بیٹے کو اسکول سے اٹھا لیا کہ اس پر کئی لمبے نہ آئے۔ اکلوتا بیٹا اور گھر میں فراغت، لاڈ چاؤ کی کمی نہیں تھی۔ لیکن جابلہ ہو گیا کوئی ستر بھی نہ سمجھا۔ جب تک باپ کا کامدار عروج پر رہا، یہ بھی عیش کرتے رہے۔ لیکن باپ کے چولہے تھے، ان کے لیے تو تادین کا خزانہ بھی کفایت نہیں کر سکتا تھا۔ دوپہر ڈھلنے لگی، تو فکر ہوئی کہ کیا کر گیا! ایک دوست کی دستاویز سے ایک مین کے کا رخانے میں ملازم ہو گئے۔ دو ایک سال میں یہاں چل نکلے، تو ریلوے وکٹاپ میں جگہ مل گئی۔ لیکن بعد کو پرانے ہمارے خاں کے منہ بالک کے اصرار پر واپس چلے

آئے، اور پھر کہیں اور نوکری نہیں کی۔

عبد الکریم ۱۳ اگست ۱۹۱۷ء کو لاہور میں پیدا ہوئے، تعلیم دیوبند ہائی اسکول، انارکلی لاہور میں پائی۔ ۱۹۱۶ء-۱۹۲۸ء کا ہندوستان سیاسی سرگرمیوں کے باعث شعلہ و تہوار بنا ہوا تھا۔ سامن کیشن میں کئی ہندوستانی کاشانی ذکرناور سے ملک نے اپنی توہین کی تصویر کیا اور اس سے تحریک آزادی کی وقار اور تیز ہو گئی۔ نوجوانوں پر اس کا خاص طور پر بہت گہرا اثر ہوا۔ شہر شہر خفیہ اور دہشت پسند جماعتیں قائم ہو چکیں۔

اسی زمانے میں عبد الکریم نے ایک ہندو دوست کے ساتھ مل کر۔ بال بھارت سبھا قائم کی۔ عبد الکریم نے بہت کم عمری میں مولانا ظفر علی خان (ف: نومبر ۱۹۵۶ء) کے دوڑنا ”زمیندار“ کا باقاعدہ مطالعہ شروع کر دیا تھا۔ یہ اخبار گھر میں آتا تھا، ان کی دایہ بال سے پڑھا کرتی تھیں۔ عبد الکریم نے یہ عادت انھیں سے لی۔ زمیندار کی ڈن ڈن ظفر علی خان کی خطابت اور مصافحتی شاعری۔ ان سب باتوں کا اثر جو اب عبد الکریم کے کردار اور مستقبل کی تشکیل میں بڑا اہم تھا رہا۔

اب عبد الکریم باقاعدہ سیاسی تحریک میں شامل ہو گئے۔ انھوں نے مسکے پہلی تقریر جولائی ۱۹۲۵ء میں شہید گنج کے محلے کے دونوں میں شاہی مسجد لاہور میں کی۔ اس پر گرفتار کر لیے گئے، مقدمہ چلا، اور دو سال قید اور تین سو روپے جرمانے کی منرائی لیکن اپیل میں جرمانہ معاف ہو گیا، اور ایک ماہ کی حوالات اور تین ماہ کی قید کے بعد مل ہو کر گھر آ گئے۔

لیکن اس کے بعد جیل جانا گویا آئے دن کی رسم بن گئی۔ ۱۹۳۵ء سے ۱۹۳۹ء تک ہرمال جیل جینے جیل میں گزرنے لگے، اور ستمبر ۱۹۳۹ء سے آزاد اور ۱۹۴۴ء تک سلسل پانچ سال، اگرچہ سزاسات برس کی ہونی تھی۔ حالات کی پیچیدگی کا کچھ اندازہ اس سے کیجیے کہ ۱۹۴۴ء تک یعنی جب ان کی عمر صرف ۲۷ برس کی تھی، وہ اس کا ایک تہائی (یعنی ۹ برس) جیل میں بسر کر چکے تھے۔ (دوبی ۱۹۲۹ء میں وہ مجلس احرار میں شامل

ہو گئے۔

اب سوال یہ تھا کہ سب اوقات کی کیا صورت ہو۔ ان کی صلاحیتوں اور اوقات و طبع کو دیکھتے ہوئے احباب نے سوچ بچار کے بعد طے کیا کہ ان کے لیے ایک اشاعتی ادارہ قائم کیا جائے۔ ایک سمدرد و محنت و وسوسہ نے دو ہزار روپے کا عطیہ دیا جس سے مکتبہ احراء کے نام سے ایک ادارہ وجود میں آیا۔ لیکن یہ نام ہی اسے لے ڈوبا۔ شہید گنج کے تھقیے کے بعد مجلس احراء کی ساکھ عوام میں کوڑی بھری نہیں رہی تھی۔ اب بھلا ان کے نام پر قائم کردہ ادارہ کیونکر کامیاب ہو سکتا تھا؟ نتیجہ یہ ہوا کہ اگرچہ اس کتبے کی طرف سے تین کتابیں شائع ہوئیں، لیکن نفع جو بھی رہا ہو، عبدالمکریم کو اس میں سے ایک پائی نہیں ملی۔ رفتہ رفتہ سارا سرمایہ بھی منتقلوں کی سہل انگاری اور نا تجربہ کاری کے باعث ضائع ہو گیا۔

اب سب لوگ ان سے شادی کے لیے اصرار کرنے لگے۔ بالآخر ۲ مئی ۱۹۳۵ء کو ان کی انبائے میں شادی ہو گئی۔ (دھن زخوردیدہ) ان کے اموں کی بیٹی تھیں۔ یہ انھیں لے کر لاہور واپس پہنچے، تو دعوتِ اہمید میں دوسرے احباب کے ساتھ مولانا ظفر علی خان گیا تھے۔ انھوں نے اور تجالائیں شہر کا قطعہ کہا:

گرجم یکے قاصد یہ مشرت زہ پیام آ یا
کہ انبائے سے شورش یک پھنڈا سی وطن آ یا
مرے دل سے دعا نکلی کہ اس جہٹے کے سر پر جو
نئی کی رحمتوں کا اور عدل کے فضل کا ساتا
مبارک ہو تھیں شورشش! یہ تیری خانہ آبادی
تسے گھر آگئی اک اور انگریزوں کی فراہمی

بعض وجود بہت باہر کھڑے ہیں، خاص طور پر بیوی۔ دتے دادی بڑھ جاتی ہے اور انسان میں کام کرنے کا نیا دلولہ اور نئی ہنگام پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی صورت یہاں بھی پیش آئی۔ شادی کے بعد عبدالمکریم نے انتہائی سنجیدگی اور فرض شناسی کے احساس سے مستقل

آمدنی کے وسائل پیدا کرنے پر توجہ کی؛ اور بفضلِ اس میں انھیں کامیابی ہوئی۔ انھوں نے مختلف ہسپتالوں کے اہل سے اجرت پر کام لیا۔ ان کے مسودوں کی تصحیح، ترتیب، نظر ثانی کے علاوہ خود بھی کچھ لکھتے اور اس طرح چار پانچ سو روپے ماہانہ یافت ہونے لگی۔ پھر مشہور کانگریسی لیڈر لالہ ہنڈی داس (ف، جولائی ۱۹۶۹ء) کے داماد پروردہ چندر کے دوستوں نے ان میں وزیر پنجاب بھی رہے) ساتھ مل کر ایک پبلشنگ ہاؤس قائم کیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد (ف، فردی: ۱۹۵۸ء) کی مشہور کتاب 'غبارِ طرہ' کا دوسرا ایڈیشن (جس میں موسیقی سے متعلق ایک خط کا اضافہ تھا) اسی ادارہ نے شائع کیا تھا۔ اس ادارے کی طرف سے بعض اور کتابیں بھی شائع ہوئی تھیں، لیکن تقسیم ملک میں اس کا سارا اثاثہ برباد ہو گیا۔

آزادی ملک سے پہلے مجلسِ احرار کی طرف سے تھوڑی مدت کے لیے ایک روزنامہ 'آفاقہ' نکلا تھا۔ اس کے شعبہ ادارت میں کئی نام تھے، لیکن یہ امر واقع ہے کہ اس کا بیشتر کام شورش ہی کرتے تھے۔ لیکن یہ پرچہ دولتِ شعل ثابت ہوا۔ تقسیم ملک کے ساتھ ہی یہ بند ہو گیا۔ تقسیم کے ساتھ ہی انھوں نے مجلسِ احرار سے اپنا تعلق ختم کر دیا اور اس کے بعد کسی سیاسی جماعت کے رکن نہیں بنے۔ اب انھوں نے صوفیت کو اپنا اور طحا، کچھوٹا بنالیا۔ ۱۹۹۴ء میں انھوں نے اپنا سقہ و لہجہ چٹان جاری کیا، جو آج تک باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے۔

مسلسل فیڈک زندگی نے ان کی صحت خراب کر دی تھی اور وہ اکثر بیمار رہنے لگے تھے ۲۷ اکتوبر ۱۹۷۵ء کو تیز معدہ کا شدید دورہ پڑا جس پر بغرض علاج یواسپتال (لاہور) میں داخل ہو گئے۔ دو تین دن کی دواؤں سے کچھ افادہ ہو گیا، سب نے اطمینان کی سانس لی لیکن ۲۳ اکتوبر کی شب میں طبیعت ایک گھنٹہ پھر خراب ہو گئی اور نصف شب کے تھوڑی دیر بعد (ساتھ سے بارہ بجے یعنی ۲۵ اکتوبر ۱۹۷۵ء) کے آدھ وقت حرکتِ قلب بند ہو جانے سے ضابطہ بات بھی تبدیل ہو کر یہ کہنا شروع ہونے لگا کہ اس ایڈیشن کے لیے مولانا آزاد کو دس ہزار روپے بطور حق تعینت ادا کیے گئے تھے۔

جان بحق چھوٹے۔ جنازہ بروہہ سہفتہ ۲۵ اکتوبر کی شام میں اٹھا اور میانی صاحب کے
(مشہور قبرستان) میں سپرد خاک ہوئے۔ چادر لٹکے اور سات لڑکیاں جسمانی یادگار
چھوڑیں۔

دیس امر دہوی نے تاریخ بھی،

یاد شورشِ نین ہے اشکوں کی تراوشی لے دل !
دوسرے میں غم بھر سے سوزش ۱۰ سے دل !
سوزشِ غم میں نہاں فکر کی کاوش اے دل !
مائل شورشِ غم ہے غم شورش ۱۰ سے دل !

۶۱۹۷۵

ان کی تعلیم جیسا کہ پہچان میں، نامکمل رہ گئی تھی۔ لیکن انھوں نے وسیع مطالعے سے یہ کمی
پوری کر لی۔ خوش بختی سے انھیں اپنے عہد کے خواجہ پر علم و ادب کی رفاقت اور صحبت کے
مواقع ملے اور انھوں نے ان سے پوری طرح استفادہ کیا۔ ان پر مولانا ابوالکلام آزادؒ
مولانا ظفر علی خانؒ، اور سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کا خاص اثر رہا۔ مولانا آزادؒ سے شعر کا
پیشکشہ انداز سیکھا، مولانا ظفر علی خانؒ کے تہقیر میں صوفی شاعری وغنیاء کی، اور
عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی پیروی میں وہ شعلہ بیان خطیب بن گئے۔ مولانا آزادؒ کی معنوی
شاگردی پر انھوں نے خود یوں فخر کا اظہار کیا ہے :

کسی ذلیل قلم کار سے تعلق کیا !
را کا شکر ہے، تلمیذ ابوالکلام ہوں میں۔

موجودہ قاتی جنگامی شاعری میں ظفر علی خانؒ کو جو یہ طولی حاصل تھا، وہ کسی سے مخفی نہیں۔
شورشِ اسیرِ مدائن میں اللہ کے قدم بقدم چلے اور اس میں ایسی حیرت انگیز کامیابی حاصل کی کہ
مولانا ظفر علی خانؒ کو یہ مسئلہ دینا پڑا :

شورش سے مراد شہ ہے، اور وہ اذلی ہے
میں دکن کا دشم ہوں، تو وہ شالی بہر آب

اسی باعث رشید احمد صدیقی نے کہا تھا: شورش کا شمعیری ابوالکلام کے طنطنہ، نظم اور نظم
علی خان کے سہجہ انشا کا وارث ہے۔

انھوں نے مختلف اوقات میں اپنے کلام پر مولانا ظفر علی خان، ابوجو نجیب آبادی اور احسان
دانش سے اصلاح لی۔ بلکہ احسان قریشی سوانحی میں لکھتے ہیں کہ پہلے یہ انفت تخلص کرتے
تھے، شورش تخلص انھیں احسان ہی نے دیا تھا؛ نیز وہ آخر تک اپنا کلام انھیں رکھاتے
رہے۔ وہ کبھی کبھی اسرار اور بصیر کے تخلص نام سے بھی لکھتے رہے۔ یہ نام انھوں نے
۱۹۲۲ء میں جیل سے رہائی اور گھر پر نظر بندی کے دوران میں اختیار کیا تھا کیونکہ ان کی
نقل و حرکت اور تحریر و تقریر پر پابندی عائد تھی۔

نظم و نثر کا خاصا ذخیرہ ان کی زندگی میں شائع ہو گیا تھا۔ ان میں چار کتابیں (۱) ہونے لگی
مالا دل، (۲) حیرانہ فعل، (۳) ۱۹۰۷ء کی ایک حک سے پہلے کی سوانحی؛ (۴) پس دیوار
زندہان (۵) آزادی سے پہلے جیل کی دس سالہ داستان؛ (۶) موت سے واپسی (عبد اقبال
میں امیری کے ۲۲ دن کی کہانی)؛ (۷) تھک خدمت (ساہیوال جیل کے تین مہینے ستر دن
کے حالات)؛ گویا فودنوش سوانح کا حصہ ہیں؛ (۸) ”شب جاے کہ من بودم“ سفرنامہ
ہماچل ہے۔

ان کے کلام کے تین مجموعے شائع ہوئے۔ (۱) گفستی تا گفستی؛ (۲) چہ قلندرانہ گفتیم؛ (۳)
الہیاد، الہیاد۔ انھوں نے بعض شاعروں کے نام شاعری کے نام بھی لکھے تھے۔
(۴) حسین شہید سہروردی؛ (۵) حمید نظامی؛ (۶) میان انقلاب و دین؛ (۷) شید عطا اللہ
شاہ نچاوی۔ چہرے: مختصر خاکے (دکھائی ۱۹۶۵ء)

ایک کتاب اس بار میں ”بناام تھیلنے کی کہانی ہے“ فیضانِ اقبال“ میں علامہ اقبال
کے ”خطبات، مقالات، ارشادات اور خطوط“ کا ”افشرہ و عصارہ“ (درس) پیش کیا ہے۔
اس کتاب میں اقبال کے خیالات کو دس مختلف عنوانوں کے تحت جمع کیا ہے۔ اور بھی کئی
کتابیں ہیں۔

ان کا کلام بہت مختار ہے۔ بطورِ نمونہ صرف ایک شعر نظم پر گفتگو کرتا ہوں۔

شر الدواب عند اللہ

دباں بگڑی، قلم بگڑا، روش بگڑی، چلن بگڑا
 خود اپنے ہاتھ سے کارگروں کا پسین بگڑا
 چلا کھینز کا جھگڑا کہ شرق و غرب کا آب آگے
 اٹھیں دشنام کی آندھی، مزاجِ اہرمن بگڑا
 چامقود، غیرت نرنگوں، خوںِ خدا غائب
 کچھ اس انداز سے بدعتِ فروتنوں کا چلن بگڑا
 کروں طولِ سخن، تو باتِ حربِ ناروا ہوگی
 کلامِ مختصر یہ ہے کہ ہر لات و دشمن بگڑا
 میں اکڑ سوچتا ہوں کس طرف سے ان کو سمجھاؤں
 یہ جو کچھ کر رہے ہیں، اس سے نعلم انجمن بگڑا
 یہی وہ گفتگو ہے، نا زہے جس کی بلاغت پر
 یہی وہ مہم ہے جس سے اسلوبِ سخن بگڑا
 خدا کے ایک بندوں کو کہاں تک گالیاں دوں گے؟
 کر دے کیا، اگر اس پر خدا سے ذوالین بگڑا
 دے گئے منہ بھی چڑانے، دیتے دیتے گالیاں مچھا
 زبان بگڑی تو بگڑی تھی، خبر یہی دہن بگڑا

ہزار کھنوی، سید حسن

اللہ کے مورث نقوی سادات میں سے تھے۔ ہدایت ہے کہ ان کے بزرگ عہد شجاع الدولہ (۱۷۵۳ء - ۱۷۸۵ء) میں ایران سے کھنؤ آئے اور بہاؤ بلند مراتب پر فائز ہو گئے۔ سید حسن ہزار نے شاعری گویا ورثے میں پائی۔ ان کے والد سید جعفر حسین عرف محمد صاحب شعر کہتے اور بہاد مخلص کرتے تھے؛ وہ سائنہ القوم سید علی نقی صفی کھنوی (ف، جون ۱۹۵۰ء) کے شاگرد تھے۔ لالہ مرزا رام نے انھیں نصاحت کا شاگرد دکھا ہے، لیکن ہزار ایک تحریر میں انھیں صفی کا شاگرد کہتے ہیں۔ ممکن ہے دونوں سے یکے بعد دیگرے مشورہ رہا ہو، یا شاید لالہ مرزا رام کو غلط اطلاع ملی ہو کھنؤ کی انجمن معین الادب اپنی ادنی سرگرمیوں اور خدمات کے نیچے کسی وطن میں معروف تھی۔ اس کے سالانہ مشاعرے بڑے مزیدار و اختتام ہو کرتے تھے جن میں باہر کے مشاہیر بھی شریک ہوتے۔ بہاد توڑوں اس انجمن کے سکرتھ رہا۔ جب ان کا انتقال ہو گیا، تو ان کے احباب نے ان کھنؤ کی کی تجویز پر اس انجمن کا نام بدل کر "انجمن بہاد ادب" کر دیا۔

بہاد تو خیر ان کے والد ہی تھے۔ ان کے علاوہ نئے آغا صاحب اور کھنوی، حکیم محنتی آغا صاحب آفتاب، سید محمد ہادی حویزی بھی اہل خانہ ان کے فرد تھے۔ گویا اللہ کے بچپن میں چاروں طرف کا خضر: سید علی ہمدانی (بہاد کے بیٹے)، سید کوہا اب انسر کھنوی اور کاظم علی خان صاحب (خاندان کھنؤ)

شاعری کا چسپاں تھا۔ گھر کی مشغولیات تک اس سے مستثنیٰ نہیں تھیں۔ ہنزا نے اپنی احوال میں پرورش پائی، بچپن ہی میں وہ اپنے والد بہار کے ساتھ مشاعروں میں جانے لگے تھے؛ وہاں اپنے والد کی کچھ ہوئے چند شعر پڑھ دیتے۔ ہنزا جنکھن بھی والد کے جنکھن بہار کی مناسبت سے اختیار کیا تھا۔ انیسویں کو بہار کا بہت جلد انتقال ہو گیا، اور یہ ان سے استفادہ نہ کر سکے۔ بالآخر جب ہنزا عہد شاعری کرنے لگے تو مولانا عبد الباقی ان کا زلف (جنوری ۱۹۴۶ء) سے اصلاح کا رشتہ تمام کر دیا۔

ہنزا کی شیک تار سنج ولادت معلوم نہیں ہوگی۔ والد کے بعد ان کے چچا، سر جی حسین ان کے کفیل ہوئے۔ وہ انھیں اپنے ساتھ سینا پور لے گئے اور وہاں ان کا گورنمنٹ ہائی اسکول میں داخلہ ہو گیا؛ ۱۹۴۱ء میں دسویں کی سند ملی۔ اس کے بعد تعلیم جاری نہ رکھ سکے اور نہ شاعری کی تعلیم انھیں کوئی اور کام کرنے کی فرصت دی۔ اگرچہ ان کی تعلیم کچھ زیادہ نہیں تھی، لیکن انھوں نے خواتین مطالعے سے اس کی بہت حد تک تلافی کر لی تھی۔

وہ شروع میں لکھنؤ پرنسپل بورڈ میں ملازم ہوئے، لیکن یہاں غالباً زیادہ دن نہیں رہے۔ ۱۹۴۷ء کے لگ بھگ راجا رانے گڑھ لے آئیں، ان کا دوبارہ شاعر مقرر کر دیا۔ بعد کو وہ راجا صاحب موصوف کے ادبی سکریٹری بھی بن گئے۔ ایک موقع پر خوش ہو کر راجا صاحب نے انھیں تین تہے سونے کا میڈل اور "عندلیب" میں خطاب عطا فرمایا تھا۔

انھیں تپ دہی کا پرانا نانا، ضرتھا۔ اس کے علاوہ خون کے کم ہاؤ اور طلب کن تکلیف بھی تھی۔ بہت ظالم ہوئے۔ یونی حکومت نے بھی ظلم کے لیے امداد دی اس سے حالت کچھ بہتر ہو گئی۔ ۳ نومبر ۱۹۷۷ء کو کسی کام سے کا پورہ گئے۔ وہیں شام کے وقت ایک ٹرولر میں دل کا شدید درد ہوا۔ اور آنا نا جان بخت ہو گئے۔ اگلے دن (۲ نومبر ۱۹۷۷ء) کو کا پورہ میں باطیوں کے ہیکے کے سامنے نیچے جٹو شاہ میں سپرد خاک کر دیئے گئے۔ کہاں مر سرتی، اور کہاں کی مٹی تھیں میں کھ تھی۔ سچ ہے "فَا نَذَرِیْ نَفْسِیْ بِاَیَّامِیْ؟ تَعْمَلُ مَا اِنَّكَ اللهُ عَلَیْکُمْ خَیْرٌ"

وے گڑھ کے قیام کے زمانے میں شاہی کتھی؛ اس جگہ کے بطن سے ایک بیٹی (لیکن) ہوئی
یہ شاہ اشد زندہ ہیں اور اپنے خاندان کے ساتھ گھنٹوں رہتی ہیں۔ ہزاروں اس بیوی کا
جلد ہی انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد انھوں نے کاغذ ثانی نہیں کیا، بقیہ عمر تھرد میں
گزر ادوی۔

انھوں نے غزل، مہنام، قصیدہ، نظم۔ بہت کچھ لکھا۔ انہوں نے کوئی مجموعہ کلام ان کی
زندگی میں شائع نہیں ہوا۔ تلاش بسیار کے باوجود ان کا کلام دستیاب نہیں ہوا۔ صرف
ایک غزل ملی؛ اسی کو چون کاغذ ثانی نہیں کر رہے ہیں۔

جلو ماتحت آشنا، آہ منہ باطل نہیں
صاحبان فکر جو چاہیں تھریں وہ فیصلہ
میرے ماتھے کی پیکر ہیں، ہیں جلالِ شرفی
اب خدا ہی ناظر ہیں جائے تو ہے اور رہا
ظلم ڈھانے کے لیے بھی جو صلہ درکار ہے
ایکے اپنے لیے، وہ دھوپ یا چھاؤ ہو
مہرانی سے تری، بتر تغافل تھا ترا
اپنی عزت و عہد شاہی کی حدوں سے دودھ

کوئی بھی سینہ مرے دل کا منتقل نہیں
میں ہی کہتا رہو لگا، میں کسی قابل نہیں
میں بغیر بیٹا تو ہوں، مگر سائل نہیں
ورنہ میری خدا کاں میں کہیں ساحل نہیں
تنگنہ کے ذہن اعلیٰ کا کوئی قابل نہیں
ہم مسافر ہیں، باری کوئی بھی منزل نہیں
وہ بھی کوئی بات ہے، جس کا کوئی حاصل نہیں
شویشِ طوفان وہیں مشرب ساحل نہیں

اسے خیر ار؛ اس دور میں غفلت کی منزل وار ہے

یہ صولے صبور، آوازِ شکستِ دل نہیں

طالب دہلوی شیش چندر سکینہ

دلی کے ایک متمول کاشتور (سکینہ) گھرانے کے چشمہ دجراغے تھے۔ ان کے والد راسے صاحب ہمیشہ داس (آنریبل ممبر سٹیٹ) کا انبالہ بھادونی میں شراب فروش کا بڑا وسیع کامدار تھا۔ کسی زمانے میں پورے پنجاب (قبل آزادی) میں مسکراہٹ کا تھیکہ اسی خاندان کے پاس تھا۔ خاندان کے متول کا اندازہ کچھ اس سے کیجیے کہ دلی میں دریاے جہاں کا پرانا پل طالب کے دادا راسے صاحب سالگ رام (ف: ۱۹۱۷ء) نے حکومت سے ٹھیکہ لے کر تیار کروایا تھا۔ ایک مرتبہ انھوں نے کانکا جی کے مندر (دلی) کے پاس کا شہر براہروی کا جلسہ کیا۔ اس میں آٹھ ہزار افراد نے شرکت کی تھی، سب لوگ راسے صاحب سالگ رام کے مہمان تھے کہا جاتا ہے کہ اس جلسے پر ان کا ایک لاکھ روپیہ خرچ ہوا تھا۔

زادہ بدستے دیر نہیں گنتی۔ کچھ داسے صاحب ہمیشہ داس کی تہارت کے جوڑے توڑے سے ناواقفیت اور برائی حد تک اسامیوں کی ہے ایمانی کے باعث کاروبار میں سخت نقصان ہوا۔ جن لوگوں سے لینا تھا، انھوں نے دینے سے انکار کر دیا، جنہیں لینا تھا، وہ تقاضا کرنے لگے۔ داسے صاحب نے کسی لوگوں کو اپنی ضمانت پر مختلف جگہ سے قرض دلوا رکھا تھا، قرضداروں نے یہ حالت دیکھی تو اپنے واجبات کا مطالبہ ان سے کر دیا، اور یہ بھی دینا پڑے۔ غرض دیکھتے دیکھتے لاکھ لاکھ گھر واکہ ہو گیا۔ لیکن کسی چیز کو دوام نہیں، کسی طرح وہ وقت بھی نکل گیا اور خاندان پھراپنے پائوں پر کھڑا ہو گیا۔

طالب کی پیدائش ۱۳ فروری ۱۹۱۰ء کو انبالہ چھاؤنی میں ہوئی تھی۔ ان سے ایک چھوٹے بھائی نش چند ایم اے لاہور، ایک اربچ ۱۹۱۵ء میں، جنہوں نے صحافت کو بطور پیشہ اختیار کیا۔ انشا اللہ حیات ہیں۔

طالب کی ابتدائی تعلیم انبالہ چھاؤنی میں ہوئی اور انہوں نے ۱۹۲۵ء میں بنارس وکس اینڈ اسکول، انبالہ چھاؤنی سے دسویں کی سند لی۔ اس کے بعد سائنس کالج، دلی میں داخلہ لیا جہاں سے ۱۹۲۸ء میں دلی یونیورسٹی سے انٹر کا امتحان پاس کیا۔ اسی دوران میں ۱۹ اپریل ۱۹۲۷ء کو ان کے والد بڑے صاحب ہیش داس کا انتقال ہو گیا۔ انٹر کے بعد انہوں نے بی اے میں داخلہ لیا تھا لیکن گھر کے تبدیل شدہ حالات کے پیش نظر وہ تعلیم جاری نہ رکھ سکے، اور یہ سلسلہ مجبوراً منقطع کرنا پڑا۔ رفتہ رفتہ جب حالات سدھ گئے اور پھر فرصت نصیب ہوئی، تو انہوں نے بی اے ۱۹۳۲ء میں ہندو کالج، دلی سے پاس کیا۔

باشی لاکھ لے گا پھر بھی سوا لاکھ کا۔ بہت اگلے تعلقہ میں تاہم، خدا کے فضل و کرم سے گھر کی مالی حالت اس نہیں تھی کہ انہیں بسر و قاتح کے لیے کسی نوکری کی ضرورت پیش آئی، لیکن میکا کی زندگی بھی تو نہیں کمشتی، وہ ۱۹۲۷ء سے شریک بن گئے تھے، بعد ازاں میں اپنے چھوٹے بھائی نش بہادر جی بہادر برقی دہلوی (دف: فروری ۱۹۳۶ء سے شہرہ رلیہ۔ برقی خود آغا شاعر و ناٹک نویس، اربچ ۱۹۳۰ء) کے شاگرد تھے۔ اس طرح گویا طالب کا سلسلہ داخلہ کے واسطے سے خاندان ذوق سے جاملے۔

شہر گوئی کے شوق نے طالب کو اسکا کہ وہ صحافی بنینگے۔ اس زلزلے میں دیش بند ہو گیا دف: نومبر ۱۹۳۵ء کے اخبار "نیچ" کا طومل بولتا تھا۔ طالب صحافت کی تربیت حاصل کرنے کو اس کے دفتر پہنچے کسی معاذ خضر یا تنخواہ کے بغیر چھ ماہ وہاں کام کیا۔ اس کے بعد حکومت ہند کے ماسٹرا آف جیکل، (ادوو)، ایچکن ریلوڈ، ڈسٹرکٹر (راجستھان) اور بعض اور پرچوں سے تعلق رہا۔ کہیں طویل، کہیں مختصر لیکن کسی جگہ مستقل تعلق قائم نہ کر سکے۔

ان کی وضع داری کا ایک قصہ سنئے:

سچہ سچا اس طرح کہ برقی کا بوجھ، طالب کے والد ذلے ہیش، اس کے گئے چچا کی صاحبزادی بنیں۔

نشی ہمارا بیجا رہا اور برقی کا انتقال بہت اچانک اور افسوسناک حالات میں ہوا تھا۔ ۱۲ فروری ۱۹۳۶ء کو وہ اپنے دوست شنگل چندوشن پانی پتی کی صاحبزادی کی شادی کی تقریب میں شرکت کے لیے پانی پت گئے؛ وہی کے کئی اور شعرا بھی گئے تھے۔ وہیں شب میں ان کی طبیعت خراب ہو گئی، اور اسی حالت میں حرکت قلب بند ہو جانے سے حث پٹ ہو گئے۔

فاجعے ۱۹۳۷ء میں ان کی برسی کے دن اپنے مکان ہمایک شاعرے کا انتظام کیا۔ اس کے بعد ۱۹۴۷ء کو کچھوڑ کر چونکہ اس سال فرقہ وادان فسادات کے باعث نضاہت کد تھی، یہ سلسلہ بلاناغہ ۱۹۵۰ء تک جاری رہا۔ ۱۹۵۱ء میں شری حتر گپت سہلنے پٹیکش کی کو آئندہ یہ شاعرہ ان کی عداوت میں ہو کرے۔ وہاں ۱۹۶۱ء میں پھسول (جولہ) منتر ہوا اور اسی کے ساتھ یہ سلسلہ بند کر دیا گیا۔

۱۹۳۲ء میں ان کی شادی گوالیار کے ایک معزز گھرانے میں ہوئی، چند رکاردی بیوی کا نام تھلا دلا دیں خدا سنے تین بیٹے اور ایک بیٹی عطا کی۔ تینوں بیٹے صغریٰ میں داغ مفارقت دے گئے، ریٹ (نگلیت) مجدد زندہ ہیں۔ ان کی شادی ڈاکٹر بشن مراد کی لائل سیکند کے ساتھ ہوئی تھی؛ جو آج کل کیلیڈ اسکے شہر پٹیلن کے اسپتال میں ماہر امراض داخلی کی حیثیت سے کام کرتے ہیں۔ یہاں بیوی اپنے بچوں کے ساتھ وہیں مقیم ہیں۔

طالب صاحب اپنی بیٹی اور اس کے بچوں سے ملنے کے لیے وسط ۱۹۷۰ء میں کینیڈا گئے تھے۔ وہاں سے تھریس واپس آئے۔ بلنا ہر صحت بالکل ٹھیک تھی۔ لیکن کیسے معلوم تھا کہ موت اتنی قریب ہے۔ ۱۳ نومبر ۱۹۷۷ء صبح کے وقت ناٹک کا حملہ ہوا؛ ۱۵-۱۶ کی شب میں ڈیڑھ بجے علی الصبح (ارون اسپتال ہی میں جان بحق ہو گئے)۔

طالب کو نظموں، نثر و نثر سے کیاں مزادلت تھی۔ ترجمہ بھی اچھا کرتے تھے۔ ان کے ترجمہ شدہ افسانے مختلف رسالوں میں منتشر ہوئے ہیں، ان کی یہ کتابیں چھپ چکی ہیں؛ (۱) دکن والا شعری انتخاب؛ (۲) حرفِ ناتمام؛ برق صاحب سے متعلق مضامین؛ (۳) یادگار برقی؛ برق صاحب سے متعلق مضامین (۱۹۳۵ء)؛ ہمارے حسین (دلی) ۱۹۴۵ء (۵) انوارِ نظر؛

(۶) خدیجک ناڈ؛ (۷) تختانی کیفی (دولت ۱۹۵۱ء)؛ (۸) کشمیری سیر، سفرنامہ (دولت ۱۹۶۶ء)
 (۹) ہنزہ و یگانہ، غزولوں کا انتخاب (دولت ۱۹۶۸ء)؛ (۱۰) یہ کتنی دل، (۱۹۳۷ء تا ۱۹۴۷ء)
 کی دہلی کی ادبی سرگرمیوں کی داستان (دولت ۱۹۷۵ء)

کلام نچتہ ہے جس میں ابتداء کا شائبہ تک نہیں مضمون آفرینی کی کوشش ہر حصے سے عیاں ہے کلام نچتہ اور بدعیب ہے۔ کہیں کہیں زبان کی چاشنی بھی ملتی ہے چند شعر بطور نمونہ درج ذیل ہیں:

کسی کو غم کھسی کا ہے کسی کو غم کس کا ہے بعض ان دگر سب ایک ہی افادہ کہتے ہیں
 مری خطا کتنی دیتے اگر نگاہ بے نگاہ دی ہے تو مجبور اختیار سوں میں
 وہ دل جو تنگ نظر ہے اس قدر مدد اسی میں وسعت کون و مکان تکلیفگی
 اس نیک کامزائیں ہر ایک کو نصیب بچنے کا لطف حلقہ وارد سن میں ہے
 یہ اتیارِ اوشا ہے ہر ایک نفس نہ بزم میں یگانہ و یگانہ ایک ہے
 سکون دل نہیں جس کے نصیب پر طالب اسے کہیں کبھی میسر خوشی نہیں ہوتی
 محبت، امداد ہے کفر و دین ہے محبت کا کوئی مذہب نہیں ہے
 محبت، حسن ہے، حسن آفرین ہے محبت، حسن سے بڑھ کر خیر ہے
 بھروسہ کیا کرے کوئی کسی پر! جو اپنا ہے، وہی اپنا نہیں ہے
 ہوئے جاتے ہیں آپ کیوں بوجہ! ہم دانے کی بات کہتے ہیں
 تم پر اپنا گام ہوتا ہے تم سے جب دل کی بات کہتے ہیں
 لذت ہے بہار کی خسراں سے جب موت نہیں، حیات کیا ہے!
 محروم دیدہ بھی دہا، یہ اور بات ہے سرنگاہ تک تو مادی نظر لگی

اسے غفل میں بھی تنہا سمجھو جسے احساس ہو تنہائی کا

ایک بوجہ کے کچھ ان سے تھا: دقت آیا ہے پذیرائی کا

گل ہوئی ہے نہاں تو دل سے، نظر میں اس کے دل لگی ہو

یہ دل لگی ہے، تو باز آئے، خواب ہم بس دل لگی سے

تھیں نور منصفی سے کہہ دو یقین کیسے کسی کو آئے
 تھکے دھکے کا تھیک ہی کیا، تھکی کسی سے کبھی کسی سے
 رکھینگے کیا یاد رکھنے والے کو آئے تھے نرم آنکھوں میں
 جو زندگی کے یہ چاروں بھی کٹے نہ طالب نہیں خوشی

دکھ دینا آسان بہت ہے دکھ سہنا آسان نہیں ہے
 دلفت خود عنوان ہے اپنا اس کا کچھ عنوان نہیں ہے
 ادبوں کے جو کام نہ آئے کام کا وہ انسان نہیں ہے
 مجھ سے دکر کرے کوئی آشیانے کا جن پرست ہوں، مجھ سے حسن کی بالور
 اب خوشی میں بھی بھرا آتی ہیں بہادی آنکھیں

وقت بے وقت کی ہر سادہ کہاں تھی پہلے !
 مٹا ہو گا کوئی اس طرح راہ محبت میں کہ وہ اپنا، بدل اپنا، نہ پہلو میں جگر اپنا
 کرم سے، دوسے، اخلاق سے، ہر مرد کا مرا جیسے، بنا لے تو دل دشمن میں گھر اپنا
 پردے میں عیاں کے جو ہوتا ہے نمایاں ناقابل برداشت ہے وہ جو روقاب اور
 دیر پردہ بھی دیکھا، تجھے بے پردہ بھی دیکھا وہ شانِ حجاب اور تنگی، یہ شانِ حجاب اور
 یاد بھولے سے کرینگے نہ کبھی اور بھولے سے اگر یاد آیا !
 یاد آتا تھا بہر حال جسے شام بھولے، تو سحر یاد آیا

عجیب لطف ہے، کھاتے ہیں اور بھی نہیں
 وہ ایک میں 'جو ہر اقراء پر یقین کروں' جب اعتبار کے قابل سخن نہیں رہتا
 عشرت ذات نہیں وصل دگر بر موتوں وہ ایک تم، جسے پاس سخن نہیں رہتا
 دل کی آواز کو کہتے ہیں، خدا کی آواز شگب قطرہ ہے سمندر میں فنا ہو جانا
 مفرق آیا ازل سے زینت گلزار بہشتی میں ہو مبادک اسے دنیا کی صدا ہو جانا

بہار اس کی، بہارِ جاوہر معلوم ہوتی ہے

بھی چشمِ قبول اس کی طرف مائل نہیں شاید
 ابھی ہر سس، سس راگیاں معلوم ہوتی ہے

یہ خوش قسمی ہے اپنی، یا لگا و نداد کا حباد

تہنیں « بھی اب تو عالم تیری پاؤں معلوم ہوتی ہے

تیری محفل میں پہنچنے کو تو ہم بھی پہنچے — پھر جانوں کی نظر آئی، مذاہبانوں کی
کچھ اس انداز سے اپنوں نے نوازا ہے حقیقتیں یاد بہت آئی ہیں بیگانوں کی
بہر مغناں ہو کر ہی رہیگا، وہ جو ہونا ہے

ترے اندیشہ سود و ذریاں سے کچھ نہیں ہوتا

کبھی راضی برضا ہو کے بھی دیکھو غائب! ہر نفس، کوشش و تدبیر کہاں تک اسٹو!
مغاس، انگ نہیں، عیب نہیں، جرم نہیں

لیکن افلاس کا احساس بڑا ہوتا ہے

بات بادیک ہے، شکل سے سمجھ پاؤ گے

جس کو کہتے ہیں دعا، وہ بھی گلا ہوتا ہے

بے ذہانی زبان ہو کے رہی ہر نظر داستان ہو کے رہی

محوی صدیقی لکھنوی، محمد حسین

لکھنؤ کے ایک سرہم آلودہ خانہ خانی کے فروختے، جس میں دین اور دنیا دونوں کا اجتماع تھا۔ ان کے دادا مولانا محمد صافی علی جدید عالم اور حافظ قرآن بزرگ تھے۔ کہا جاتا ہے کہ انھیں "عمیلیات" میں بھی یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ ان کے فرزند حافظ علی حسین تھے۔ وہ بھی اپنی خاموشی و روایات کے دارش اور عربی فاضل کے عالم تھے۔ نادری میں شریکتے تھے؛ فو ز تخلص تھا برصغیر کے لیے خطاطی اور خوشنویسی کا پیشہ اختیار کیا، اور اس سلسلے میں اس زمانے کے مشہور و مبطلے نو لکھنوی تیس روپہاں شاہرہ پر ملازم ہو گئے۔ یہی زمانہ ہے، جب نواب صدیقی حسن خان مرحوم (ف ۱۸۶۰ء) نے بھوپال میں تصنیف و تالیف کا کام دیکھ کر چلنے پر شروع کیا اور ریاست میں اس کے لیے ایک باقاعدہ دفتر کی تشکیل کی۔ انھوں نے فنی لونی کشور داف (فروئی ۱۸۹۵ء) کو بکھا کر آپ کے یہاں تعلق و نسخ کا جو بہترین کاتب ہو ۲۰ سے بھوپال بھیج دیجیے۔ اس پر فنی صاحب موصوف نے حافظ علی حسین صاحب کو بھوپال جانے پر آمادہ کر دیا۔ یہ جب بھوپال پہنچے، تو تو نواب صاحب موصوف نے ان کی بہت آؤ بھگت کی اور اپنے ہاں کی کتابت کا جملہ کام ان کی نگرانی میں دے دیا۔ پچاس روپیہ ماہانہ تنخواہ منقول ہوئی۔ نواب صاحب کی زندگی تک وہ یہ کام کرتے رہے۔ ان کا انتقال بھی بھوپال ہی میں ہوا۔ وہیں قبرستان "گلچہ شہیدان" میں مدفون ہیں۔

یہی حافظ علی حسین ہمارے محوی صدیقی کے والد بزرگوار تھے۔ محوی لکھنوی ہیں ۱۵ مئی

۱۸۹۱ء (۶ شوال ۱۳۰۸ھ) کو پیدا ہوئے۔ تعلیم کا مرحلہ آیا، تو اس کا انتظام گھر پر ہوا۔ اس کے بعد فرنگی محل کے مدرسہ نظامیہ میں داخلہ لیا۔ اور تکمیل اپنے والد کی تنگی میں بھوپال میں کی؛ مدرسہ احمدیہ سے عربی کی، اور مدرسہ سیلیمانہ سے فارسی کی سند فیضیت پائی۔

تعلیم کے بعد ۱۹۱۱ء میں نکھنٹو آئے اور یہاں باپانہ "اتن خطر" سے وابستہ ہو گئے۔ یہاں ۱۹۱۶ء تک یعنی پانچ برس، اولاً اس کے انتظامی اور پھر اوقاف شعبے میں کام کرتے رہے۔ اسی زمانے میں ان کی شاپر حبیبہ علیہم سرور، فصاحت نکھنٹو، علی محمد عارف نکھنٹو، پیادے صاحب رشید، جالب دلوی، وحید الدین سلیم، چنگیت نکھنٹو، اکبر الہ آبادی وغیرہ سے ملاقاتیں رہیں۔ اس سے انھیں اپنے دل و دماغ کی غنی صلاحیتوں پر حلاکت اور انھیں برص کا دلانے میں بڑی مدد ملی۔ ۱۹۱۴ء میں انجمن ترقی اُردو کا ایک جلسہ نکھنٹو میں ہوا تھا۔ یہیں محوی کی ملاقات مولوی عبدالحی مرحوم (ف، اگست ۱۹۱۶ء) سے بھی ہوئی، جس سے بعد کو انھیں بہت فائدہ پہنچا۔

۱۹۱۶ء میں ان کے والد حافظ علی حسین بہت بیمار ہو گئے۔ اس پر محوی صاحب نکھنٹو سے بھوپال چلے گئے، اور یہاں انھیں ریاست کے دفتر تادمج میں عربی ترجمہ کی جگہ مل گئی، ان کی کتاب "ازدواج الانبیاء و نکھنٹو" ۱۹۱۶ء میں زمانے میں لکھی گئی تھی۔ دو سال بعد ۱۹۱۸ء میں وہ نکھنٹو واپس آ گئے۔ یہاں انھوں نے اپنا "دارۃ ادبیہ" قائم کیا۔ "انسانی ترقی" کی تصنیف اور اشاعت اسی زمانے میں ہوئی۔ (نکھنٹو، ۱۹۱۹ء)

نکھنٹو میں کوئی سال بھر حجام مل ہو گا کہ مولانا عبدالقادر آزاد سجانی (ف، جون ۱۹۵۷ء) نے انھیں کانپور طلب کیا۔ آزاد سجانی مرحوم کا نام ہادی تحریک آزادی اور تحریک خلافت میں بہت نمایاں ہے۔ انھیں فلسفے سے بہت شغف تھا۔ اسی لیے وہ اپنا نام سجانی قبائلی لکھا کرتے تھے۔ انھوں نے کانپور میں مدرسہ انبیاء قائم کیا تھا۔ محوی صاحب کو اسی مدرسے میں عربی پڑھانے کے لیے بلا یا گیا تھا۔ محوی سال بھر کانپور میں رہ کر علی گڑھ چلے گئے، اور جامعہ قیہ کے شعبہ تصنیف و تالیف میں کام کرتے رہے۔ اسی زمانے میں انھوں نے

”مفتاح ناصری“ اور تاریخ فیروز شاہی“ لا تزح کپا۔

جیسا کہ بیان ہوا، اتفاقاً غزوہ کی ملازمت کے زمانے میں ان کا مولوی عبدالحق مرحوم سے تعارف ہو گیا تھا جو نکرہ ریوڈنگا کی طرف سے پریشان تھے، اور اپنی استعداد اور استعداد کے باوجود انھیں ہمیں جرم کر بیٹھنے کی جگہ نہیں ملی تھی، انھوں نے مولوی عبدالحق سے رجوع کیا اور وہ ان کی درخواست کی موصوفت و جواہر ان اور جو نہادادہ جوں کی جو صلاح فرمائی پر ہمیشہ تیار رہتے تھے انھوں نے عوی کو اورنگ آباد دجایا جہاں وہ خود اس زمانے میں کالج کے پرنسپل اور انجمن ترقی اردو کے سکریٹری بھی تھے۔ سو درپیر ماہانہ تحفہ مقرر ہوئی تھی، لیکن جب یہ اورنگ آباد پہنچا تو مولوی صاحب نے خود یہ بڑھا کر ایک سو پندرہ کر دی۔ یہ ۱۹۲۲ء کی بات ہے اورنگ آباد میں ان کا قیام ۱۹۲۹ء تک رہا۔ اس زمانے میں وہ انجمن کی انگریزی رازد و کشری کی ترتیب میں بھی شریک رہتے تھے۔

۱۹۳۸ء میں وہ دہ راس چلے گئے۔ اولاً اجمالیہ عربک کانٹہ میں عربی کے استاد رہے، بعد کو مدائن
یونیورسٹی میں مدرس (لکچرر) مقرر ہو گئے۔ یہاں سے ۱۹۵۲ء میں سبکو دوش ہوئے یہاں
کی تفسیقی و تاریخی زندگی کا سب سے بارور زمانہ ہے۔ یہاں انھوں نے دیوان میر تقی میر
دہلوی (۱۹۳۵ء) واقعاتِ اظہری اور دیوانِ اظہری، اردو فارسی (۱۹۳۶ء) میر تقی
خان (مجددی کا انور نامہ ۱۹۳۲ء) اور کلیاتِ قادسی (۱۹۵۵ء-۱۹۵۴ء) بالکل نیا شعرا
مردوخش (۱۹۵۵ء) مرتب کیں، ان پر دیباچے اور حواشی لکھے، اور یہ سب کتابیں مدائن
یونیورسٹی کے زیرِ اہتمام شائع ہوئیں۔

مدرسہ کا سلسلہ منقطع ہونے کے بعد انھوں نے سبھو پال میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔
پہرے بچنے بچنے کا سلسلہ یہاں بھی جاری رہا۔ یہاں انھوں نے بچوں کے لیے کسی کہانیاں لکھیں جو
اس زمانے میں شائع ہو چکی تھیں۔

انھیں شہر گوئی کا شوق دہشتہ میں ملا تھا۔ ان کا کلام ۱۹۰۶ء ہی سے موقت انیسویں
 رسائل میں شائع ہونے لگا تھا۔ لیکن ابھی تک انھوں نے کسی سے باقاعدہ اصلاح کا تعلق
 پیدا نہیں کیا تھا۔ ۱۹۱۰ء میں انھوں نے احمد علی شوق قدوائی (ف: اپریل ۱۹۲۵ء)

کی شاگردی اختیار کی اور استاد کی زندگی بھران سے مشورہ کرتے رہے۔ اب بھوپال میں منتقل قیام اختیار کرنے کے بعد انھوں نے اپنا کلام بھی جمع کرنا شروع کیا یعنی کلام ”نعت فردوس“ کے نام سے چھپا (بھوپال، ۱۹۸۶ء) اور دنیا میں کلام کا مجموعہ ”آبشار کے عنوان سے (لکھنؤ، ۱۹۷۱ء)۔ اس سے مدتوں پہلے ایک طویل نظم ”شاعر کا دل“ کے عنوان سے بھی چھپی تھی (مداس، ۱۹۳۸ء) لیکن افسوس کہ غزلیات کا دیوان نہیں چھپ سکا، حال آنکہ ان کی بڑی ترنتا تھی گو یہ محفوظ ہو جائے کسی زمانے میں ان کے شاگرد جو ہر جاندوڑی نے ان کے سوشلوں کا ایک مختصر مجموعہ چھاپا تھا۔ (لکھنؤ، ۱۹۳۸ء) اب یہ بھی نایاب ہے۔ بہر حال، اگر پورا کلام نہیں، تو ان کا ایک نامیندہ انتخاب شائع ہو جانا چاہیے۔ انھوں نے اور بھی نظم و نثر کا بہت ذخیرہ چھوڑا ہے۔

ستمبر ۱۹۷۲ء سے حالات کا مسئلہ شروع ہوا۔ اس سال مزمین کی تکلیف تھی۔ ہر طرح کے علاج کیے لیکن کس سے فائدہ نہیں ہوا۔ ۱۹۷۳ء تک بالکل داؤد و نزار ہو گئے؛ اٹھا، اٹھا چلا پھرنا تک دو بھر ہو گیا۔ ان میں بدھ کے دن ۱۹ نومبر ۱۹۷۵ء صبح آٹھ بجے کے بعد صبح نفس منہری سے پرواز کر گئی۔ ”اتالله و اتانا زینہ راجیوتہ“۔ بھوپال کے شاہی قبرستان ”ہرشہ باغ“ میں دفن ہوئے۔ سید حسن ہمدانی، حکیم مرزا دلہوی (جامعہ ملکہ، نئی دہلی) نے تاریخ کہن، جس کے پہلے مصرع سے عیسوی اور دوسرے مصرع سے ہجری سال برآورد ہوتا ہے :

اتھ گیا دنیا سے کیسا شاعر شیریں مقال (۱۹۷۵ء)

خادم اردو زبان مرحوم نوی لکھنوی (۱۳۹۵ء)

عمری مرحوم نے اپنی زندگی میں چار نکاح کیے۔ پہلی بوی لکھنؤ کی تھیں۔ شادی کے ایک سال بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ دوسری شادی بھی لکھنؤ میں ہوئی۔ ان کے ایک چچا ہوا تھا جس کے بعد وہ مسلسل بیمار رہنے لگیں۔ پہلے ان کی موت ہوئی اور پھر نو مود بھی چل بسا تیسری بوی بھوپال کی تھیں۔ ان سے دو لڑکے ہوئے: (۱) حامد حسین صدیقی، جو آج کی نیوکلار لائبریری میں مشغول اردو ناولس ہیں۔ (۲) محمد حسین؛ دوزخ انقلاب بھی

اب یہ پتا چلا کہ وطن کیوں عزیز ہے مدت کے بعد، گھر کو جو آئے سفر سے ہم
 تو ہی بتا، دل دیا نہ بھر کہاں جائے! جو اپنے گھر کے لیے ہے، دیر سے دور کے لیے
 دلوں سے یاس رخصت، اور رخصت، بیکس رخصت

وہ جان حسن، جانِ آرزو، جانِ شباب آیا
 ذکرِ چمن، ذکرِ نظیم، خدا کی شان! سہم کر تقس میب اور دل آرزو ہو گیا
 ہوں پر آہ، بایں اشک سے ترا، ہاتھ دل پر ہے
 کسی کی یاد ہے، اور رات کا خاموش منظر ہے
 سکون کی شورش کبابِ جہاں میں آرزو کیسی!

اوسے ناداں! یہ نعمت کچھ تربت میں میسر ہے
 رونے سے بھی کچھ دل کی تسکین نہیں ہوتی کچھ روز محبت میں یہ کام بھی کر دیکھا
 سرے عزم و وفا کی لان دکھ لی، سخت جانی نے

ہجومِ آرزو میں دردِ جینا کوئی آساں تھا؟
 رو رہا ہے دل، مگر اندر ہی بیویاں ہنس رہے ہیں ہم زمانے کو دکھانے کے لیے

بسل آبادی، سکھ دیو پرشاد سنہا (نشی)

۱۱ دسمبر ۱۸۹۹ء کو آبادی میں پیدا ہوئے۔ آبائی وطن بھوانی پور (ضلع رائے بریلی) ہے۔
جہاں سے ان کے جد امجد کسب معاش کے واسطے میں آباد آئے، اور پھر یہیں کے مورچے
بسل کے والد کا نام نشی بشینورہ یاں سنہا تھا۔ خاندان کی سکونت آباد کے مشہور محلے
میر گنج میں رہی، جس میں خیر و خاندان بھی رہتا تھا، کالیستھوں کی عربی فارسی سے رغبت
ان کے حلقے میں بھی آئی۔ تعلیم ان کے والدی اسکول اور کالینتھ پائشار کالج، آباد میں ہوئی
ابھی تعلیمی مرحلہ ہی میں تھے کہ مشورہ کہنے لگے۔

۱۹۱۸ء میں نوح نادرہی (ف)؛ اکتوبر ۱۹۶۲ء کی شاگردی اختیار کر لی۔ لیکن بعد کو کس بات
پر ان سے قطع تعلق ہو گیا۔ چونکہ اب ان کی مشق کافی ترقی کر چکی تھی اور زبان و بیان پر بھی
تقدیرت چال چو گئی تھی، لہذا اس حادثے سے انھیں کوئی خاص نقصان نہیں پہنچا۔ ان کا اد
اور نواح میں ان کے شاگردوں کا خاصا وسیع حلقہ تھا۔ پڑھتے بھی خوب تھے، ان کے کلام
میں سوز سے زیادہ نشاط کا عنصر نمایاں تھا۔ کلام کے دو مجموعے ”جذباتِ بسل“ اور ”انکا بسل“
کے عنوان سے چھپ چکے ہیں۔ اول پرمیاجہ سر عبد القادر کے قلم سے ہے، اور دوسرے پر کیرجی
جہاں کپہرو کے قلم سے۔ لیکن اس پر بھی ایک زمانہ گزر گیا، ابھی بہت کلام غیر مطبوعہ
ہو چکا۔

ساری عمر آباد کے میونسپل بورڈ میں ملازم رہے۔ وہاں سے سبکدوش ہوئے، تو اس کے بعد

کہیں اور ملازمت نہیں کی، اس کی ضرورت تھی نہیں تھی؛ بس اوقات کے لیے خدا کا دیا بہت کچھ تھا۔

صحت عموماً ہمیشہ اچھی رہی اور انھوں نے خاصی لمبی عمر پائی۔ چند دن کی معمولی علالت کے بعد ۲۳، ۲۴ نومبر ۱۹۷۷ء کی درمیانی شب (گو یا ۲۴ نومبر کے ابتدائی اوقات) میں حرکت قلب بند ہو جانے سے جاں بحق ہوئے۔ موت سے ایک دن پہلے انھوں نے تازہ غزل بھی تھیں، جس میں مصرع تھا:

بسل آیا ہے اکبلا، بسل جائیگا اکبلا

لیکن اسے غلط کر دکھایا ان کے ۲۸ سالہ بیٹے شہو شکر لال نے جب بسل کی جتا میں آگ لگائی جا رہی تھی، آتشہ شکر لال صدمے کی تاب نہ لاسکے، اور آٹا قاتا ان کے طلب کی حرکت بند ہو گئی

بسل کا شہری رشتہ نوح ناودی کے واسطے سے داغ دہلوی سے ملتا ہے۔ داغ اسکول نے زبان کو سلیس اور صاف ستھرا دکھنے میں جو خدمات انجام دی ہیں، وہ کسی سے مخفی نہیں۔ اس میدان میں داغ کے شاگردوں میں نوح کو اور بھی امتیاز حاصل تھا۔ بسل اپنے استاد کے دنگ میں اس حد تک دنگے ہوئے ہیں، کہ بیشتر اوقات دو لڑائی کے کلام میں امتیاز محال ہے۔ انھوں نے خود بھی خاندان داغ کا فرد ہونے پر اکثر فخر کیا ہے سمجھتے ہیں:

یہ کس کے منہ میں دبا ہے، جو کہ سکے بسل!

مری زبان نہیں، داغ کے گھبرانے کی

ہمارا سلسلہ ہے خاندان داغ سے بسل! جسے ہو سیکھا، وہ سیکھ لے اور دو زبان ہم جند شعر دیکھیے۔

عشق میں جلتی ہے مرکز، اہل دل کو زندگی
مطبعتِ ہستی، نیستی کے دور میں پاتا ہوں میں
وقتِ غیر موت کے آشاودیکھ کر
محبتِ شمع کی تنویر وہ مبادات کے ساتھ

خاک بھی اب نظر آتی نہیں پروازوں کی

تے دے ، تمہے کو جے سے ، اٹھنا تیر ممکن ہے

دکھائیگی ہیں جو گردشِ تقدیر ، دیکھینگے

آپ ل محفل سے اٹھنے کا نتیجہ یہ ہوا ————— تنگ اگر اٹھ گئے دنیا کی بھی محفل سے تم

ذاتی نیند، ذاتی قضا، نہ آئے آپ ————— تڑپ تڑپ کے شبِ انتظار دیکھ لیا

محفلِ ادب آیا موسمِ گل ، اٹھ رہے جوان پھولوں کی

اب پھول کے بلبل کہتی ہے ، پھولوں سے کہانی پھولوں کی

گلش میں نہ کیوں کر دل بچلے ، وہ سنتے ہیں میں بنا ہوا

پھولوں سے قنادِ بلبل کا ، بلبل سے کہانی پھولوں کی

بلبل کے منہ سے میٹک ، تقدیر اسی کی دھجی ہے

چل پھر کے مباحی چومتی ہے ، کیا کیا پشانی پھولوں کی

ہر موجد ہے اک پر وہ سازِ بہت ————— کھیلنے کو جالوں سے ہے رازِ بہت

کوششِ دُعا بھرنے کی کرو ، اے بلبل! ————— غرقابِ قضا ہو گا ، جہازِ بہت

قاصر، برہم ناتقدت (چودھری)

ایک قدیم سوہیال برہمن خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ان کی ذات دت، اور گوت بھاردواجی تھی اور پیدا ہونے ۳ ستمبر ۱۸۹۱ء کو صبح پانچ بجے ویرم دتان تحصیل شکر گڑھ، ضلع گودا پور (پنڈلی پاکستان) میں یقیناً بھائی بیساکر کے نام سے ظاہر ہے انھیں کے بزرگوں کا بیا بیا ہوا ہے۔

ان کے والد چودھری گوران دتان دت تعلیم یافتہ بزرگ تھے۔ اس نسل کے دتوں کے مطابق اُردو اور فارسی کا کثیرہ ذوق رکھتے تھے، انگریزی میں بھی دوسرے کے شریافتے تھے۔ لیکن انھوں نے گھری زمینداری کی دیکھ بھال کے علاوہ اور کوئی کام نہیں کیا۔ چودھری گوران دتان دت کے دادا یعنی قاصر کے جدِ اعلیٰ (خشی) ہمیشہ اس نامی کے قاضی اور بھاردا جاسو جیت گھر کے دیہاری اور شیرتھے۔ بعد کو قاصر کے دادا (خشی) شکر داس نے دیہانہ کام ترک کر کے اور اپنی جاداد کی نگرانی پر اکتفا کی۔ اس سے معلوم ہو گا کہ بفضل گھر میں علم و فضل بھی تھا اور دولت بھی۔

قاصر نے خود اپنی تاریخ ولادت دو جگہ لکھی ہے: ۱۳ جولائی ۱۸۹۰ء و دتال دتال پات پات (۱۱) بھادوں ۱۹۴۸ء بمقامی (۵) جنوری کی نوے سے پانچائیس ایک دوسرے کے مطابق نہیں

۱۳ جولائی ۱۸۹۰ء مطابق بمقامی ۱۳ ستمبر ۱۹۴۷ء کی سکے اور ۱۱ بھادوں ۱۹۴۸ء کی کوئی ۱۳ ستمبر ۱۸۹۱ء تھی۔ ان کے صاحبزادے ماکھو دتوانا دت کے نزدیک ۳ ستمبر ۱۸۹۱ء کی تاریخ مراد ہے کیونکہ بکری تاریخ انھوں نے روکھی کنی جگہ لکھی ہے؛ غالباً عیسوی تاریخ کے تئیں میں غلطی ہو گئی

چودھری گولڈاں دتھال بڑے مختار و مجدد و قسم کے انسان تھے۔ انہوں نے ان کا انجام بہت
 الناک حالات میں ہو جب ۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم کا اعلان ہوا، اور فیصلہ ہوا کہ گوردوارے
 کی تفصیل شوگر مہر (ویرم دتھان سمیت) پاکستان کا حصہ بنے گی، تو اعزہ و اقاہب کے مشورے
 اور راضیہ کے باوجود انہوں نے ویرم دتھان سے ہجرت کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ
 یہاں سب میرے دوست ہیں، یہیں کسی کا مخالف، نہ میرا کوئی دشمن۔ مجھے یہاں کیا تکلیف ہے
 کہ میں اپنا جہنم بھوم اور بزدلوں کا وطن ترک کر کے کسی اور جگہ جاؤں!۔ یہاں تک کہ
 انہوں نے پاکستان سے اپنی وقتی اور اخلاص اور وفاداری کے اعلان کے طور پر اپنے مکان
 پر پاکستانی جھنڈا بھی لگا دیا۔ لیکن تقدیر کا نوشتہ پورا ہو کر دم۔ چند دن بعد لوگوں نے
 ان کے گھر پر حملہ کر دیا، اور انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا۔

اب لپٹے کی تم نظریں لا دو سرا پہلو دیکھیے۔ فاضل صاحب اس زمانے میں امرتسر میں مقیم تھے۔
 تمہیکے کھیل کیا بان کا مکان جنونیوں نے اس لیے نذرِ بختیں کر دیا کہ انہوں نے اپنے
 مسلمان دوستوں اور ان کے خاندان کے افراد کو یہاں پناہ دی تھی۔ دلاور حسین (پرنسپل)
 ایم، اے او کالج، امرتسر، شیخ حاتم الدین راجہ راجی بیٹہ، مولانا محمد حسین عرشی (مشہور
 شاعر اور عالم) وغیرہ انہیں پناہ گزینوں میں تھے۔ فاضل صاحب کا ریشہ میت کا تھا۔ انہیں
 اسی حادثے میں جل کر داکھ ہو گیا وہ کہا کرتے تھے کہ مجھے مکان کے جل جانے کا اتنا افسوس
 نہیں، جتنا ان بھتی کتاؤں کے تلف ہونے کا، جو مجھے جان سے زیادہ عزیز تھیں
 بن الہ کے والد کی وفات کے واقعے کو بیان کرتے ہوئے بہت دوڑا لگا گیا۔

فاضل صاحب کے ابا باپنے اپنے گوردوارے کے مشورے سے ان کا نام برہم داس رکھا تھا،
 لیکن انہوں نے بعد کو اسے بدل کر برہم ناتھ کر لیا کہ بہر حال، داس (غلام) سے ناتھ
 (مالک) کا بہتر ہے۔ پڑھنے لکھنے کی منزل آئی، تو انہیں مقامی پرائمری مدرسے میں
 بشما دی گیا۔ یہاں پانچویں درجے تک تعلیم کا انتظام تھا۔ ٹرل کے درجن کے لیے گئی جرائو
 جانا پڑا۔ اور دسویں کی سند دیاں خٹک بائی اسکول، لاہور سے حاصل کی۔ اب انہوں نے
 دیانند ایگلو ویدک کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ لیکن خدا معلوم کیا جوگ پڑا کہ پڑھنے لکھنے

سے دل اٹھاٹ ہو گیا، بمشکل سال بھر یہاں رہے ہو گئے۔ والد نے دیکھا کہ بیٹاڑھنے کی گزلیں کا نہیں۔ تو بے پریشی میں بھرتی کرادیا۔ وہ جانتے تھے کہ اپنے اثر و رسوخ سے اسے جلد ترقی دلو کر تھا، نیا دارخجواؤں۔ لیکن یہ پیشہ صاحبزادے کی پسند کا نہیں تھا، چنانچہ جب وہاں سے حاضری کا پروانہ آیا، تو یہ حاضر ہوئے۔ والد کو اس کی خبر ملی، تو سخت ناراض ہوئے، اور اس غفلت کا اظہار اس طرح کیا کہ کہا، اگر بیٹاڑھنے مانستے، تو جاؤ جہاں سینگ سائیں، وہاں چلے جاؤ۔ والدہ، جب یہ ابھی دس بارہ برس کے تھے، حنفی سدا رکھتی تھیں۔ گھر میں اور کون تھا، جو والد کے اس جنسی حکم پر احتجاج کرتا یا انہیں پناہ دے سکتا تھا؟ یہ بھی اپنی بٹ کے کچے، پاپیادہ گھر سے کل کھڑے ہوئے، اور کہاں کہاں کی خاک جھانسنے کے بعد قلیل تنخواہ پر شاہ ر ضلع گورداسپور ہلکے لیکے جاکے ان کوئی کلا پھر اسی کے ساتھ دوقی چلے گئے اور یہاں ایک در آمد برآمد کا کام کرنے والی تجارتی فرم میں ملازم ہو گئے۔ کوئی سال بھر یعنی ۱۹۱۲ء تک یہاں رہے۔ اس کے بعد امرتسر چلے گئے اور وہاں ایک دوسری فرم دیسرتی رام چاوی لال کے ہاں ملازمت کرنی، ان کی بد میں فرموں سے خط و کتابت ان کے ذمے تھی۔

تدوین بعد انھوں نے یہ ملازمت ترک کر دی اور امرتسر میں اپنا ذاتی کاروبار شروع کر دیا۔ وہ یہاں سے سو قی تا گاؤں ساؤد کو برا کر کرتے تھے۔ بخر پر موجود ہی تھا اور محنت مشقت گھنٹی میں پڑی تھی۔ اس پر زور قلم، اور سب سے بڑھ کر ایسا اندامی اور خلوص گویا کامیابی کے تمام اسباب موجود تھے۔ خدا نے برکت دی اور وہ کامیاب تاجر بن گئے۔ بدیسی مشینوں میں ان کی بڑی ساکھ تھی اور وہاں کے تاجروں کو ان پر بھروسہ تھا! ان کی تین تین جیسے کی ہندوی بھیج موحاتی تھی۔ ان کا یہ کاروبار ۱۹۵۵ء تک بہت کامیابی کے ساتھ چلتا رہا۔ اس سال حکومت نے درآمد برآمد پر سخت پابندیاں عائد کر دیں۔ عرصے کے ساتھ صورت بھی آہستہ آہستہ جواب دینے لگی تھی، اور وہ کھجواں اور اٹلیٹا سے کام کرنے کے لائق نہیں رہے تھے۔ لہذا انھوں نے یہ سلسلہ بند کر دینے میں عافیت دیکھی، اور اس کے بعد سب تن علم و ادب کے لیے وقف ہو گئے۔

شہر گوئی انھوں نے ۱۹۰۷ء میں شروع کی، جب وہ ہونڈا آٹھویں درجے کا طالب علم تھے؛ مگر پانچ چھ برس تک کسی سے مشورہ نہیں کیا۔ جب ۱۹۱۲ء میں امرتسر گئے، تو حکیم فیروز الدین فیروز و طہرائی کے سامنے ڈالنے تلخ ہو گیا۔

حضرت فیروز طہرائی اس پایے کے صاحبِ علم و فضل بزرگ تھے، جن پر خطۂ پنجاب کو بجا طور پر ناز ہو سکتا ہے۔ انہوں نے ان کی کا حقہ، قدر نہیں ہوئی، جس کے لیے ان کی گوشہ نشینی اور استغنا بھی بہت حد تک ذلت دہا رہی۔ ۱۸۸۲ء میں امرتسر کے ایک سربراہ آدودہ کشمیری گھرانے میں پیدا ہوئے۔ خاندان میں پشتوں سے عبادت کا سلسلہ چلا آ رہا تھا، قیمت کی بات، کا لوہا دہا میں لاکھوں کا خزانہ ہوا۔ ان کے والد اس صدیے کی تاب نہ لائے، اور حرکتِ قلب بند ہو جانے سے آناٹا نا جان بحق ہو گئے۔ اس وقت فیروز الدین احمد کی عمر بھی ڈیڑھ دو برس کی تھی۔ کچھ کھی با داد اور احقین نے خرد برد کر دی، اور فیروز الدین احمد کو یا ہوش بنبھالنے سے پہلے ہی تلاش ہو گئے۔ بلکہ لایا گیا و لٹھا جین اٹھا۔

جہاں وہ وقت کی ڈی کے لائے پڑے ہوں، وہاں تعلیم کا کیا سوال! سن شعور کو سنبھے، تو ہو اں نے تیرم بیٹے کو محلے کی مسجد کے محنت میں بھیج دیا۔ وہاں قرآن اور عربی تو پڑھنا ہی تھی، لیکن اس سے کہیں زیادہ انھیں پڑوس میں رہنے والے ایک ایرانی بزرگ سے فیض پہنچا۔ ان سے رفتہ رفتہ فارسی میں وہ مہارت پیدا کر لی جس نے انھیں بعد کو کجاء و دزدگار بنا دیا۔ دس برس کے تھے، جب قرآن اور خیات کی بیشتر کتابیں ختم کر چکے تھے۔ لیکن کسبِ معاش کا مسئلہ اتنا اہم تھا کہ انھیں لازماً کوئی کام کرنے کی ضرورت تھی۔ اس پر انھوں نے نوگری کا پیشہ اختیار کیا، جس سے اپنا اور ماں کا پیٹ پالنے بھر کی کمائی بھرنے لگی۔ نوگری محنت اور دیدہ دیری کا عہد و قس کام ہے۔ تاہم اس سے جو وقت بچتا، اس میں مختلف موضوعات کی فارسی اور عربی کی ادنی کتابوں کا مطالعہ بھی جاری رہا۔ لیکن وہ نوگری سے عاجز آ گئے۔ آخر اسے چھوڑ کر چوگر میں محو ہو گئے کہ اس میں فراغت اور تعلیم حاصل کرنے کے نسبتاً زیادہ امکانات تھے۔

چونکہ خدا نے دل و دماغ کی صلاحیتیں بہت زیادہ فروغ و بے حد کی تھیں، بہت جلد، کسی استاد کی مدد کے بغیر، ترقی کی منازل طے کر کے اُردو اور پنجابی میں شعر کہنے لگے جس نے سنا، اس نے داد دی، دل بڑھا یا اور یوں ان کی شہرت پھیلنے لگی۔ اور تو اور، مقامی ماہنامے ”میسما“ کے مدیر کی جگہ خالی ہوئی، تو اس پر ان کا تقرر ہو گیا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہن سال استاد مولانا احمد حسن شوکت میرٹھی (دف: دسمبر ۱۹۲۲ء) نے ”بہند ہند شرقیہ“ کے بلند بانگ دعوے کے ساتھ ساتھ مذہب کے کلام پر جرح و قدح کا طوفان مچا کر دکھایا تھا۔ فیروز طغرانی نے ”میسما“ میں خود مولانا شوکت میرٹھی کے کلام لکھا جائزہ لینا شروع کیا، اور ستم یہ ہوا کہ اس کی خامیاں دکھا کر اصلاح بھی دے دی۔ شوکت سے کوئی جواب نہ دیا، تو چپ سادھ لی۔ اس پر فیروز طغرانی نے ایک اور چکی لی اور اپنے پرچہ میں اعلان کر دیا کہ چونکہ مولانا شوکت نے ہمارے اعتراضات پر خاموشی اختیار کر لی ہے، اس سے ہم یقینہ نکالنے پر مجبور ہیں کہ انھوں نے ”کل اعتراضات اور اصلاحوں کو قبول کر لیا ہے اور اس میں انھیں کوئی کلام نہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا، تو وہ ضرور مدلل تردید کر کے ہمیں تباہ کرتے۔ مولانا شوکت نے دیکھا کہ پانی ترسے گزر رہا ہے۔ لہذا وہ امر تسریع اور مقامی مشہور عالم مولوی شام الدین امرتسری کو ریح میں ڈال کر فیروز طغرانی سے مصالحت کر لی۔ یہ واقعہ ۱۹۰۴ء کا ہے، جب فیروز طغرانی بمشکل ۲۲ برس کے تھے۔

”میسما“ بند ہو گیا، تو فیروز طغرانی نے اپنا ذاتی ماہنامہ ”ایشیا“ جاری کیا۔ لیکن اس کے لیے جتنا سرمایہ درکار تھا، اس کا نام نہ آ رہا تھا، اہم کرنا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ کادرباری تجربہ بھی بڑے نام تھا۔ اس لیے پرچہ جلد ہی بند ہو گیا۔ اس وقت میں دیکھ ”اخبار کا ملک بھری غلطی تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد (دف: فروری ۱۹۵۸ء) اس کے مدیر اور مولانا عبد اللہ حمادی (دف: اگست ۱۹۴۷ء) مترجم تھے۔ فیروز طغرانی ان کے معاون مقرر ہو گئے، ان کا کلام نظم و نثر بھی دیکھ لیا۔ لیکن جب ۱۹۰۶ء میں مولانا آزاد دیکھلے الگ ہو گئے تو فیروز طغرانی نے بھی یہ تعلق منقطع کر لیا

شمس الاعلیٰ حکیم غلام جیلانی لاہوری (ف: فروری ۱۹۶۶ء) کو اپنے تصنیف کام کے لیے ایک معاون کی ضرورت تھی، جو عربی اور فارسی میں مباحثہ نامہ کا حامل ہو۔ انھوں نے شاہ قزوین طبرانی کو لاہور بلا دیا۔ یہ ساڑھے تین برس وہاں رہے حکیم غلام جیلانی کے نام سے جو عربی کی کئی کتابوں کے تراجم شائع ہوئے ہیں، ان میں سے بعض قزوین طبرانی ہی کا کارنامہ ہے، بقیہ کچھ اور اصحاب کی کاوشیں طبع کا نتیجہ ہیں، حکیم غلام جیلانی ایک نامور رفیق الاعلیٰ بھی شائع کرتے تھے۔ اس زمانے میں قزوین طبرانی کے کئی مضمون (منتقل اور تراجم) اس میں بھی چھپے تھے حکیم غلام جیلانی کا تصنیفی پردہ گرام مکمل ہو گیا، قزوین طبرانی واپس امرتسر چلے آئے اور یہاں اپنا مطب کھول دیا۔ اس سے شہر کے اصحاب علم و فن کو مزید فائدہ پہنچا کر بلا باندھ آئے، ان کے پاس بیٹھتے اور استفادہ کرتے رہتے جاں تک مطب کے ان کا ذریعہ معاش بننے کا تعلق ہے، وہ مقصد پورا نہ ہوا۔ اب انھوں نے کوئی اور روزگار اختیار کرنے کی کوشش کی۔ بالآخر ٹھہری کو قادیان وغیرہ پڑھانے پر محکمہ تعلیم میں شامل ہو جائیں۔ لیکن مشکل تھی کہ انھوں نے کسی مدرسے میں باقاعدہ تعلیم نہیں پائی تھی، نہ کوئی سند ان کے پاس تھی، اور محکمہ تعلیم میں فکری کے لیے یہ لائق نہ تھا۔ لہذا اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ اس پر انھوں نے فاسٹوں کے تجربے سے پنجاب یونیورسٹی کا منتفی داخل کا امتحان پاس کر لیا۔ اس کے بعد آسانی سے اسلامیہ اسکول امرتسر میں فاسٹی کے مدرس مقرر ہو گئے۔ پھر ان کی حیثیت سے قبول تیار لہجہ تھی اور دو ڈھائی برس وہاں رہنے کے بعد واپس چلے آئے۔

اس کے امرتسر پہنچے، تو ”دکیل“ کے مدیر اعلیٰ مقرر ہو گئے۔ لیکن یہ اس اتحاد کا گویا منہجہ تھا۔ جلد ہی اس کے مانگوں میں باہمی اختلاف پیدا ہو گیا۔ جب معاملات کسی طرح نہ سلجھے، تو ان لوگوں نے پرچہ ہی بند کر دیا۔ قزوین طبرانی پھر پروڈگار ہو گئے۔ جلد بعد انھیں حمایت الاسلام لاہور نے انھیں اپنے شعبہ سالیف و تصنیف میں مصحح کی آسانی پیش کی، جو انھوں نے قبول کر لی۔ انھیں کے پاس جتنے مستودے آتے تھے، ان کی زبان کی قیام و خیر وہ ان کے فرائض میں داخل تھی۔ لیکن اب انھیں لاہور کی آب و ہوا اور اس

نہیں آئی ہسلین بیارہ بنے گئے۔ اس لیے منعفی ہو کر نرس واپس آ گئے۔ اس کے تھوڑے ہی دن بعدہ فروری ۱۹۳۱ء کو اس کو پیارے ہو گئے۔ عمر چھاس کی بھی نہیں تھی۔ ان کے شاگرد رشید حکیم محمد حسین عرشا نے ساری سچ کہی :

ترتیبِ فرودِ طغرائی کہ باد جلوہ انگن اندر نورِ خدا
جشنِ سالِ وفاتِ اذعانے بے تاہلِ گفت وہ مغفورِ خدا

آدم بربرِ مطلب : تاجر صاحب بھی ۱۹۱۵ء میں ان کے تلامذہ میں شامل ہو گئے۔ وہ استاد کے عاشق تھے۔ ان کی تحریروں میں جہاں کہیں ان کا نام آیا ہے، ان کے علمِ فضل و تقابلیت و صلاحیت کا ثناء و ثقافت، شفقت و عظمت کے اعتراف اور تعریف میں ان کی زبان سوجھتی ہے۔

ان کی شادی ۱۹۰۵ء میں پشاور میں خان (ضلع چلم) کے شری و حنیف راے جتوئی کے صاحبزادے دیران دیوئی سے ہوئی تھی۔ جناب و حنیف راے نے شہرِ مولانا دانی آدمی تھے اور ان کی بہت وسیع جادو و سحر - وہ دیا ست جہا لاد میں تحصیلدار کے عہدے پر فائز تھے، لیکن بہادر جا کی نفسِ حرکت سے دل برداشتہ ہو کر استعفیٰ دے دیا اور وطن واپس چلے آئے۔

تاجر صاحب کے دو بیٹیاں (دشانی اور شکر) اور ایک بیٹا (دشوانا تھو) تھے جو بچے ہی ۱۹۲۷ء میں انتقال ہو گیا۔ جب تاجر صاحب کی عمر محض ۳۶ برس کی تھی۔ مگر میں خدا کا دیا سب کچھ تھا، صحت اور صورتِ شکل میں بھی کوئی کمی نہیں تھی۔ سب نے دوسری شادی کا مشورہ دیا، مگر اصرار کیا۔ لیکن اس مردِ خدا نے سب کو جواب دے دیا۔ دشوانا تھو اس وقت صرف سالِ عمر کے تھے (ولادت ۲۰ مارچ ۱۹۲۶ء)۔ تاجر صاحب نے کہا کہ میں ان بچوں کے لیے ماں اور باپوں کی طرح ان کی پرورش اور تعلیم و تربیت کروں گا۔ مجھے کسی اور چیز کی ضرورت ہے نہ آرزو اور یہ انھوں نے کر دکھایا۔ اس کے بعد وہ عمر بھر بخیر رہے۔

تقسیمِ وطن کے بعد بیشتر زمانہ امرتسری میں گزرا۔ شفا سے کوئی نو سو بیسے پہلے اس نے بیٹے دشوانا تھو دتا کے پاس کو روکشیتر میں رہنے لگے تھے۔ دشوانا تھو صاحب کو وراثت کا کچھ لاہور میں ایم اے کے طالب علم تھے کہ ملکِ تعلیم ہو گیا، اس پر اسکو نے مشرقی پنجاب یونیورسٹی

سے ایم اے کیا اور پھر ۱۹۵۵ء میں لکھنؤ یونیورسٹی سے دہادہ ادب میں ایم اے کیا۔ اس کے بعد دہادہ چلے گئے اور وہاں کیمبرج یونیورسٹی سے ایم لٹ کی سند حاصل کی۔ آج کل گورنمنٹ یونیورسٹی میں محدثہ شعبہ پنج اور سوشل سائنس فیکلٹی کے ڈین ہیں۔

قاصر صاحب کا ذیابیطس کا مرض برانا تھا؛ دل کا عارضہ بھی تھا۔ زندگی کے آخری ۲۵-۳۰ برس کم و بیش علالت ہی میں بسر ہوئے۔ یہی کیا کم تھا کہ کیتس ہو گیا۔ لیکن موت کا بہانہ عارضہ بول ہوا۔ ۲۵ نومبر ۱۹۷۵ء کو حرکت قلب بند ہو جانے سے دگرگئے عالم جاوداتی ہو گئے۔ انھوں نے موت کا جس خندہ پیشانی سے خیر منہدم کیا اور جیسے آخر تک خاندان کے مختلف افراد اور دوسرے حاضرین سے باتیں کرتے رہے۔ دہستہ بر لب، ادست، کاجیتر کا نمونہ تھا۔ حقیقتاً ان کی موت سے ایک عظیم انسان ہم سے جدا ہو گیا۔ ایسا خود ادا اور نڈر آدمی دیکھنے میں نہیں آیا۔ وہ سیاسی تحریک کے دلے میں قید رہے تھے؛ جلیا نوالہ بارخ امرتسر کے لٹاک سانے کے وقت وہاں موجود تھے اور اس کے بعد ان کی گرفتاری عمل میں آئی۔ لیکن اس کے باوجود کہ بعد کے دلے میں ان کے تمام سیاسی اکابر سے ذاتی تعلقات تھے، انھوں نے انعامِ بدعا و عذر طلب کرنا تو دیکھا، کبھی اس کا ذکر تک نہیں کیا۔

وہ سید وسیع المطالعہ شخص تھے۔ چونکہ فاضل اور انگریزی میں دستگاہ کامل تھی، اس لیے غرائبِ عالم اور فلسفہ اور تاریخ کا خاص طور پر مطالعہ کیا تھا۔ اسی سے ان کی اپنی زندگی بالکل قدیم فلاسفہ اور روحانی چیزوں کی شوق منگھی تھی۔

مختصر دستاویز ان سے یادگار ہیں: (۱) ڈال ڈال، پات پات (مکتوبات، ۱۹۶۰ء اور ۱۹۶۱ء) پریم ضیا (۱۹۶۱ء)؛ (۲) جواہر پارے (۱۹۶۲ء)؛ (۳) گد و بار (کلامِ اردو) ۱۹۶۳ء؛ (۴) اہل بیف (۱۹۶۳ء)؛ (۵) ہومر (۱۹۶۵ء)؛ (۶) میراجانی (۱۹۶۶ء)؛ (۷) ذکر و فکر (کلام، ۱۹۶۷ء)۔ منکر مکتوب الیہ میں وہ خطوط جمع کیے تھے، جو ان کے احباب ہلے ان کے نام لکھے تھے۔ ان کی شریافتل و دل کا نمونہ ہے۔ سلاست اور رعبانہ بیان ان کے جوہرِ خاص تھے۔ چونکہ علم و ادب پر نگری نظر تھی اور حافظہ بہت قوی تھا، انہیں لیے اپنے نقطہ نظر کے اثبات کے لیے تحریر میں تادینی اور مذہبی تعلیمات کثرت سے استعمال

کرتے تھے۔ حکومت نے نادانی خدمات کے اعتراف میں انھیں ۱۹۶۹ء میں پدم شری، کا اعزاز عطا کیا تھا۔

اب ان کے چند شعر دیکھیے۔

وہ قلنگاہ میں ہے غنجر آؤں قاصر! چلو کہ وقت ہے اب قسمت آزمائی کا
 کسک کیسی ہے یہ درد ہنس کی سینس ہم بھی تو، قاصر! آپ کا داڑ
 دہنے کا لطف خاک ہے جدم اہاں میں جینا ہے اپنے بس میں نہ موت اختیار میں
 ہزارا بنے ہم، ہزارا باد سے جہاں میں نقش کف پلے رہرواں کی طرح
 حرم میں، دیر میں کیا اختلاف ہے قاصر! یہاں بھی ان کے طلب گار ہیں وہاں کی طرح
 بشر کو چاہیے آہستہ کہ ہو، اسے قاصر! نہ ہو گا بھی سرواہ دل کو کھانے کے حیلے
 بلبل کو دیکھنا ہوں کہیں، اگر جن سے وہ روتا ہوں زار زار کہ خود ہوں وطن سے دور
 جتیں ہیں اور بھی دنیا میں، لیکن محبت ہو گئی ہے کچھ نصیب سے
 کسی کے گیسو درخ کی یہ دھن ہے غرض ہے کھڑے ہم کو، نہ دیں سے
 بتاؤ، دل دیا ہے کس کو، قاصر! نظر آتے ہو کچھ اندو گیس سے
 یہ سادگی بھی عجب سادگی ہے، اسے قاصر! کسی نے وعدہ کیا، تم نے اعتبار کیا
 کیا کہوں خود کو مٹا دینے کے قاصر فائدے

دائے خرم بن گیا، مٹی میں مل جانے کے بعد

شودش سر سوکھ گل پر نہیں ہے منحصر جوش و حشمت جو رہے بار بار کے برس
 کیسے دن لگتے ہیں، قاصر! گردش تقدیر دل ہے کچھ حد سے زیادہ متعذر اچکے برس
 ے جا کے اس گلی میں، یہ دل نے کہا ہے پہنچا دیا بیتاں رتبے، آگے ترانے نصیب!
 ساتھ ہی اس کے نکل آئیگا دل میرے سینے سے نہ ظالم! پتھر بھیج
 آخربش، وقت ہے تاثیر کا دل سے قاصر! ہار و شگبیر، کھینچ
 ہوتی ہے ان کی پاؤں میں، "نہیں" بھی لی ہوئی

اقرار ابھی وہ کرتے ہیں، انکا دل کفر

اپنے ہی پہلو میں دشمن ہو، تو کوئی کیا کرے !

دل جا رہا آشنا کا سا آشنا کا ہو گیا

ہو اسے باغ کی ہے، ہمصیفر واکس کو آگاہی

یہاں گنجِ قفس ہی میں ہوئے ہیں بال پر پیدا

حال پر چھو نہ زندگانی ۲

ہے کرم مرگب نا اچھا فی کما

آلامِ مشق، راحۃِ پیہم سے کم نہیں اسے بواہوس ! یہ زخم بھی رجم سے کم نہیں

منصر دیکھا کرم کو جرم پر تو حسرتیں بیگناہی بول اٹھی نہیں بھی گہنگارہ میں ہو

فحشے سود و زیاں کے اس تجارت میں نہیں میں دل و جاں سے محبت کے خریداروں میں ہوں

نہیں آتا کبھی نامہ بوں تک ہمارا ضبطِ غم ہے کیا فغاں سوز

دوسے دل میں جگہ ہے، نہ تو ہی غفل ہیں اب وہ اغلاص کہاں، دوسرے نظاں ہیں

آنکھیں مری کھل ہیں، اسیری میں ہمصیفر گنجِ قفس میں خاک کہوں، ہجر اسے دل

زندگی کا کوئی مقصد نہیں، قاصدا معلوم خواب دلچسپ ہے، پر حالِ تعمیر نہیں

مرچھوٹنے کو سنگِ سہراہ کم نہیں دیوانگی میں کیا ہے دردِ بام سے عرض

دوٹائیاں کسی کی محبت میں ہیں تو ہوں مطلبِ رنگ سے نہ ہیں نام سے عرض

قاصدا ہواں پہ حال دل را دستکفت اتنی ہی بس ہے شکوہِ ایام سے عرض

نارسا آہ، عد و چرخ، زمانہ دشمن اپنی بگڑی ہوئی تقدیر بنائیں کیونکر

کیا رُسوا محبت میں مجھے فریاد و شیون نے

اگر تابِ تخیل ہو، تو دنیا را اداں کیوں ہو !

سراخ ان کا اگر پاؤں، تو اسے اسی قدر چھو

جاں ہو کر عیاں کیوں ہو عیاں ہو کر نہاں کیوں ہو !

یہ جانتا ہوں کہ ابھی نہیں ہے بقیابی

ہو ضبطِ خاک، اگر دل کو تاب ہی نہ

ابوالکلام آزاد

اگر جہاں علم و فضل، اک کاٹنا عقل و سوش
 خوشِ اعلیٰ ہے نہیں کے نام پیغامِ سروش
 ایک کوہِ استقامت، پیکرِ عزم و ثبات
 ایک بحرِ بیکرانِ داد دے کا ثبات
 ایک دل، دامنِ اسرارِ غلو نگاہِ ذات
 اک نظرِ بینندہ، نظارہٴ حسنِ صفات
 تھے صفات اس کے فقط شریعِ فروغِ حسنِ ذات
 ذات تھی اس کی فقط نظارہٴ حسنِ صفات
 اس کی شخصیت میں نہاں ایک کائناتِ کجاں
 ایک بزرگِ محل میں انصافِ گنگ بے گھاں
 وارثِ عہدِ قدیم و خالقِ عصرِ جدید
 مصدقِ فکرِ سلیم و مخزنِ خلقِ حمید
 مرجعِ اہل سیاست، رشدِ اصحابِ دی
 مکتبِ انوارِ عرفان، مشرقِ بہرِ بغیث
 رزمِ پی تیغ و سنان، اور رزمِ میاں و بار
 ایک طرحِ آتشِ فشاں، اور دوسرا رخِ تابان
 صورتِ مسورِ کن سے، یوسفِ مصرِ جمال
 نطقِ و کش سے، یلیمِ طورِ عرفان و کمال
 زندگی افزا، حیاتِ افروز، اس کا سرِ سخن
 ہر تخلیقِ مقاصدِ عزم اس کا حرفِ کن
 اس کے ہر لفظ میں مددِ بزرِ علم و آگہی
 اس کی اور روشنی کے سو بزرگوں شاہِ پیشانی

شرح و ملت کا امین ، فقہ و سیاست کا امام
 رہنما صاحب کا ، بلاغت کا جہانت کا امام
 جس نے دیکھا اور سمجھا طرز و دورِ پورا نکلا
 اس پر ثابت ہے کہ ہے یہ دورِ دورِ پورا نکلا
 قرینا باریک تار یک مردِ محوِ گرد و عیاں
 عبدُ در ملکِ مصر ، آزاد در بندِ شاہاں
 جس کے اک لفظ میں پنہاں تھی جانِ ننگ
 بزم میں جس کا حکم تھا نشانِ زندگی
 جس کا لفظی سحرِ املن سر بسرِ تفسیر تھا
 جس کا فکرِ عرشِ پیاوہر کی تفسیر تھا
 ملک ہے محرومِ آج اُس عظمتِ کردار سے
 تشنہ ہے ذوقِ ادب اُسِ کدورتِ افکار سے
 سرزمینِ بہندِ دولتِ یاسِ بے اندازہ ہے
 دفترِ علم و بصیرتِ آج بے شیرازہ ہے
 آسمانِ واقعی بودِ گرجوں بیارِ دہریہ
 بہرِ فاضلِ حضرتِ آزاد ، امیرِ ملکِ دیہ

سید مسعود حسن رضوی ادیب اور وکیل

جیسا کہ ان کے نام سے ظاہر ہے، مسعود صاحب شہادت تھے۔ ان کے مورث اعلیٰ خاندان قلعہ کے راجہ زوال میں خیال پور سے ہندستان آئے۔ یہاں ان کی مناسب آؤ بھگت ہوئی اور وہ قلعہ بعد نسل حکومت میں مختلف عہدوں پر فائز رہے، جاگیریں بھی عطا ہوئیں، اور منصب بھی۔

مسعود سن ۱۵ محرم ۱۳۱۱ھ مطابق ۲۹ جولائی ۱۸۹۳ء کو برائچ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد شہید رفیع حسین صاحب علم بزرگ اور پختے کے لحاظ سے طبیب تھے۔ والد صاحب نے تو بیاضیہ آٹاؤں کے رہنے والے تھے، لیکن بھٹو میں تعلیم کی تکمیل کے بعد انھوں نے برائچ میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ ان کے ملنے والے ان کی صداقت بن اور اشتغالات سے بیچ کے معشر تھے۔ ان کا ۸ شوال ۱۳۱۹ء (۲۸ دسمبر ۱۹۰۳ء) کو انتقال ہوا۔ انھوں نے اپنے پیچھے تین فرسوں والے چھوٹے بچے چھوڑے: سید مسعود حسن، اودان کے چھوٹے بھائی، سید آفاق حسین رضوی، یہ پختے کے لحاظ سے ہومو پتھیک ڈاکٹر ہیں، ولادت ۱۱-۱۹۰۳ء، اودانک بھی شہید، لیکن مسعود حسن صاحب سے صرف ڈھائی سال چھوٹے تھیں؛ یہ اپنے خاندان کے ساتھ برہم کو کے لاہور میں مقیم ہو گئے تھیں؛ وہیں انتقال ہوا۔

سید مسعود حسن صاحب نے خود لکھا ہے کہ چار بھائی، چار بیٹے، چار بیویاں کی عمر میں میری سب سے بڑی ہوئی۔ ان کے والد انھیں بھی اپنی طرح ”طبیبانہ“ کا ہزار علوم اسلامی کا عالم

بنانا چاہتے تھے۔ چنانچہ ان کی تعلیم اسی بچے پر شروع ہوئی۔ لیکن والد کی بیعت و کفالت نے اس کا رخ بدل دیا۔ حالات مجید ناساز گار تھے، اور گرد و حلیوں اور سجدوں سے دشمن اور بدخواہ زیادہ۔ ایسے میں بھی اس کو درمیان میں نے مقصد نہیں ہادی اور مالی سہولت اور مناسب مشورے کے فقدان کے باوجود اپنا تعلیمی دور نہایت شاندار طریقے پر بسر کیا۔ ابتدائی تعلیم بھی طور پر ہر رائج میں ہوئی۔ یہاں زیادہ تر اُدوسے مزاحمت تھی۔ اس کے بعد کچھ شوق آئے اور تین آباء ہائی اسکول میں داخلہ لے لیا، پچھتے درجے میں لیے گئے۔ بہر حال اس کے بعد تعلیمی فائدہ بہت کامیاب رہا۔ اسکول کے زمانے میں ہر درجے میں اول آئے اور ہر مضمون میں سب سے زیادہ نمر حاصل کرتے رہے۔ بالآخر ۱۹۱۷ء کی کیننگ کالج لکھنؤ سے بی۔ اے کی سند لی۔ اگلے برس (۱۹۱۷ء) ایم اے میں داخلہ لے لیا تھا، لیکن تندرستی خراب ہو جانے کے باعث امتحان میں شامل نہ ہو سکے۔

اسی زمانے میں صوبہ متحدہ شمال و غرب (حال اتر پردیش) میں ایک نئی اسامی نکل۔ کام یہ تھا کہ صوبے میں جو کتاب چھپے، اس کے ضروری کوائف سرکاری گزٹ میں شائع ہوں۔ اپریل ۱۹۱۸ء میں شیڈ مسووسن کا اسامی پر تقرر ہو گیا۔ وہ یہاں ساڑھے تین سال رہے۔ انہوں نے خود کوئی جگہ لکھا ہے کہ میں نے اس دوران میں مختلف علوم کی چھوٹی بڑی تقریباً دس ہزار کتابیں مطالعہ کیں، پتا ہے کہ ان میں ہر طرح کی ضخامت کی کتابیں ہونگی۔ کچھ بھی چھاپے ہوئے اور ذرا نہ اوسطاً آٹھ کتابوں کے مجموعی صفحات ۴۵۰۰۰ سے کم کیا ہونگے! اور یہ مطالعہ مسلسل تین برس تک جاری رہا۔ صرف یہ نہیں، وہ ان مطلوبات کی قبرست بناتے، ہر ایک کا خلاصہ تیار کرتے، اور اس پر تبصرہ لکھتے یہ کوائف یوں کے سرکاری گزٹ میں ہر تیسرے مہینے چھپتے تھے۔ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس متنوع مطالعے کا ان کے دل و دماغ کی تشکیل اور علم و عرفان کی تکمیل پر کیا اثر ہوا ہوگا! یہ حقیقت ہے کہ بعد کی زندگی میں ان کی محنت کی حادثات اور تصنیفی خدمات کی بنیاد اسی دامن میں پڑی۔

دکاش! کوئی اور کا بندہ ان مضمون کا کھوج نکال کر انہیں مع کرے۔

۱۹۳۲ء میں انھوں نے الہ آباد یونیورسٹی سے ایم اے کی ڈگری پڑھنے کی سند حاصل کی اور اس کے بعد گورنمنٹ ہائی اسکول، فتح گڑھ میں مدرس مقرر ہو گئے۔ لیکن اس کے چھ ماہ بعد ہی انھیں لکھنؤ یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر کے عہدے کی پیشکش ہوئی۔ حالی آنکھ اس نے عہدے کی تقویہ اور مستقبل کی توقعات فتح گڑھ کی حد سے کہیں کم تھیں، انھوں نے فتح گڑھ کو خیر باد کہا، اور اپنے وطن بنانی لکھنؤ چلے آئے، جہاں اردو کی خدمت کے واقع فریاد سننے سے انھیں نے اثناء ملازمت میں ایم اے (فائنل) کی سند درجہ اول میں حاصل کی (۱۹۳۴ء) اور اس نمایاں کامیابی پر انھیں یونیورسٹی کی طرف سے خلائی تمغہ بھی عطا ہوا تھا۔

وہ درجہ بدرجہ آگے سینئر لیکچرر (۱۹۴۴ء)، فائنل ریڈر (۱۹۴۷ء) اور صدر شعبہ اردو (۱۹۴۷ء) فائز ہوئے۔ آخر کار طویل اشتہار کے بعد ۱۹۵۳ء میں پروفیسر مقرر ہوئے، اور ۳۲ سالہ کامیاب ملازمت کے بعد انھیں ۱۹۵۴ء میں سکریٹری ہونے کے زمانہ میں ہی لکھنؤ یونیورسٹی میں علم و تحقیق کی فضا پیدا ہو گئی تھی۔ سچ ہے شمع لاکھ اندھیرے میں کیوں نہ لکھ دی جائے، اس کا اور گرد منور ہو جاتے ہیں۔ ان کی بدولت یونیورسٹی کا بخانے کے مشرقی شعبے میں بھی بہت ترقی اور توسیع ہوئی۔

وہ ابھی تعلیم کے ابتدائی مراحل بھی طے نہیں کر سکے تھے کہ ۱۹۱۰ء میں انھیں دوسرا موزی عارضہ لاحق ہو گیا اور اس کے بعد وہ سات آٹھ برس تک مسلسل اس کا شکار رہے۔ بڑھتی ہوئی عمر کے بعد کے زمانے میں اس پر تیز کرکٹ کی شکایت متنازعہ ہو گئی۔ تمام شروع سے کمر بند تھا، ان عوارض نے اور بے تحاشی کر دیا۔ کوئی اور ہوتا، تو متحیا ڈال دیتا۔ لیکن آج ہے ان کی جہت پر کہ انھوں نے نہ تعلیم سے ہٹ کر اٹھایا، نہ کبھی صحت سے جی حرا یا۔ خدانے بھی مدد کی اور وہ عام کا شکار نہ رہا۔ باوجود ترقی کے منازل طے کرتے چلے گئے۔ اردو سے انھیں دلچسپی ہی نہیں، عشق تھا۔ ان کی دوسری دلچسپی فارسی سے تھی۔ اس شوق کی تسکین کے لیے انھوں نے ۱۹۳۳ء میں فارسی کے گہوارے اور ہندستان کی تاریخ و تمدن کے منبع ایران کی بیاحت کی۔ واپسی پر عراق گئے اور وہاں ٹھہر گئے۔

کی زیارت کرتے ہوئے وطن واپس آئے۔ یہ سفر خالص علمی ذوق و شوق کا نتیجہ تھا، ادا مولانا محمد حسین آزاد کے سفیر ایران کے بعد اپنی نوعیت کا غالباً دوسرا سفر تھا۔

مسعود صاحب ۵۷ برس تعصیف و تالیف میں مصروف رہے۔ ان کی سب سے پہلی کتاب ۱۹۲۰ء میں شائع ہوئی تھی۔ ذیل میں اس کی نصف صدی کی مطلوبہ کتابوں کی فہرست ملاحظہ فرمائیے :

۱۔ امتحان وفاق (۱۹۲۸ء) انگلستان کے ملک مشرقی سن کی طویل نظم ایکٹکٹنڈن کا انٹری ترجمہ، دیباچے اور حواشی کے ساتھ۔

۲۔ دبستان اردو (۱۹۲۵ء) بچوں کے لیے نظم و نثر کے اسباق۔

۳۔ حمادی شاعری (۱۹۲۰ء) اس میں اردو شاعری پر حوا اعتراض کیے جاتے ہیں ان کا مثل جواب دیا ہے۔ اسے حالی کے مقدمہ شاعر شاعری کا نثر خیال کرنا چاہیے۔

یہ کتاب بہت مقبول ہوئی۔ ۱۹۷۱ء تک اس کے گیارہ ایڈیشن خود مصنف نے شائع کیے۔ ان کے علاوہ چودا شاعریوں نے اسے نین مرتبہ ان کی اجازت کے بغیر چھاپ لیا۔

۴۔ فرنگی امثال (۱۹۲۸ء) اس میں فارسی عربی کے تقریباً ۱۲۵۰ امثال کا ترجمہ اور محل استعمال بتایا ہے۔ اس کے مزید دو ایڈیشن ۱۹۳۸ء اور ۱۹۵۸ء میں

۵۔ چاق و تکیہ (۱۹۲۹ء) سعادت یاد خان تکیہ کی قابل قدر کتاب مقدمے اور اشعار کے اور حوالہ و یاد کی وضاحت کے ساتھ۔

۶۔ فیض میر (۱۹۲۹ء) میر نے یہ کتاب فارسی میں لکھی تھی۔ رضوی صاحب نے فارسی متن پر فیض اردو ترجمہ اور حواشی و فرنگی کا اضافہ کیا۔ یہ دوسری مرتبہ ۱۹۶۳ء میں چھپی۔

۷۔ نظام اللہ (۱۹۳۱ء) آزاد و گھنوی کی کتاب ہے جس میں تفسیق کلمات اور مبالغہ کی کے اصول و فنون سے بحث ہے۔ مسعود صاحب اس پر منفصل نثر بھی حواشی کا

اضافہ کیا ہے۔

۸۔ روضہ انیس (۱۹۳۱ء) میں انیس کے سات مرتبوں کا انتخاب، کچھ سلام اور رباعیاں، (زنگب اور حواشی کے ساتھ شامل ہے۔ یہ کتاب مزید چار مرتب (۱۹۵۰، ۱۹۶۳، ۱۹۶۸، ۱۹۷۲ء) میں شائع ہوئی۔

۹۔ جو اہرسلن (۲) (۱۹۵۳) منہ شانی اکادمی، آباد نے اردو شاعری کا انتخاب چار جلدوں میں شائع کیا تھا؛ اس کی دوسری جلد محمد حسین چریا کوٹ نے مرتب کی تھی؛ مسعود صاحب نے اس کی تصحیح کی تھی۔ یہ جلد محمد میر کے شعرا کے انتخاب پر مشتمل ہے۔ شروع میں ہر ایک شاعر کے مختصر حالات بھی دیے گئے ہیں، جس سے اس کی شکل مزید نکرنے کی ہو گئی ہے۔

۱۰۔ شامیکا برائیس (۱۹۴۴ء) میں انیس کا مشہور مرتبہ "بہ قطع کی مسافت شبنامی" صحت میں اور زنگب کے ساتھ چھاپا گیا ہے۔ اس کی کتاب لکھنؤ کے مشہور خطاط مرزا جواد مرحوم نے کی تھی اور اس کے ساتھ کچھ تصویریں بھی تھیں۔ یہ خطاطی پر لکھنؤ سے پوری آپ کتاب کے ساتھ چھاپا تھا۔ اس کی قیمت ۲ روپے تھی۔ مذہبی حلقوں نے ان تصویروں کی محنت مخالفت کی تھی جس پر بعد کو انھیں نکال دینا پڑا۔

۱۱۔ فائز و غوی اور دیوانہ فائز (۱۹۳۶ء) اس کی اشاعت کے بعد جلد ہی ملک تقیہ ہو گیا اور اسی کے ساتھ کتاب کے ہفتہ لکھنے میں ضائع ہو گئے، اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا۔ مسعود مرحوم نے جس محنت سے متن کی تصحیح کی ہے اور فائز کے حالات جمع کیے ہیں، اس کی تمام دیدہ و نظر نقادوں نے داد دی ہے۔

۱۲۔ متفرقات غالب (۱۹۴۷ء) مسعود صاحب کے پاس ایک بیاض تھی جس میں غالب کے ۳۹ فارسی خطوط اور کچھ متفرق اردو فارسی منظوم کلام شامل تھا۔ اس کو انھوں نے ایک مسودہ ملحقہ ۱۰۰ ضروری حواشی کے ساتھ شائع کیا تھا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن غالب صد سالہ برسی کے موقع پر ۱۹۶۹ء میں چھپا۔

۱۳۔ اردو زبان اور اس کا رسم خط (۱۹۶۲ء) یہ بھی دوسری مرتبہ ۱۹۶۲ء میں چھپی۔

۱۴۔ آب حیات کا تنقیدی مطالعہ (۱۹۵۸ء) مرحوم کا مولانا محمد حسین آزاد کی انشاء اور تحقیق، دونوں پر ایسا ہی تھا۔ اس مختصر کتاب میں انھوں نے ان اعتراضوں کا جواب دینے کی کوشش کی ہے، جو آب حیات پر کیے گئے ہیں۔ خذوذہ اضافہ کے جدید کتاب دوسری مرتبہ ۱۹۶۲ء میں چھپی تھی۔

۱۵۔ مضافہ انیس (۱۹۵۷ء) انیس کے متعدد مشول کا انتخاب ایک لائی میں پروکر مسئلہ داستان، انعامات کو بلا مرتب کی ہے۔ کہیں کہیں ربط قائم کرنے کی خاطر اپنی طرف سے کوئی شعر یا مصرع بھی اضافہ کیا ہے جس کا اعتراف دیا جائے کہ اس میں موجود ہے، لیکن انہیں کہ مثنوی کتاب میں کسی جگہ حاشیے میں نشانہ ہی نہیں ملتا کہ یہ اضافہ کیا ہے، تاکہ مثنوی کو القباس نہ ہوتا کہ کوئی کلام انیس کا ہے اور کوئی مرتب کی طرف سے اضافہ۔ اس کتاب پر پراثر پرنٹس حکومت نے ایک ہزار کا انعام عطا کیا تھا۔

۱۶۔ تذکرہ نادر (۱۹۵۷ء) از مرزا کلبہ بن نادر اس میں ۵۲۵ شعرا کے حالات ہیں۔

۱۷۔ نصاب جبریت (۱۹۵۷ء) مرزا محمد باجگ کے مصنف و جب علی بیگ سرور نے یہ نسبتاً کم مشہور کتاب ہے، اکی کو کتب معمول مہنگی سے مرتب کر کے شائع کیا تھا۔

۱۸۔ مکھنڈ کا شاہی ایجنج (۱۹۵۷ء) اس کتاب پر یوپی حکومت کی طرف سے ایک ہزار روپیہ کا انعام ملا تھا۔

۱۹۔ مکھنڈ کا شاہی ایجنج (۱۹۵۷ء) اس پر بھی اتر پردیش حکومت نے ایک ہزار روپیہ عطا دیا تھا۔

۲۰۔ اردو ڈراما اور اسٹیج (۱۹۵۹ء) یہ دو جلد (۱۸) اور (۱۹) کا مجموعہ ہے اسی کتاب پر مرحوم کو ۱۹۶۰ء میں ساتیہ اکادمی کی پانچ ہزار روپیہ کا انعام ملا تھا۔ ان تینوں کتابوں میں انھوں نے خوب خوب داؤد تحقیق دی ہے۔ اس کی اندر کچھ کا صحیح متن پیش کیا ہے اور اس کی حیثیت متین کی ہے۔ یہ تینوں کتابیں دوسری مرتبہ ۱۹۶۸ء میں

شائع ہوئی تھیں ۔

۲۱۔ آئینہ سخن فہمی (۱۹۵۹ء) تید محمد احمد بیخود مولائی نے ادیب صاحب کی کتاب "بادی شاعری" پر اپنے دو رسالوں جو ہر آئینہ اور منظر آئینہ میں عرض کیے تھے، یہاں انھیں کا رد کیا گیا ہے ۔

۲۲۔ غلشی سخن (۱۹۶۵ء) مولوی علی خان قبلا کا تذکرہ شرعے آورد ۔

۲۳۔ ایرانیوں کا مقدس ڈراما (۱۹۶۶ء) ایران میں زمانہ محرم میں قزاق خبیہ گروہ کا رد اس ہے۔ اس موقع پر جو رسوم ادا کی جاتی ہیں، ان کی شکل مذہبی ڈرامے کی سی ہے، یہاں ان کا بیان ہے ۔

۲۴۔ قواعد کلیتہً سجا کا (۱۹۶۸ء) کتاب تحفۃ الہند کا پہلا باب

۲۵۔ اندک سجا (۱۹۶۸ء) امانت کی مشہور نظم

۲۶۔ نامکنت خبر بہ سلطان (۱۹۶۸ء)

۲۷۔ شاعر اعظم افس : مختصر تعارف (۱۹۶۹ء) اس میں منتخب کلام بھی شامل ہے ۔

۲۸۔ نگارشات ادیب (۱۹۶۹ء) مجموعہ مضامین

۲۹۔ اسلاف میر تقی میر (۱۹۷۰ء) میر تقی میر کے اجداد کے حالات اور کلام کا نوڈ ۔ اس پر

اثر پرورش اور داکا ڈیمیں نے ۱۹۷۱ء میں دو ہزار روپے انعام دیا تھا ۔

۳۰۔ شرح لہا جانی اور تنقید کلام غالب

۳۱۔ رانی و نینتہ (مقدمہ) (۱۹۷۱ء)

۳۲۔ انجیلیات (۱۹۷۲ء) بیان کی وفات کے بعد اثر پرورش اور داکا ڈیمیں کے زیر

انتظام شائع ہوئی ۔ اس میں ان کے چھوٹے بچے "مضامین شامل ہیں، جو اس

سے پہلے مختلف رسالوں میں شائع ہو چکے تھے ۔

ان کے علاوہ یہ کتابیں ان کی زندگی میں طبع نہیں ہو سکی تھیں، اگرچہ ان کا مسودہ مکمل ہو گیا تھا ۔

۳۳۔ آن میں رشید گزینی ۔

۳۴۔ سلطان عالم و امجد علی شاہ

۲۔ ایران میں مرثیہ گوئی، ایک تاریخی جائزہ و سلطان عالم و اجد علی شاہ کوہ کی وفات کے بعد ۹۱۰ میں شاخ ہوئی اس سے معلوم ہوگا کہ اگرچہ وہ کہیں نہ کہیں بھی بند نہیں تھے، لیکن ان کے خاص موضوع یہ ہیں :

- ۱۔ مرثیہ : ۲۔ نسیب : ۳۔ اودھ کی شاہی زبلی کی تادریخ و بالخصوص عید و جبل شاہ۔ انھوں نے ان موضوعات پر گرانقدر اور پیشروانہ کتابیں تالیف کیں۔ انھوں نے آخری آیام میں انک کو دیا تھا، اس کا کچھ حصہ مختلف یونیورسٹیوں میں پہنچ گیا ہے۔

لکھنے کے معاملے میں وہ سستا نہ تھے۔ بات دراصل یہ ہے کہ وہ عید غلط تھے، جب تک موضوع کے ایک ایک جزو تک کے بارے میں انھیں اطمینان نہ ہو جاتا، وہ نہ تو اپنے کتاب کو آخری شکل دیتے، نہ اس کا کوئی مقدمہ شائع کرتے۔ یہ باعث ہے کہ ان کی تصانیف کی تعداد زیادہ نہیں۔ کامیاد سے وہ ڈری کا معاملہ ہوتا، اور بعض سستی شہرت حاصل کرتا ہی ان کا مطلع نظر ہوتا، تو یہ فہرست بہت طویل ہو سکتی تھی۔ لیکن ہجرت ہو جودہ یہ اتنی مختصر بھی نہیں کہ کوئی سنجیدہ مورخ ادب اس سے صرف نظر کر سکے۔ اپنے تنوع اور معیار کے لحاظ سے یہ عید قابلِ تعداد و مستند علیہ و خیرہ ہے اور یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ مدتوں اس پر آسانی سے اضافہ نہیں ہو سکیگا۔

ان مستقل کتابوں کے علاوہ ان کے مضامین اور شذرات کی بھی خاصی بڑی تعداد مختلف وسائل و جرائد میں منظرِ ثری ہے۔ اگر انھیں جمع کیا جائے، تو ان سے کئی مجلد تیار ہو سکتے ہیں۔

ان کی مسلسل علمی اور ادبی خدمات کا اعتراف حکومت نے بھی کیا، اور اردو دان حلقے نے بھی؛ متعدد کتابوں پر انعام ملے جن کا اوپر ذکر ہوا۔ اپریل ۱۹۷۰ء میں صدر جمہوریہ سندھ نے انھیں نازک کے فاضل کی حیثیت سے اپنا خطاب اعزاز اعطا کیا، جو ایک سند اشال اور عینِ حیات تین ہزار روپیہ سالانہ وظیفے پر مشتمل ہے۔ اپریل ۱۹۷۰ء میں حکومت نے ”پدم شری“ کا خطاب بھی دیا۔ پھر ۱۹۷۲ء میں حکومتِ اتر پردیش نے ان کی تصنیفی

کادشوں کے لیے انھیں پانچ ہزار کاغذ خاص انعام، ایک مفت دیوار ایک شدھی عطا کی۔

۱۹۲۶ء میں ان کی شادی ٹیکا پور کا پنور کے مشہور طبیب حکیم شید محمد امیر حفی نعمت علی عرف پیارے صاحب کی صاحبزادی حسن جانی بیگم سے ہوئی۔ شید محمد امیر حفی کا سلسلہ حضرت شاہ نعمت اللہ دہلوی کرانی سے ملتا تھا، جن کا آئندہ کی پیشگوئیوں پر پختل قعیدہ شہرہ آفاق ہے؛ اسی لیے انھوں نے اپنے نام کے ساتھ "نعت اہل" کا اضافہ کر لیا تھا۔

بیگم مسعودہ مرحومہ کو علم سے شغف اپنے والد سے ملا تھا۔ وہ انگریزی بھی جانتی تھیں، اردو میں شعر بھی کہتی تھیں، حوزہ تعلیم تھا۔ بیس کی عاشق تھیں، بلکہ حافظ بھی۔ ان کا آپس کا مطالعہ بھی دوجے کا تھا، اس کا کچھ اندازہ اس سے لگائیے، اگر جب بھی مسعودہ صاحبہ کو بیس کے کسی بند کے بارے میں معلوم کرنا ہوتا کہ وہ کس مرتبے میں ہے، تو وہ ان سے دریافت کرتے۔ مرحومہ صرف شادی کر تیں، بلکہ متعلقہ جلد لاکر پیش کر دیتیں۔ موت سے کچھ پہلے وہ اردو ضرب الامثال جمع کر رہی تھیں، لیکن یہ کام نامکمل رہ گیا۔ ان کا ۲۳ اکتوبر ۱۹۶۱ء کو بھارتی قلب انتقال ہوا۔

ان بیگم سے مسعودہ صاحبہ کی سات اولادیں ہوئیں: (۱) سب سے بڑی صاحبزادی ارجمند خانم، ڈاکٹر مسیح الزماں (دارالبادیونیہ شریف، خروڑی ۱۹۷۷ء) کے عقد نکاح میں آئیں۔ (۲) مسعودہ صاحبہ کے سب سے بڑے بیٹے ڈاکٹر شید اختر مسعود، پشاور یونیورسٹی (پاکستان) میں نائیکا کے استاد ہیں۔ (۳) ان سے چھوٹی صاحبزادی برہمیس بانو ایم اے (اردو) کراچی کے ایک تعلیمی ادارے سے وابستہ ہیں۔ (۴) امیری بیٹی بیس بانو اپنے شوہر کے ساتھ امریکا کے شریکلی فورڈ (لاس انجلس) میں مقیم ہیں۔ (۵) ڈاکٹر نیر مسعودہ سب سے چھوٹی یونیورسٹی کے شعبہ نائیکا میں تدریس میں (۶) ان سے چھوٹے بیٹے شید انور مسعود، مونیٹینجیونیو پیٹھک کالج، کھٹور میں پڑھاتے ہیں۔ (۷) سب سے چھوٹے صاحبزادہ اظہر مسعود (ضوی، یونیورسٹی کڈی، کھٹور میں ہتیم نشر و اشاعت ہیں۔

ادیب مرحوم کے تمام کردہ اشاعتی ادارے، کتاب خانے، کی نگرانی بھی انہیں کے ذمے تھی۔

بہمنی کے ساتھ تندرتی جواب دینے لگی تھی۔ اکتوبر ۱۹۶۶ء میں بنگلے انتقال کا انہیں قدر بہت صدمہ ہوا، اور اس کے بعد بہت السردہ رہنے لگے تھے۔ حالانکہ بھی بہت کمزور ہو گیا تھا؛ باوجود بھول جاتے تھے۔ اس کے باوجود تقویرا بہت کھنے کا شغل جاری رہا۔ لیکن جولائی ۱۹۷۷ء میں طبیعت زیادہ خراب ہو گئی اور میٹر وکٹ خورد و فرسنگ سے طاری رہنے لگی تھی۔ ۲۹ جولائی کو خاموشی اور خد بد اسردگی کا دورہ پڑا؛ اور کھانا پینا بالکل چھوٹ گیا۔ اس کے بعد وہ ادوشن سے کچھ افادہ ضرور ہوا، لیکن بستر سے اٹھنے کی سکھت سلب ہو گئی۔ پورے چار ماہ اسی حالت میں گزرے۔ ۲۹ نومبر ۱۹۷۷ء (شب ۲۵ ذیقعدہ ۱۳۹۵ھ) رات کے پونے نو بجے خالق حقیقی کے بلا و پر بیک ہوئے۔

آٹا خیرہ؟ آٹا ایکسپریس ہوئے۔
 خداداد اگلے دن (۳۰ نومبر) اٹھا۔ اہل سنت اور اہل تشیع نے اگلے ملک ناد جلال پور میں بھی جماعت کی امامت تیار کیا، مولانا محمد علی نقی صاحب مجتہد دین حق صاحب نے اور اہل سنت کی مولانا محمد ہاشم انصاری فرنگی علی (دین مولانا صاحب اللہ شہید انصاری) نے کی۔ بعض اصحاب نے دونوں نازدوں میں شرکت کی۔ انہیں کر لہنے خوشی فضل حسین میں اپنی مرحومہ بیگم کے پہلو میں سپرد خاک کیا گیا۔ یہ رحمت اللہ تعالیٰ
 کئی اصحاب نے ملاوٹ و فسادات کہی۔ ڈاکٹر رفیق حسین رفیق لکھنؤ کی عیسوی میں ہے، شیدائے انیس، افسوس اب ہم سے خود حضرت یہاں ہونے جنت کے مسعود حسن رضوی بیاضہ نکلا ہے منہ سے یہ رفیق اپنے ”بھگیا“ و حقائق تھے مسعود حسن رضوی“
 (۶۱۹۷۵)

ہجری مصری حکیم عربیہ قدرتی کا مٹھی کا ہے :

آہ، صدیف مسعود حسن رضوی (۱۳۹۵)

پرہیز مسعود حسن رضوی مرحوم نے کئی لڑنے میں شاعری بھی کی تھی؛ ادیب تخلص کیا ابجد کو

جب شنگار دی سے مزاحمت برسی، تو یہ شخص ترک ہو گیا۔ لیکن اس زمانے کا جو کلام تھا، اس کا ایک قصہ انتخاب انہوں نے، بہاری شاعری کے دیباچے میں درج کر دیا تھا۔ میں نے جب ایک مرتبہ ان سے دریافت کیا کہ کچھ اور کلام بھی عنایت فرمائیں، تو کہا کہ بس، اب اسی کلام کا کام سمجھیے! لہذا میں وہ اشعار یہاں درج کر رہا ہوں۔ کلام کے تینوں جگہ ہیں کہ اگر یہ شوق جاری رکھتے، تو آج ان کا متنازع شعرا میں شام ہوتا۔

جلببہ کا بے نیاز سی سے اثر بڑھتا گیا
میں بڑا جس جس طرف عالم اور بڑھتا گیا
کچھ عجیب ہے، وہ شریل مقصود کی
جتنا جتنا میں بڑھا، سراسر سفر بڑھتا گیا
فرط خوبی سے دنیا بن گئی آئینہ دار
ایک ہی صورت نظر آتی ہے ہر تصویر میں
کیا کہو، دیوانگی عشق کی رسوائیاں
لفسے کا پابند بھی باندھے گئے زنجیر میں
اک نہ رہتا، اک بے درستی عشق
کیا بتائیں ہم نے کیا دیکھا، تری تصویر میں
ہے انقضہ دل مجھ کی اٹھتی انگوں کا
دب سارے جابلوں کا ابھرنا اور مٹ جانا
ورہ دل نہیں ہنس کے کہتے دے ندا، اے عشق ضبط!

اک دل بنا آشنا کا امتحاں بیٹا ہے آج
آج کل چشم کرم نادر سیما کی ہے
ابھی کچھ مردہ تمناؤں میں جان آئی ہے
پڑوس میں ہوئی ہے بڑی کمرانی عروس
جہاں جب یہ نہیں رہتا کہ اب آؤ اور میرا
طاہر کے نشین، جب وہ شعلہ دل سے اٹھتے ہیں

تو چار آنسو بہا آسا ہوں میں خاکِ نشین پر
یہ سچی مردہ داری ہو، اور دماغوں پر
وہ حال دل جو دھچکیں ہر سو سے تنہا ہو
مجھے تھے طوفانِ بہن میں جسے جانے پتا
ایک سوچ کو وہ پیکر، وہ بھی تھی ساحلِ منتہا
اب خبر دیکھئے، بیاد کی کیا آتی ہے
ہر طرف سے مجھے رونے کی صدا آتی ہے
اس کی چشم مسکے بشادیوں کے دور کھلے
دل کی دنیا کے بہتے مادیات ہم پر گھلے
ایں دنوں کیوں جی نہیں گلتے چٹخشی میں کہیں
مردہ کو شاید ہے پھر میرے نشین کی تلاش
خوف رسوائی نہیں تو ضبطِ غم سے کام کیا
چننے کا رانی جنوں کو پوچھیں تنگ نام کیا

خطے کیا مطلب مجھے، قاصد سے مجھ کو کام کیا

دل میں جو رہتا ہے، اس کو نامہ و پیغام کیا
مجھے تاہم ازل سے کہیں کچھ گھلا نہ ہوتا جو یہ تم لے تھے مجھ کو، تو یہ دل طائر تھا
وہ سیرِ وحشت و وحشت، اور وہ میرے دل کی دیرانی

اُدھر تھا میں، بیا پاں میں، اُدھر مجھ میں بیا تھا
میں نے فریاد بھی اُسے آئی تھی ہنس
وہی دل خندہ شادی سے بھی دیکھ رہے اب
تھے ہم آزاد، جب آباد تھی دنیا نے خیال
حلقہ، حدِ نظر، حلقہ، ذخیرہ ہے اب
صفوںِ دل کے سوا، جو کہیں دنیا میں تھی
نڑے نڑے میں جاں کے وہی تصویر اب
اب کہاں میں وہ کہ جس کے میں کا ہوا غلطے

دل میں طاق چاہیے، ضبط و فغاں کے واسطے
بس اب یہ حسرت ہے اب، اسے طویلِ حبس کی!
نغمہ سے جو یس وہ، تو میں ہی کھول کے دونوں
ہم نکل لاکھوں ہیں، لیکن جڑ پاں کوئی نہیں

مجھ کو دنیا کی بھری محفل بھی خلوت خانہ ہے
خوشی میں رنج، کہیں کیا مال کے علم کو
خزاں کا خوف ہے جوش بہار میں ہم کو
اپنی تدبیروں پر، اسے غافل! قطر تو نے نہ کی

ورنہ ٹرہ لینا خطِ تقدیر کچھ مشکل نہ تھا
غم شکستِ عہدِ ضبط و صبر کا سنا پڑا
ایسے مہمِ بدوں سے آخر و درِ دل بٹنا پڑا
ہر عیش میں دہاں پنہاں تھی بڑی عقل سوز
میں سمجھتا تھا کہ اندازِ جفا کچھ اور ہے
ہم خاک کو سمجھا کیے اکبر ابھی تک
تدبیرِ جہاں تا تلخ تقدیر ابھی تک
سیرِ غلہ، نالِ جہاں تو انا بھی سمجھ لیں
باقی ہے مری آہ میں تاخیر ابھی تک
شکوہ کیا، مجھ کو جو بزمِ ناز سے اٹھوائے ہے

حال کس سہل کا اُس نازک سے دیکھا جائے ہے!

دیکھیں لگا ہوشی کی گستاخیاں ادیبانِ یتیم بدل گئے 'مرے' نازک خراج کے
ہیری آئینے سے خود میں کو یہ دیتی ہے صدا

اب میرا جانوں کہ ترے ناز اٹھائے کوئی
دنیا کو کیا خبر مرے حالِ ستاہ کی قربت کہاں جو مِصافِ مکی کی
دیکھتے قسمت کی محرومی کہ مثلِ سنگ ہے آہ جس کے اندر سے نکلیں اس شخص پر
طاقت پر داز بھی ہے، ہمت پر داز بھی مض پر ہوتے، نکلتی حسرت پر داز بھی
دیا یہ شوق پر داز اک نفس کے رہنے واسے کو

مجھے تجھ سے بس اتنا، میرے فطرت سا دکھنا

تمکین مرست، سید محمد قادر الدین خان 337

جید آباد کن کے ایک معزز اور صاحبِ علم گھرانے میں ۱۹۰۰ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد نواب سید سیح الدین خان ریاست نظام کے منصب دار تھے۔ وہ عوام میں بڑے غشی کے عرف سے مشہور تھے۔ جید آباد کے محلہ مغلپورہ میں سیح الدین خان کی ڈیوڑھی انھیں سے منسوب ہے۔ نواب معین الدولہ ان کے حقیقی بھانجے تھے۔ جب معین الدولہ کی کم عمری میں ان کے والد کا انتقال ہو گیا تو جاگیر گورنٹ آف وارڈ کی تحویل میں چلی گئی۔ وہ حضور نظام نے نواب سیح الدین خان کو نیشنل آلہ کادلی اور مگران معزز کروانا فتح اورنگ خان کا ۱۹۱۱ء میں انتقال ہوا۔ اس وقت ۵۵ سال کی عمر تھی۔

نواب سیح الدین خان کے پانچ بیٹے ہوئے، (۱) عزیز علی الدین؛ (۲) عبدالقادر؛ (۳) وحید الدین خان؛ (۴) قادر الدین؛ (۵) سلطان علی الدین؛ اور تین بیٹیاں؛ (۱) لاڈلی بیگم، (۲) قادری بیگم اور جیلانی بیگم۔

سید قادر الدین خان کو بچپن سے ادنیٰ ماحول ملا۔ والد اگرچہ شعر نہیں کہتے تھے، لیکن ان کا ادنیٰ ذوق بہت بلند تھا، جیسا اس عہد کے اکثر رؤسا کے یہاں ملتا ہے۔ قادر الدین کے تین بھائی شعر کہتے تھے۔ سید عبدالقادر کا تخلص ناصر تھا۔ ان سے چھوٹے سید دلگیر الدین ناؤ تخلص کہتے تھے، ڈراما نویس سے کبھی ایسی تھی سان کے بعض غیر مطبوعہ ڈرامے ان کے خاندان میں محفوظ ہیں۔ سید قادر الدین سے چھوٹے بھائی سلطان

عفی الدین بھی شعر کہتے تھے اور قاضی تخلص کرتے تھے۔

شہید قادیان دین کی پوری تعلیم گھر پر ہوئی، کسی مدرسے نہیں گئے۔ فارسی میں پوری دستگاہ نشی، انگریزی بھی نقد و ضرورت حاصل کر لی تھی۔ مطالعہ بہت وسیع تھا۔ ان کے والد کا خاصا بڑا کتا بچانہ تھا۔ انھوں نے اس سے بڑا استفادہ کیا۔ خود بھی کتابوں کا ذخیرہ جمع کر لیا تھا۔ اپنے اساتذہ کے زیر اثر جلد ہی شعر کہنے لگے۔ تمکین تخلص تھا۔ مرستہ کا اضافہ اپنے صوفی بزرگ کے لقب سے کر لیا تھا۔ آغاز شعر گوئی میں کچھ دن غلام محمد صوف ترک علی شاہ ترکی (ف: ۱۱۰۹) سے اصلاح لی۔ بعد کو تذاتوں نظم دہا طباتی (ف: ۱۱۰۳) سے مشورہ کرتے رہے۔ وہ نظم دہا طباتی کی فنی اور علمی قابلیت اور مہارت کے بہت قائل اور ماننا خوان تھے، ادھر کہا کرتے تھے کہ مجھے ان سے بہت فیض حاصل ہوا۔

ان کا کلام اپنے عہد کے نو قز جرائد میں شائع ہوتا رہا، لیکن وادستہ مزاجی کا یہ عالم تھا کہ کبھی اسے مرثیہ کہنے کی کوشش نہیں کی۔ لہذا آج تک ان کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہو سکا۔ اندیشہ ہے کہ اگر نوری توجہ نہ کی گئی، تو اس باکمال شاعر کی کوئی یادگار نہیں رہی۔ اگرچہ بنیادی طور پر غزل سے مزا دلالت تھی، لیکن انھوں نے بعض موعک کی تئیں بھی کہی ہیں۔

سادہ عمر کیس جرم کر کام نہیں کیا۔ بعض اعتراضات جواباتے سبیل پیدا کی بھی، لیکن ان کے لاابالی پن نے یہ تعلق زیادہ دن تک قائم نہ رکھا۔ نواب معین الدلہ ان کے پیچھے بھاگتے تھے جب وہ دارالہمام مقدر ہوئے، تو انھوں نے بلدے میں ان کا بحیثیت مددگار پولیس تقرر کر دیا، لیکن یہ مزید بگ کے دوران ہی میں متعفی ہو کر گھر چلے آئے۔ اسی طرح تعلق دار درجہ اولیٰ نواب کاظم جنگ نے جو شعر کہتے اور کہی کبھی ان سے مشورہ بھی کر لیتے تھے، ان کے لیے نوڈ آفسیر کے عہدے کا انتظام کر دیا۔ شاہرو حقول تھا، اور اس پر کام اور تہذیبی برائے نام۔ لیکن یہ شاید ایک سال سے زیادہ نباہ نہ کر سکے۔ غرض تھوڑا بہت جو کچھ اپنی خانوادگی جاگیر اور منصب کے مل جاتا، ہر طرح سے اسی پر قانع رہے۔ لیکن پسین سخن

اور اس کے بعد انضمام ریاست پر یہ آمدنی بھی ختم ہو گئی۔ لطف یہ کہ اس پر بھی ان کی چٹائی پر بل نہیں آیا۔ دینی و شعبداری اور آن بان اور ٹھٹھا، جو ماری عمران کا شعار رہا تھا، اس کے بعد بھی قائم رہا۔

آخری زمانے میں اکثر بیمار رہنے لگے تھے۔ غذا بالکل ترک ہو گئی تھی۔ بہت مجبور کرنے پر دو چادر تھیں کھا لیتے یا دو دھڑ لیتے۔ کمزوری ہونا ہی چاہیے تھا۔ ۱۲ دسمبر ۱۹۷۵ء کو فجر کے وقت آنکھ کھلی، تو طبیعت کی خرابی کی شکایت کی۔ بیگم نے خیال کیا کہ کمزوری کے باعث یہ تکلیف ہے۔ وہ بھیش کر گرم دودھ لاکے انھیں پلائیں۔ واپس آئیں، تو جرح قیصر حفصہ سے پرہیز کر چکی تھی۔ اتنا بشددت تاوانیدہ راجہ جون۔ اسی دن بعد نماز عصر تجیز و تکفین عمل میں آئی، اور درگاہ شاد خاوش کے احاطے میں سپرد خاک ہوئے۔

ہاں کہ شادی صدیق علی شاہ (سابق تحصیلدار سہارنپور) کی صاحبزادی بدایا بیگم سے ہوئی۔ وہ آمدن فارسی بہت اچھی جانتی ہیں۔ شو بھی کہتی ہیں، یہ سن کر تخلص ہے۔ مرحوم سے دو بیٹے دید یوسف شرف الدین (عرف یوسف سرمست) اور سید قیصر صلاح الدین (عرف قیصر سرمست) اور ایک بیٹی جمیلہ حاتمۃ النساء بیگم یادگار ہیں۔ — یوسف سرمست عثمانیہ دینیواری کے شعبہ اُردو میں لیکچرر ہیں۔ ان کا ڈاکٹریٹ کا مقالہ بیسویں صدی میں اُردو ناول؟ شائع ہو چکا ہے۔ چھوٹے بیٹے قیصر سرمست معروف آرٹسٹ ہیں، سرورق کا ڈیزائن بنانے میں ان کی خاصی شہرت ہے۔ تینوں شادی شدہ اور ماشاء اللہ صاحب اولاد ہیں۔

کلام بہت پختہ اور جاندار ہے۔ انھوں نے کلام شائع نہیں ہوا۔ ذیل میں غزلیات مختصر انتخاب اور ان کی ایک نظم بطور نمونہ دے رہا ہوں جو ان کی بیگم اور صاحبزادے قیصر سرمست کی مہربانی سے تیار ہوئی ہیں ان کے حالات بھی انھیں سنائے ہیں:

ہم یاد کر رہے ہیں، انھیں کس امید پر اب تو غم فرازی کا بھی آسرا نہیں
حال آں کہ تم نے کب کا صلا بھی دیا، مگر تم مجھ کو یسویں جاؤ گے، دل مانتا نہیں
کہنے کو اب بھی زندہ ہوں، لیکن تم نے مغیر کب زندگی پر موت کا دھوکا ہوا نہیں

وصل و فراق کھیل ہیں نیز نگہِ شوق کے درد جنوں عشق کا کچھ مدعا نہیں
 نکلیں! جغلے یاد کو مٹو مٹو تو ہو اپنی وفا کا بھر پے تو عقدہ کھلا نہیں
 اک لمحہ فریبِ اجل کے سوا مجھے کس وقت انتظار تھا دارِ مدد نہیں
 دنیا و دین کے اسے دیکھ تو لیا یہ اور بات ہے کہ کہیں کا رہا نہیں
 مقامِ نوبت میں پوچھو کہ دیوانوں پہ کیا گزری

جب آئی شمعِ محفل میں، تو پروانوں پہ کیا گزری
 خزاں میں جو گلستاؤں پہ گزری سب پہ نظر ہے
 کس کو کیا خبر لیکن، ییا بانوں پہ کیا گزری
 زردا جوشِ جنوں، دردِ محبت اور رشخے دو

یہ داماں خود بتا دینگے، اگر بانوں پہ کیا گزری
 جو کچھ جیتی، سو جیتی مجھ پہ لیکن کیا کہوں تمکین!
 مرے ضبطِ مسلسل سے سترائوں پہ کیا گزری
 کہاں کی روشنی، ہم لطفِ تاریکی بھی کھو نہ گئے

شبِ زمِ اپنی آنکھوں پر بھر دسا کر کے بھٹکے
 نہ امیدوں کا طوفان ہے، نہ اب طغیانِ نوبت کا
 کچھ ایسا درد ہے دل میں کہ جس سے ہی نہ گھبرائے
 حقیقت میں وہی دردِ دامنِ عشق ہے، تمکین!

کہ لب تک بھی نہ آنے پائے، اور دل میں تر جاے
 وہ اپنے زعم میں جس کو سہلا دیتا سمجھتے ہیں
 اب اس میں کیا کسی کو، میں ہوں کس کا کٹھن
 بظاہر میں ہوں ان کا جو مجھے اپنا سمجھتے ہیں
 عجب چیتاں ہے یہ کیفیتِ دل
 نہ دوسریں وہ خل، نہ جھنے میں دخل
 کئی کیا ہے منزل کی راہِ طلب میں
 کو راہِ طلب میں نہیں کوئی منزل
 محنت میں مشکل سے مشکل بھی آساں
 محبت میں آساں سے آساں بھی مشکل

گو تم بھی پاس ہو، اور حاصل ہے ہر خوشی بھی

پھر بھی میں کچھ کئی سکہ ہر شے میں پاد ہوں

ہر ذرہ کائنات کا اک آفتاب تھا وہ بھی تھی، اور یہ بھی شب با آفتاب ہے
جو مجھ کو چاہتے ہیں، تجھے چاہتے رہے یہ مان کر بھی اس کا نتیجہ خراب ہے

مست ہو چھ، وہ تیری فرقت میں کس دل سے گزرا کر گئے ہیں

جو تیری تمنائیں، تیری دودی بھی گواہ کئے ہیں

ہے نتیجہ و شکستہ اہل وفا و اہل جفا میں فرق بھی

یہ باد کے جیتا کرتے ہیں، وہ جیت کے مارا کرتے ہیں

وہ توں کو سنبھانا تو سیکھو، تم دل کا بھانا تو سیکھو

لے دو مست! ڈبو سکتے ہیں وہی ہجو پار مارا کرتے ہیں

کیا بات ہے، کیوں ہر بھر کے ترا ہی نام زباں پر آتا ہے

ہم نے تو سنا تھا، مشکل میں انہوں کو پکا مارا کرتے ہیں

دور رو کے بھی اہل دانش پس سے دم بھر گزرا دی عاکی

جو زندگی تیرے دہونے نہیں نہیں کے گزرا کر گئے ہیں

جان کس کو نہیں عزیز، مگر پھر بھی ترک وفا کریں کیونکر

ہر قوت دل کو آزما کر دیکھا اک اک بت کو خدا بنا کر دیکھا

تسکین اسکو بھولنے والا میرا بھٹہ لاندہ گیلہ لاکھ بھٹلا کر دیکھا

بھولا ہوا راستہ دکھایا مجھ کو میرا اپنا چتا بتایا مجھ کو

دشمن کو میں کیونش دوست رکھوں لیکن دشمن نے تو آدمی بنایا مجھ کو

ایس نہ ہو، دوری منزل پہ نہ رو

دہر کا کوئی غم نہ کر، ادا سان نہ کھو

سینکے ہوؤں کا بھی اک ویلہ ہے بیاں

خود راستہ مار ہیگا، مگر راہ تو ہو

مفلس کی دنیا

تو جس کی یاد میں مجروح اب تک ہے جگر میرا
 جہاں کے عادی و کسب و کار، افلاس تیرا
 جہاں ہر صورتِ امید تو میدی کی آبی ہے
 جہاں کے طائلوں کی بولیاں بس آہ و شیون ہے
 جہاں کا چپہ چپہ دودھوں کا کام دیتا ہے
 جہاں کی شامِ بیکھر دشمنِ امید جوتی ہے
 جہاں کی دھوپِ شہتِ سودا و رسوم جوتی ہے
 جہاں دن و دیر دھل جاتا ہے سورج و نگر
 جہاں آنکھوں پہ آرام سے نقدِ برسوتی ہے
 جہاں ہر دلوں ہو جاتا ہے رہن تیرے دوستی
 جہاں حسِ خود داری کی خبیث گھوٹ جاتی ہے
 جہاں صبر و رضا ہو جاتے ہیں محبوب و غدار
 جہاں آؤں دیاں بھی قید کے سائے میں بھلتی ہے
 جہاں یہ ان چڑھتے ہیں خیانتِ محرم ہکا
 جہاں کے خوف سے نہیں کے دل بھی تھوڑا
 جہاں ہر وقت دن کو بھی دکھائی دیتے ہیں
 ذلیل و خوار اپنی سکتوں سے آپ شرائے
 فلک کی آنکھ کے ناسود قلبِ ہر کے چھالے
 فنا سے عزم و مرگ اور فنا کی زندہ تصویر
 ہیروں کے رنگِ ایوان، مگر ارقمِ انسانی
 متمدن جن کو اک انسان نہ جیواں کہتا ہے

تقصا و ایسی دنیا میں ہوا اک نگر میرا
 جہاں کی سرزمینِ نکست جہاں کا آسمان پتی
 جہاں چاروں طرف مایوسیوں کی جھلکی ہے
 جہاں حدِ نظر تک رخ و غم کے پر خطر ہیں
 جہاں کا نودہ نودہ دھوپِ آلام دیتا ہے
 جہاں کی صبحِ حزن و یاس کی تمہید جوتی ہے
 جہاں کی چاندنیِ تاریک اور مغموم جوتی ہے
 جہاں ہے ایک ہی مغمومِ مرگِ زندگانی کا
 جہاں دن و رات سرچکڑے ہوئے نقدِ برسوتی ہے
 جہاں ہر شوق ہو جاتا ہے صرف ناقہِ بدستی
 جہاں جوشِ اولو العزم کی سائنسِ شمال
 جہاں صدق و صفا کا خون پی لیتی ہے لاداری
 جہاں بے جرمیاں بھی جرم کا قابِ بدستی ہیں
 جہاں نشو و نما پستے ہیں چور و بھوشِ غیاری
 جہاں ہر قدم پر پائے ایمانِ دنگ تاتے ہیں
 نہیں جیتے ہیں ننگِ زندگی وہ ہیٹ کے آس
 زلزلے بھوکے دھکائے، خدائی بھر کے ٹھکڑا
 عسکرِ آہ، سرِ ستار زبانِ حال کے نالے
 غلامی کی چابِ تیرہ کی، بندہ تصویر
 گیشیلِ جلی و پستی، کشتہ او لم و دادانی
 تمول جن کو کیسے چکے جہاں سمجھتا ہے

نقطہ اک حکم جن کے مذہب دایاں کی قیمت ہے
 شکر کرتی ہے تقدیر احسان کے جن کے
 رہا کرتی ہیں برگشتہ ہمیشہ قیمتیں جن کی
 نہ جن کی اپنی مرضی ہے، نہ جن کا اپنا خفا ہے
 کہ شک ہونے لگا ہے خود انھیں بن کر فتنہ
 غلامی، مفلسی، ناتوانی، بے بسی، بے جا
 جنھیں زندہ سمجھتے، زندگی کو شرم آتی ہے
 اجل کو جن سے نفرت، زندگی بیزار ہے جن

نقطہ اک شک دہی جن کے جسم جاں کی قیمت ہے
 طبیعت کھیلنی ہے لذت جن جذبات کے جن کے
 ہو کرتی ہیں سامان تفریح عصمتیں جن کی
 ارادوں پر بھی غالب جن کے غیروں کا اڈہ ہے
 وہ ہیں جن کے جوہر اس قدر رنگتے تھیں
 ہے بس لڑکے جن کی کائنات زندگی ساری
 جنھیں انسان کہتے آدمیت پہنچا جاتی ہے
 فضا سے بھر دے، کون دے گا کون دے گا

کوئی غمزدار ہے جن کا، نہ کوئی پوچھنے والا
 خداوند! الہا! داد! اے داد دہی!

محمود بیگ، میرزا

مغلوں کے ایک متوز اور میرانے خاندان کے نام سے تھے۔ ان کے مورث اصل دادا بیگ جبہا لگیری میں وسط ایشیا کے شہر فرغانہ (حال تاجکستان) سے خدستان آئے اور دہلی میں بس گئے۔ یہاں انھوں نے اور ان کی اولاد نے سہولیات کے لیے مختلف پیشے اختیار کیے۔ پہلے کے حالات کچھ یقین سے نہیں کہے جاسکتے، لیکن جب ۱۸۵۷ء کا جنگا رہ ہوا ہے، تو ان کے دادا میرزا افضل بیگ کا شہر کے متمول لوگوں میں شمار ہوتا تھا۔ کئی دوسرے گھرانوں کی طرح یہ لوگ بھی دسکے اسے شہر سے نکل گئے۔ یہی خیال تھا کہ جب ان قائم ہو گیا، واپس آجائیں گے۔ لیکن ستمبر ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کا دہلی پر دوبارہ قبضہ ہو گیا، تو دادا و دیگر کا وہ اپنا گرم ہوا، اور سربراہ آئندہ مسلمانوں کی جا داد پڑا۔ اس طرح سہار کی محسوس یا نیلام ہو گئی، اگر ان عزیزوں کو برقی شکل سے محذور ہو، مگر وہ اس (فرارستان) دہلی میں سر چھپانے کو محکمی اس کے بعد خاندان کی مالی حالت بھی بہت کمزور ہو گئی، اور مشکل سے گزار بسر ہو س

سکی۔
میرزا افضل بیگ کے پانچ بیٹے تھے: میرزا محمود بیگ، میرزا ابجد بیگ، میرزا اسحاق بیگ، میرزا یعقوب بیگ، میرزا شہباز بیگ، تبدیل شدہ حالات کے باعث سب کی مناسب تعلیم و تربیت کا انتظام بہت مشکل تھا۔ اس لیے والدین نے بڑے تیوں بیٹوں کو پیشہ منہا لئے پر روزی کمانے کو چھوڑنے کوئے کام پر لگا دیا؛ صرف چھوٹے دو ار کے تعلیم

حاصل کر سکے۔ اس طرح میرزا یعقوب بیگ، کسی نہ کسی طرح، انٹھویں دہائی تک پڑھے، اور اس کے بعد میونسپل کمیٹی میں ملازم ہو گئے۔ بڑے پھولے میرزا شہباز بیگ سے زیادہ خوش متعہ رہے۔ مثلاً ایک وہ سرکاری الاٹمنٹ کے عریکے سکول میں پڑھے۔ (یہاں انھوں نے مولانا حالی سے پڑھا تھا)؛ اور اس کے بعد جو ۱۸۹۳ء میں دوسری دہائی کی سندھ پنجاب یونیورسٹی سے حاصل کی۔ ان کا ۲ جنوری ۱۹۶۸ء (۱۰ روم عید الفطر) انتقال ہوا اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

یہی میرزا شہباز بیگ ہمارے میرزا محمود بیگ کے والد بزرگوار تھے۔

میرزا شہباز بیگ دسویں دہائی کا انتقال پاس کرنے کے بعد ہی (۱۸۹۳ء میں) سرچھن (حزبی) کے دفتر میں بطور ملک بھرتی ہو گئے تھے۔ لیکن وہ اس پر مطمئن ہو کر بیٹھ گئے، نہ مستقبل سے متعلق غافل رہے۔ ملازمہ کے دوران میں بھی وہ مختلف امتحانوں میں بیٹھے اور کامیاب ہوئے لیکن جس سے تہہ تیغ عہدے میں بھی ترقی ہوئی، اور تنخواہ میں بھی۔ ۱۹۳۲ء میں جب وہ ملازمت سے سبکدوش ہوئے ہیں، تو سنٹرل پی، ڈبلیو، ٹوی کے دفتر میں اسسٹنٹ اکاؤنٹنٹ افسر تھے۔

پہلی بیوی کی وفات کے بعد ۱۹۰۱ء میں شہباز بیگ کی دوسری شادی میرزا محمود حسین بیگ، مکمل ریاست جاوہر کی صاحبزادی، تیسری بیگم سے ہوئی۔ میرزا محمود حسین بیگ بھی ان کے ایک بھائی اور میرزا ادیب بیگ کی ایک دوسری شاخ کے چشم و چراغ تھے۔ اس بیگم سے میرزا شہباز بیگ کے اثناء اثناسوس لٹکے اور چار لڑکیاں ہوئیں ان میں سے دو لڑکیاں حضرت سنی میں اللہ کو پیادے ہو گئے۔ چونکہ انھوں نے تعلیم کے فوائد کا اپنی زندگی میں تجربہ کیا تھا اور یہ انھوں نے خود اپنے مذہب بازوں سے حاصل کی تھی، اس لیے میرزا شہباز بیگ نے اپنے سب بچوں کی تعلیم پر خاص توجہ کی

میرزا محمود بیگ بیٹوں میں تیسرے تھے، ان سے دو بڑے بھائی میرزا ادیب بیگ اور میرزا مسعود بیگ تھے۔ میرزا محمود بیگ ۲۰ اگست ۱۹۰۸ء کو دہلی میں پیدا ہوئے، چونکہ وہ اپنے والد کے ساتھ رہے، اس لیے ان کی تعلیم انھیں شہروں میں ہوئی،

جہاں وہ مختلف اوقات میں تعینات رہے۔ چنانچہ انھوں نے دسویں درجے کا امتحان ۱۹۳۳ء میں مزنگ ہائی اسکول، لاہور سے پاس کیا، جہاں اس زمانے میں ان کے والد کا ڈسٹنٹ جنرل کے دفتر میں ملازم تھے۔ اس امتحان میں وہ پہلے درجے میں پاس ہوئے اور اپنے اسکول میں تقرر آئے۔ اس کے بعد اگرچہ انھوں نے لاہور کے فورین کرپسین کالج میں داخلہ لے لیا تھا، لیکن سال بھر بعد والد کا تبادلہ دہلی ہو گیا، ہندوستان اگر وہ انیکلوچرک کالج کے انٹر (سال دوم) میں داخل ہو گئے۔ لیکن اس اؤٹ لاند اور یہاں سائنس کے مضامین کی پڑچانی کا انتظام نہ ہونے کے باعث فیل ہو گئے۔ یہ ناکامی تا زیادہ ثابت ہوئی، اس کے بعد انھوں نے خوب محنت کی اور ۱۹۳۷ء میں انٹر کا امتحان اس امتیاز سے پاس کیا کہ پوری یونیورسٹی میں اول آئے۔ اب انھوں نے دہلی کے پرانے کالج سائنس ٹینٹھیس میں داخلہ لے لیا اور یہاں سے ۱۹۳۹ء (میں بی۔ اے اور ۱۹۳۱ء میں ایم۔ اے) فلاسفی کی اسناد حاصل کی، ان دنوں میں بھی پہلا درجہ حاصل کیا، اور یونیورسٹی بھرس کامیاب طلبہ میں اول آئے۔

تعمیم دیکھا دتا تھا، رہنے کے بعد ملازمت ملنے میں کیا مشکل ہو سکتی تھی! کوئی سال سو سال حکومت ہند کے محکمہ تعلیم میں ملازمت کرنے کے بعد اکتوبر ۱۹۳۲ء میں جگہ نکلتے پر اپنے (رانیکلوچرک) کالج ہی میں فلاسفی کے محاذ سے مقرر ہو گئے اور پندرہ برس میں ستمبر ۱۹۴۷ء تک اس عہدے پر تنگ رہے۔

تعمیم ملک کے بعد کالج کا نام بدل کر "دہلی کالج" دیکھ دیا گیا۔ چنانچہ ستمبر ۱۹۴۷ء میں بیگ صاحب اس کے نئے پرنسپل مقرر ہوئے اور یوں سترہ برس، یعنی ستمبر ۱۹۶۴ء تک کالج کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں رہی۔

دہلی کالج کو ان کے زمانے میں بہت ترقی ہوئی، کیا بلحاظ نظم و نسق کے، اور کیا بلحاظ تعداد طلبہ اور تاتاریکے، یہ دہلی یونیورسٹی کے متاذ کالجوں میں شمار ہونے لگا۔ اس کامیابی کا سہرا بجا طور پر بیگ صاحب کے سر تھا۔ وہ خود بھی اب ہر جگہ تعلیمی اہل میں مجتہد اور مؤثر خیال کیے جاتے تھے۔ چنانچہ ان دنوں دہلی یونیورسٹی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ

کے انتظامی اداروں کے رکوا رہے۔ دلی کے باہر اجیر، بھوپال اور بھونیشور کے تعلیمی اداروں کی انتظامیہ کے بھی رکن تھے۔

اکتوبر ۱۹۶۲ء میں حکومت ہند نے ایک تعلیمی وفد مصر بھیجا تھا۔ میرزا محمود بیگ اس وفد کے سربراہ تھے۔ مصر کے بعد یہ وفد مشرق وسطیٰ کے دوسرے ممالک، سوڈان، عربیہ سعودیہ، اردن، لبنان، شام، عراق، ایران بھی گیا تھا۔

۱۹۶۳ء سے ۱۹۶۶ء تک وہ ریاست جموں و کشمیر کے تعلیمی میسر رہے، اور پھر جنوں کشمیر یونیورسٹی کے ہیڈ کوارٹر کے سرورٹس چانسلر کے عہدے پر بھی فائز رہے (۱۹۶۷ء تا ۱۹۶۸ء)۔ سب سے آخر میں وہ دلی یونیورسٹی کے مراسلاتی نصاب اسکول کے پرنسپل مقرر ہو گئے تھے۔

دلی کا پہلا دورہ ۱۹۷۲ء میں پڑا۔ بہت دیر علاج رہے اور بغضِ پنج نکلے، اس کے بعد کچھ احتیاط تو کرتے رہے، لیکن ان کی زندگی کے معمولات میں بہت کم فرق آیا۔ ۱۲ دسمبر ۱۹۷۷ء کو حیدرآباد میں تھے۔ اس دن صبح سے شام تک حیدر لٹنے والوں کا ہجوم رہا۔ حسب معمول دوستوں کی آؤ بھگت اور خاطرِ حالات میں مشغول رہے۔ یوں تمام دن اکدام کا ایک لمحہ نصیب ہوا۔ رات گئے جب بستر پر لیٹے ہیں تو ٹکان کے ماسے اٹھ اٹھاں ہو چکے تھے۔ اگلے صبح ۱۵ دسمبر ۱۹۷۷ء کو ساڑھے سات بجے صبح کے قریب دیکھا گیا تو معلوم ہوا کہ روح سوتے میں بغیر عفری سے پرواز کر گئی ہے۔ انا مشیہ، انا امیر راجستھان، جازہ اٹھنے دن ۱۶ دسمبر کو اٹھا اور انھیں جامعہ قیاسیہ، جامعہ محکمہ کے قبرستان میں اپنے والد کے چلو میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ مادی عمر شادی نہیں کی، ملاؤ اور فوت ہوئے۔ رہے نام، اللہ کا۔

ان کے دوست غلام احمد علی نے قطعہ تار و پنجِ وفات کہا:-

پہلو دلی پر دلا کر دلِ رحمن	ہمو بس محلِ دِ یاسین و یمن
گشتِ بارِ اجل شمعِ علم و ادب	کر دے نورِ ہر عقل و انجمن
رفتِ یوسف زکھانِ بیافرا	گشتِ دلی بھیرش چو بیتِ الحزن

زیست محمود، محمود زنت اذہاں برمدانش دود رحمت ذوالرش
 مال دوش بکنت علیٰ بحر سنج
 ہلینش، نکو کار، شیرین

(۱۳۵۵)

شرابِ دل کی کوشش تینیم میں دھلی ہوئی زبان اور لبِ دایبے پر جیسی تعدت نہیں حاصل
 تھی، اور مختلف احباب کی مجلس میں جس طرح وہ جیتے تھے، وہ بیان کرنے کی نہیں
 دیکھتے اور سننے کی چیز تھی۔ سچ پچ وہ کہیں اور نہ کرتے کوئی، کاماں سندھ جاتا تھا۔
 انہوں نے نقیصہ و تالیف کو اپنا پیشہ نہیں بنایا۔ اور اس سے ادب اور تادیکہ دونوں
 کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا۔ دل کی پرانی تہذیب، بیان کے رسم و رواج، دینِ جن
 کہتا عالم انہیں تھا، ان کے وہ اسے محفوظ کر جاتے۔ وہ برسوں ان موضوعات پر
 آل انڈیا ریڈیو سے چھوٹی چھوٹی تقریریں نشر کرتے رہے۔ جن لوگوں نے یہ تقریریں
 سنی ہیں، وہی کہہ ان کا لطف جانتے ہیں۔ ان کی زبان کا لوہا اور اُردو چرٹھاؤ،
 روزمرہ کی چاشنی، گھر لو اندازِ بیان، ایک سامراج کا رنگ۔ بھولنے کی چیز نہیں
 ان کی ۱۳ تقریروں کا ایک بہت ہی مختصر مجموعہ "نئی حویلی" کے عنوان سے چھپا
 تھا (دق ۱۹۶۶ء) جو صحیح معنوں میں بقامت، کثرت و قیمت بہتر کا معیار ہے۔
 وفات کے بعد ۱۹۵۵ء کے جنگلے کے ادب میں ۱۳ ریڈیائی تقریروں کا مجموعہ دق
 اٹھارہ سو ستادق کی "کے عنوان سے چھپا (دق ۶، ۱۹۷۶ء)۔ یقیناً ابھی اور بہت سی
 تقریریں ہونگی۔

نجم آفندی امیرزا تجل حسین

مولانا محمد حسین آراؤ نے لکھا ہے کہ میرزا جعفر علی فصیح اپنے ہمد کے چار نامی رشتہ گوشترا میں سے تھے۔ بقیہ میں تھے، خلیق اور ضمیر اور دیگر۔

فصیح کے والد مرزا مادی علی فیض آباد کے محلہ مغلوں میں رہتے تھے فصیح کے علاوہ ان کے دو اور بیٹے تھے، بلخ اور صبح فصیح ۱۷۷۷ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے آخر عمر میں ہجرت کر کے کڑ مغلہ چلے گئے تھے، وہیں وفات پائی۔

بچپن فصیح کے برادر خود میرزا نجف علی بلخ اور بلخ کے بیٹے میرزا بلخ بھی شاعر اور مرثیہ گو تھے۔ میرزا کچی کے بیٹے میرزا عاشق حسین مرحوم نیرم آفندی ہوئے، جو اس سلسلہ الذہب کے لیے بھی باعث فخر تھے۔

نیرم ۱۸۹۰ء میں کڑہ حاجی حسن، آگے میں پیدا ہوئے۔ شاعری گویا ان کی گھنٹی میں پڑی تھی، بہت کم عمری میں شعر کہنے لگے، جب نیک و بد کی تیز ہوئی، تو اپنے حقیقی ناموں پیدا خیال حسین میرزا شکوہ آبادی رت، اگست ۱۸۸۰ء میں مشورہ کرنے لگے۔ میرزا خود فنِ مرثیہ میں دبیر کے شاگرد تھے، اور غزل میں نام کے۔

نیرم نے اپنی زندگی میں بہت کچھ کہا، لیکن اموس کو اس میں سے بہت کم شائع ہوا، کہا جاتا ہے کہ غزلیات کے کتابت دیا ان تھے، لیکن ان میں سے صرف دو ہجراخ، نیرم اور آیا نیرم، منصف شہود پر آئے، پھر کڑوں میں مرثیہ کچھ تھے، سلام تعاضد، رباعیات ان کے

علاوہ، باعیات کا ایک مختصر انتخاب کس نے دلی سے شائع ہوا تھا۔ بزم غائب
مولود معراج وخواجہ حسن نظامی (ف: جولائی ۱۹۵۵ء) کی فرائض پر کہا اور ایک
مختصر اجتماع میں دو گاہ حضرت نظام الدین اولیا میں سنایا۔ خواجہ صاحب مرحوم نے
اسی مجلس میں بزم کو ”معراج الشہداء“ کا خطاب عطا کر دیا۔ بزم کا ۲۳ مارچ ۱۹۵۲ء کو
۱۳ برس کی عمر میں آگرے میں انتقال ہوا۔

میرزا تاج محل حسین نجم آفندی بھٹیس بزم آفندی کے بیٹے تھے۔ رمضان ۱۳۱۰ھ (مارچ/اپریل ۱۸۹۳ء) میں آگرے میں پیدا ہوئے۔ اعداد، فارسی، عربی کی تعلیم گھر پر ہوئی۔ اور
ان زبانوں میں اچھی استعداد پیدا کر لی۔ چند مفید عام اسکول، آگرہ میں حاضری
دی اور یہاں سے نکل کر انھوں نے ایک سنہ کی تعلیم جس سے انگریزی میں بھی کچھ شہد ہو گئی
تھی۔

جس کا حوالہ میں ان کی پرورش اور نشوونما ہوئی، اس میں شہر گوئی لایا جاسکتا ہے۔ چنانچہ
دس بارہ برس کے سن میں شعر کہنے لگے۔ مشورہ اپنے والد نجم آفندی سے، بابا اور ان کے
سوائے کسی سے اصلاح نہیں لی۔ روزگار کا مسئلہ پیش آیا، تو ریلوے کے ٹکٹے میں ملاز
مت لگئی، اور ۱۹۱۲ء میں دلی میں تعینات ہو گئے۔ یہاں مسائل اور تنہو داد اور مزاجتو سحر
کی صحبت میں رہے۔ تیوں اہل زبان اور صاحب علم و فن بزرگ تھے، نجم نے ان سے
بہت کچھ سیکھا اور خود استاد کا درجہ حاصل کر لیا۔ دلی کے چند سالہ قیام کے بعد ان کا
تبادلہ فاضل پور ہو گیا۔ یہاں نجم نے ایک مجلس ”انجمن شبلیہ بنوں“ کے نام سے قائم کی۔
اس انجمن نے ان اطراف میں اگر دلی اچھی خدمت سر انجام دی، اس کے زیرِ اجتماع ہو کر
ہر مہینے شاعر ہوتا رہا۔

آل انڈیا شیعہ کانفرنس ان دنوں شروع ہو رہی ہے۔ ہر سال اس کے سالانہ اجلاس شیعہ بڑے
شہروں میں ہوتے اور صفی بکھوئی مرحوم (مت: جون ۱۹۵۰ء) ان میں اپنی تاریخی نظمیں
پڑھا کرتے تھے۔ کانفرنس کا ۱۹۱۵ء کا اجلاس (۱۵-۱۶ اکتوبر) الہ آباد میں ہوا تھا۔
اس اجلاس کی صداقت انریبل سید ابوجعفر دہلوی جابندہ دہلوی نے کی تھی۔ اس جلسے میں

نجم آفندی نے اپنی نظم "ترتیبیم" پڑھی۔ نظم بہت کامیاب رہی اور اس کے ایک ایک مصرع کو بار بار پڑھوایا گیا۔ نظم ختم ہونے پر کئی حضرات نے انھیں غزو میں اٹھایا۔ حضرت عزیز مکھنوی اور محشر مکھنوی نے جو جلسے میں موجود تھے، انھیں ایک ایک طلائی تمغہ دینے کا اعلان کیا؛ ایک طالب علم شیدھا بر حسین نے اپنی طرف سے نجم آفندی کو ایک گھروں پیش کرنے کا وعدہ کیا۔ غرض بہت جوش و خروش تھا۔ فیصلہ ہوا کہ نظم نیلام کی جائے۔ قیمت اچانک بولی دی اور آخری بولی (۱۸۰۰ روپے) صاحب صدر راجا شید ابو جعفر پر ختم ہوئی۔ بعد کو چونکہ یہ روپیہ داخلِ قییم خانہ کرنے کی رائے ہوئی لہذا حسبِ تجویز جناب صدر قراپا یا کہ ہر شخص جو بولی بولا ہے، وہ اپنا روپیہ ضرور داخل کرے۔ اس طرح سے اس نظم کی قیمت (۵۶۵) روپیہ وصول ہوئی، جو بیت خانہ (قائم شدہ ۱۹۱۳ء) کو لے دی گئی۔ (یہ نظم نجم آفندی کے پہلے نمونہ کلام ہے۔ بچوں کا وہ میں شامل ہے)

یہ ملک میں سیاسی تحریک کے شباب کا زمانہ تھا۔ انگریزوں سے ترک موالات کا غلط بلند ہوا۔ نجم آفندی شروع سے انگریز دشمن اور وطن دوست رہے تھے۔ دفتر میں ان کا امن ایک انگریز نمونہ تھا۔ ایک دن وہ ان کی کھدرواشی پر معترض ہوا۔ نجم نے دوبارہ جواب دیا تو بطور نرا ان کا تبادلہ آسنول کر دیا گیا۔ اس زمانے کی ایک غزل کا مقطع ہے:

جینا ہے حصار بحر و شام میں اے نجم!

بنگا لے میں گھر ہو کہ وہ آئے میں میرجو

بعد کو جب سرکاری ملازمتوں کے ترک کرنے کا سوال اٹھا، تو انھوں نے بھی ریلوے کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ اور دہلی چلے گئے۔ یہاں ان کا تین سال قیام رہا۔ شیخ جعفر مہدی آرمز ودلوی، مشہور شاعر اور مرثیہ گو، اسی زمانے میں ان کے شاگرد ہوئے تھے (دہلی سے وہ آگے آگئے، یہاں وقت بہت پریشانی میں گزر رہا کہ معاش کیلئے انھوں نے ہر طرح کے پاپڑ بیچے۔ ایک ماہنامہ "مشورہ" جاری کیا، تنہا ہنگامہ

زراعت بھی کی۔ لیکن ہر جگہ ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ آخر تنگ آ کر انہوں نے
دکن کی راہ لی، اور حیدر آباد میں سخت سفر کھولی دیا۔ پارے، انگلیا یاود تھا، نظام
سالج یحسان علی خان مرحوم کے چھوٹے بیٹے شاہزادہ معظم جاہ شجاع کے دربار سے
دالستہ ہو گئے، اور منجملہ اور اصحاب کے وہاں سے بھی مٹوہہ کرنے لگے۔ اس کے بعد
ہر روز گردی ختم ہو گئی۔ حیدر آباد میں ۳۰ برس قیام ملا۔ ۱۹۷۱ء میں اپنے چھوٹے
سہالی سیلان میرزا، کو کب آندی سے ملنے کو اچھی چلے گئے۔ جب وہاں کا عزم کیا
تو عزیز جاتا رہا اور عقیدت مند ا جا بنے اصرار کیا کہ اب یہیں قیام کیجیے، حیدر آباد
جا کے کیا کیجیے گا۔ دراصل وہاں کی مٹی نصیب میں بھی تھی۔ وہیں اتوار ۲۲ دسمبر ۱۹۷۵ء
یہ اذی الجہد ۱۳۹۵ھ) بوتھ ساڑھے نو بجے صبح انتقال ہوا۔ اس دن قبرستان سخی حسن دربار
(نار تھو ناظم آباد) ہی دفن ہوئے۔

بخم آندی نے بہت بڑا ذخیرہ اپنی یادگار چھوڑا ہے؛ ۲۵-۲۶ مطبوعہ کتابیں موجود
ہیں، اور جو غیر مطبوعہ رہ گیا، وہ بھی کچھ کم نہیں ہو گا؛ انہیں میں غزلیات کا دیوان
بھی ہے۔ ان کے دوسرے "معارف فکر اور فن" میں "بڑے معرکے کے پس" ان میں
انہوں نے بیک کے پہلو سے زیادہ فلسفہ و شہادت اور حضرت امام حسین اور ان کے رفقاء
عالمیتام کے کردار کی عظمت اور ان کے پیغام پر زور دیا ہے۔ ان کے سلام بھی بہت
بلند پایہ ہیں۔ یہی حال دیباچات (تہذیب و تمدن) کا ہے، جن میں ان کے حکیمانہ اور
مسکراتہ اور فلسفیانہ انداز کا بہترین امتزاج ملتا ہے۔ یہ ذیل میں چند شعرا کی غزلیوں
کے ملاحظہ ہوں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ بخم کا اصل میدان مرثیہ، رباعی اور سلام ہے۔ غزل
نے ہندی میں بھی کہا ہے غزل میں شاید انہیں مؤرخ ادب کوئی مقام نہ دے سکے۔

ہر اک زمان پر چرچاہے سرفروشوں کا	اجل کے سلیب میں کیا زندگی بکھر آئی
غلاب ہو ٹھگی راہ تو اب اسے تو بہا	ہزار بار طبیعت گنناہ پر آئی
کسے اب اعتبار گردش ایام آتا ہے	خفا سے بعد دیکھیں کس کے سبک جام ہے
گزدل ہے حیات، اک جادہ مرگ مسلسل ہے	بڑی مشکل سے ادب دنیائیں نام آتا ہے

بدلتی ہے دنیا، مختلف مفہوم دہنتی میں
جب آتا ہے اُدھ سے، ایک ہی پیغام آتا ہے
 یہ موت ہوگئی، اے دوست! زندگی نہ رہی
 جو دل میں کوئی تھا بری بھلی نہ رہی
 حقیقتوں کی کسی وقت بھی کمی نہ رہی
 تصویر مگر و نظر ہے، جو تشنگی نہ رہی
 پڑا رہا ہے عداوت پہ عمر بسر کردہ

مگر نگاہ محبت کبھی چھپی نہ رہی
 دو گھڑی، عیشِ مصلّا چھوڑ دے
 دستِ باطل، حق کا دامن چھوٹ دے
 یوں نہ جی، اُدنا مشناسِ زندگی!
 موت برجھتی ہے، تو بن جا حتیٰ پرست
 مومن سے پہلے ہی کیوں جی چھوٹ دے
 بنم! کچھ لفظی تکلف حیا ہے
 بات وہ کیا، جو کلیجا توڑ دے

بھری جبار تھی، چھوٹوں میں آشیانا تھا
 میں سوچتا ہوں، حقیقت تھی یا قضا تھا
 ظالم کس کو ہے، دشمن نہیں، وہ دوست ہی
 مجھے کسی نہ کسی ہے فریب کھانا تھا
 مادی دنیا اک درِ بجلوہ جانا ہے
 یہ حم ہے دُور سے، نزدیک سے تنہا نہ ہے
 وقت کا میری طرح، ان کو بھی شکوہ ہے، مگر
 بڑے شکوہ کا زرا اندازِ بیاکانہ ہے
 پرسن احوال پر مجھ شکر کچھ کہتے نہیں
 بوبے پر بھی مزاجِ اہل دل شامل نہ ہے

کہو نگا کچھ نہ قلب دوستاں کی یہ منزل ہے حساب دوستاں کی
 جہن کی آبر و محفوظ رہتی نادیتے جو دوست آشاں کی
 میکدے میں مرے ساتھی تھے، بعد وہ بھی تھے
 جبے مسجد میں ٹھکانا ہے، اکیلا ہوں میں

ہر جا رہ و منزل میں ہے مسجد کے ادا ادا
 بعد کی فضا اور ہے، مقفل کی فضا اور
 اٹھ گلا کر کے میں پھنسا یا ہوں کیا کیا
 جب حتم ہوئی بات کہیں، اس نے کہا: لاؤ

طالب رزاقی، محمد قطب الدین حسن قادری

ان کا خاندان لڑکی کے موم خیز مقام دیرا باد (ضلع باہہ سنگی) اکا رہنے والا تھا جہاں سے ان کے والد جناب الحاج محمد یوسف قادری ہجرت کر کے حیدر آباد (وکن) چلے گئے تھے۔ محمد یوسف قادری مرحوم، مولانا عبدالمجاہد دیرا بادی (ف، جنوری ۱۹۷۷ء) کی سگی بھوئی (بھوسن) کے بیٹے تھے، ان کے والد کا نام فضل بہ تھا۔ اس طرح گویا رشتے میں طالب رزاقی مرحوم مولانا عبدالمجاہد دیرا بادی کے بھتیجے تھے۔

الحاج محمد یوسف قادری صوبائی منشی بزرگ تھے۔ اردو، فارسی کا اچھا وقت تھا۔ حیدر آباد میں انھوں نے اولاً حکومت وقت کے محکمہ مالی میں ملازمت اختیار کی۔ بعد کو راجہ شیو راج بھادری جاگیر کے انتظامیہ میں اچھے خاصے دفتر دار و عہدے پر تقرر ہو گیا۔ ان کا اس صدی کے پانچویں دہے میں انتقال ہوا ہے۔ درگاہ حضرت شاہ خاموش (حیدر آباد) کے لحقہ قربان میں مدفون ہیں، خود بھی کچھ پیری مریدی کا سلسلہ تمام کر لیا تھا۔

طالب رزاقی یکم جولائی ۱۹۷۱ء کو حیدر آباد میں پیدا ہوئے۔ انیسویں کیمیل تک تکمیل نہ کر سکے، بسو زبان اسکول کے درجوں میں تھے کہ خدا مظلوم کیوں وہاں سے بھاگ بچلے۔ اس کے بعد جو کچھ بھی حاصل کیا، اپنے نجی مطالعے سے، اور یوں غامی استعداد بیا کر لی تھی۔

شاعری کا شوق اسکول کے زمانے ہی میں پیدا ہوا۔ ان کے نزدیکوں میں حضرت شاہ عبدالرزاق ہوئے ہیں، جن کا سزا بانسہ شریف (صلح بادہ بنگی) میں موجود ہے اسی سے اپنے نام کے ساتھ "آذانی" لاحقہ کا اضافہ کیا۔ ابتدا میں خانی بدایونی (ف: اگست ۱۹۳۱ء) کی شاگردی اختیار کی۔ ان کے انتقال کے بعد پانچ برس تک حضرت میرت بدایونی (ف: فروری ۱۹۷۷ء) سے کلام پر اصلاح لیتے رہے۔ آخر میں استاد نے خاندان تحصیل قرار دے دیا، اس کے بعد خود ان کے طائفہ کا طلقہ خاصا وسیع ہو گیا تھا۔ انوس، مکران کا مجموعہ کلام ان کی زندگی میں شائع نہ ہو سکا۔

طالب کی پوری زندگی پریشانی حالی میں گزری۔ حیدر آباد ہی میں مختلف جگہ ملازمت کا دھول بنا، لیکن کبھی منتقل انتظام نہ ہو سکا۔ چندے عثمانیہ یونیورسٹی کے کتا بنانے میں بھی ملازم رہے۔ طبیعت کے بہت حساس تھے اور حالات سے سمجھوتا کرنا گویا جانتے ہی نہیں تھے۔ ذمہ داریاں بھی بہت تھیں۔ ان کی شادی حیدر آباد کے ایک خاندان بدشاخ میں جناب سید مومن علی کی صاحبزادی (افضل بیگم) سے ہوئی تھی۔ ان کے بطن سے ماشاء اللہ سات بچے ہوئے؛ چار لڑکے اور تین لڑکیاں، انھیں پریشانیوں کے باعث کسی جگہ جم کر کام نہ کر سکے۔ تجارت تک کا تجربہ کیا، لیکن اس میں بھی ناکام رہے۔ ان کے کلام میں طحان اور سوز کا سرچشمہ بھی ان کی مادی بے اطمینان صورت حال میں دیکھا جاسکتا ہے۔

سوجھ بوجھ مرض کینسر سے ہوئے۔ اس کی تشخیص اس وقت ہوئی جب معاملہ ہسپتال سے نکل چکا تھا۔ مقامی کینسر اسپتال میں زیر علاج رہے، لیکن مسودہ۔ ۱۳ دسمبر ۱۹۷۵ء کو دودھ پیر کے وقت اپنے مکان (دبیر پورہ) میں دائمی اجل کو منگ گئے۔ تدفین اگلے دن (۱۷ جنوری ۱۹۷۶ء) محل میں آئی اور انھیں بعد نماز عصر رات ۱۱ بجے فیض کی کمان لیتے کے قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ ۔

کئی اصحاب نے تاریخ و فاضل کہی۔ خود شید جندی کا قطع ہے :
 ہے، کیا نہ گئی بہار غزل سب کی آنکھیں ہیں سو گوار غزل
 لوگ منہ دیکھنے رہے، خود شید! "جل بہا شاعر نگار غزل"
 (۱۹۷۵)

ایک قطعے میں عیسوی اور ہجری تاریخ جناب قادری اہلسنائی نے کہی۔ ہر ایک
 مصرعے سے تاریخ برآمد ہوتی ہے :
 اٹھ گئے دنیا سے طالب فکر بڑل نہ کام
 (۱۹۷۵) اسے فانی ہو چکا، کیفیت حیرت کا جام
 پاک عالم اقطب رذاقی کی ہے تاریخ وصل (۱۳۹۵)
 (۱۹۷۵) جنت الفردوس رحمان اب ہے طالب کستا

۱۳۹۵

ذیل میں کلام کا مختصر انتخاب بطور نمونہ دے رہا ہوں جو ان کی سیر کی سرسبز کو
 سے کیا گیا ہے :
 عاشق ہے منزلِ شکر و شکایت بلند دستِ کام آیا تو کیا، دشمنِ کام آیا تو کیا
 شہرِ ادا، تو فکرِ بے بیچ و خم دی جب چل نہ سکا، تو راستہ مشکل نہیں
 یہ ملکِ صل، یتیمِ حجاب و دلف بدوش کبھی نہیں، کبھی حسنِ سحر کو دے رہے ہیں
 بہارِ آئی ہے گلشن میں جبکہ اے طالب! کبھی قفس کو رکھیں ہل دہر کو دیکھتے ہیں
 نشاطِ گل دہنِ خارِ عم اثر ہی ہیں چین میں کوئی تو اپنا مزاج ہاں ہوتا
 آلِ گل تر سے واقف اگر ہو کل سے بہتم کیا جائے نا
 نہیں عشقِ معصوم، ہر اک کہیں کا ہر آدمی سے کیا جائے نا
 دل ہے، ہر اک کو دیا جائے نا جسے دے دیا، پھر یا جانے نا
 بغیرِ اذنِ ساقی، پیا جائے نا غمِ بیگفت کیا جائے نا
 وہ یکش ہوں، نیتِ بہودر بہودر پیا پیا جائے نا

مہلت میں ہے فرضِ مہر کے جینا وہ مر جائے، جس سے جیا جائے نا
جو ہوتا ہے وہ خود بخود ہو رہا ہے جیسے جاوے ہیں، جیا جائے نا
وہ دل اک نظر کے صحن دے دیا ہے جو دو جگ کے بدلے دیا جائے نا
یہ کہتی ہے طالبِ ہرے دل کی طرف

ترا نام مجھ سے لیا جائے نا

دل طالبِ غم ہو کہ نظر طالبِ جلوہ مفہوم طلب، عشق میں در یونہ گری ہے
ناراض جہاں، بہت نفا، آپ بھی ناخوش سائنوں کا قتل، کوئی جینا تو نہیں ہے
ترا غم جان کے، ہر غم کو دیا دل کا ہو میں بہت ہوں، مجھے دادِ وفا دی جائے
دو چھو، جلوہ باطل میں ہے کتنی کشش، طالبِ حقیقت اتنی مبہم ہے کہ پہچانی نہیں جاتی
وہ ایک یاں کر جس سے ڈرا ہے ہو مجھے وہ ایک یاں بھی داس آگئی، تو کیا ہوگا!
زہرِ دردِ غم سے ہم کب کے مر گئے ہوتے وہ تو آمدِ رکھ لں اقبالِ فردا نے
یکدہ ہے یہ طالبِ اہل کے گفتگو کیسے اجنبی نہیں کوئی، سب ہیں جانے پہچانے
کیسی بہار، کیسی خزاں، کیا غم و نشاط ان سے قریب، زندگی متعاد کا
میں اختیار پاکے بھی، بے اختیار ہو کتنا حینِ جبر ہے پروردگار کا
تم بے نیازِ درد ہو، دل آشنائے درد تم اختیار کے ہو، مددِ اختیار کا
جذبہ چارہ گری ہے، د مروت و خلوص پرش حالِ دلِ زاد سے ہوتا کیا ہے!

جو دردِ وفا سے ملتی ہو، احساس کی دولت جس میں ہو

اس دل کو کسے کیا دل کوئی، وہ آدمی اتنا کیا ہوگا!

دل میں تپش، جگر میں خلش، آنکھ میں سرکش یہ تھیں ملی ہیں مجھے، زندگی کے ساتھ
جب اس جہاں میں بچ و خوشی کو نہیں قیام یہ زندگی گزرا دے، زندہ دل کتنا

اشاریہ

۱۔ اشخاص

دکس ہند سے کیچے خایہ ظاہر کرتا ہے کہ اس صفحہ پر وہ نام ایک سے زیادہ مرتبہ آیا ہے

ابو سلطان حسن	۲۰۹	احمد شجاع (حکیم)	۱۲۹
ابراہیم علی صدیقی	۶۹	احمد شمس، خواجہ	۷۴
ابوجعفر، شیدرنا جاپنڈر اول	۳۵۰	احمد علی (پروفیسر)	۲۲۰
۳۵۱		احمد علی شاہ عباسی	۶۵ (۶۴)
ابوالکلام آزاد، دیکھئے آزاد، مولانا		اختر حسین (حکیم)	۲۷۹، ۲۷۹
اکثر، صدیقی احمد	۹۵۹۲	اختر شیرانی	۲۷۹، ۲۷۹
اکثر لکھنوی، جعفر علی خان	۲۹۳	اختر مسعود (ڈاکٹر)	۳۳۲
اکثر رامپوری جعفر علی خان (پرس)	۲۶۶	ارشد بانو	۳۳۲
اکثر، محمد حسن (قاضی)	۲۰۹، ۲۰۹	اسحاق بیگ، میرزا	۳۳۲
اختتام حسین (پروفیسر)	۲۲۵، ۲۲۵	اسرار البصری	۲۹۲
احسان دانش	۲۹۲	اسلم دہرچاند	۲۷۱
احمد (آتا)	۱۷۶	اکبر، احمد الدین (اے، ڈی)	۵۳، ۵۳
احمد (ڈبلیو ڈی)	۷۴، ۷۴	۵۵، ۵۵	
احمد، احمد علی	۲۳۶	اکبر علی	۱۴۹
احمد جلیس	۲۱۰	اکبر مسعود	۳۳۲
احمد شاہ بخاری: دیکھئے پرس، احمد شاہ		اکبر لا حسین، شید	۲۱۹، ۲۱۹

۲۰۹	ابجد بیگ ، میرزا :	۲۰۹	ابجد حسین فرشودی :
۲۷۱	ابجد ، مجید ، مجید :	۲۷۱	اعظم (پیر جاد) :
۲۳۶	ابجد نخی ، محمد ، مجید :	۲۳۶	اعظم ، اعظم حسین :
۱۸۲	ابجد شکر (شیرخواب) :	۱۸۲	اعظم جاد (پیش) :
۲۹۲	ابجد کش :	۲۹۲	اقهار الدین ، میان :
۲۳۰	ابجد خان :	۲۳۰	افسر جاد الله :
۲۰۹	ابجد خیالی :	۲۲۷	افسر صدیقی ، اردو جوی :
۶۴	ابجد الرشید :	۲۲۲	افضل بیگ ، مرزا :
۲۸۱	ابجدین ، مشر :	۲۲۲	افضل حسین ثابت ، دیکھیے : ثابت ، کھنوی
۱۹۱	افکار ، خورشید :	۲۱۰	افضل محمد :
۱۹۲	افروز ، یار محمد ، نصاری :	۱۷۹	اقبال : ۱۰۰۰ ، ۳۰۳ ، ۱۸۲ ، ۱۷۹
۱۲۹	افروز کی الی پاشا :	۱۸۳	۱۸۱
۳۳۲	افروز محمد :	۳۰۳	اکبر الی آبادی :
۳۳	افروز امام :	۲۵	اکبر بادشاہ :
۳۳۲	افروز بانو :	۱۸۲	اکبر جیدری (سر) :
۱۲۹	افروز جہان :	۲۷۱	اکرم (پیر جاد) :
۷۱	افروز دانا تھ :	۱۳۰	اکمل ، دام پرتاب :
۲۰۷	افروز نگ زیب :	۱۰۵	الطاف حسین :
۱۹۶	افروز سین :	۱۶۹	امام احمد ، شاہ :
۱۹۷	افروز گلوی ، مشر :	۶۹	امان الله ، علی :
۱۰۴	افروز حسین :	۳۳۰	امانت کھنوی :
۲۰۱	افروز کا دستک :	۲۳۰	امتیاز بی بی :
۱۰۰	افروز احمد :	۱۰۰	امتیاز علی ، تاج ، دیکھیے : تاج ، امتیاز علی

۱۵۸ :	بخش علی	۲۹	ایشی چند :
۲۶۱ :	بدالدین	۱	
۲۳۹ :	بدالناسیگم	۲۱۸ :	آتش کھنوی :
۴۸ :	بدی پرشاد سکوے	۷۹ :	آدربری ، پردنیر :
۲۵ :	برج ، اتی :	۴۲، ۴۳ :	آرزو کھنوی ، آذر حسین :
۵۰ :	برج موہن لال :	۳۲۷ ، ۳۲۷	
۳۳۲ :	برجیس بانو :	آزاد ، ابوالکلام ، مولانا :	۲۰، ۱۹۸
۶۹ :	برجیس خاتمہ :	۲۹۰ ، ۲۹۱ ، ۲۹۲	
۲۹۸ :	سقا دہلوی ، باراج بہادر :	۲۲۸ :	آزاد ، چراغ علی شاہ :
۲۹۹		۳۰۲ :	آزاد سبحانی :
۹۵ :	برکت علی خان زکیم جاہ :	۲۵۹ ، ۳۲۹ - ۳۲۷ :	آزاد ، محمد حسین :
۴۸ :	بزداران :	۸۷ :	آزاد ، محمد صدر الدین :
۲۷۸ :	برین ، مشر :	۲۶۵ :	آغا جون :
۳۲۹ :	بزم آندری ، عاشق حسین :	۳۱ :	آغا حشر کاشمیری :
۳۵۰ ، ۳۵۱		۲۹۸ :	آغا شاعر قزلباش :
بیل الا آبادی ، سکھ دیو پرشاد سنہا :		۶۷ :	آتاب احمد خان (صاحبزادہ) :
۳۲۹		۲۹۲ :	آتاب منے آغا کھنوی :
خاوت علی بابہ دہلوی ، دیکھے باب		۲۵ :	آنند بہاری لال گپتا :
دہلوی		آنند زاین طاہر ، دیکھے طاہر آنند زاین	
۲۹۹ :	بشن مرادی لال :	۲۸۲ :	آیزے ، اورین :
۲۲۷ :	بشیر احمد ، بیان :	ب	
۳۱۰ ، ۳۰۹ :	بشیر پرشاد سنہا :	۱۶ ، ۱۵ :	باقر عظیم آبادی :
۸۴ :	بھیس :	۲۳۶ :	باقر اختر (سلمان) :

- بلخ لکنوی، بخت علی : ۳۳۹
 بہار، شید جبر حیلین : ۲۹۵، ۲۹۳
 بیزاد لکنوی، سردار عرفان : ۱۴۴
 بخود مولی، محمد احمد : ۳۳۰
 بخود دلوئی، حید الدین : ۳۵۰
 بیدم شاہ وادش : ۱۰۵
 بلی، شامس گرام : ۷۸، ۷۷، ۷۶
 بھگت رام، پنڈت : ۲۰
 بھگوان سردپ : ۴۷
 بھوان سنگھ (ہارانا) : ۳۷، ۳۸
 بھیم سین : ۱۴۱

پ

- پال زلر : ۷۴
 پراگ داس : ۴۵
 پرلودھ چندر : ۲۹
 پریشان، عبدالحید : ۱۵۰
 پطرس خاوری، احمد شاہ : ۱۸۳، ۷۲
 ۲۸۱، ۲۷۹
 پکراج (عرف کھو) : ۱۰۴
 پنڈی داس : ۲۹۰

ت

- تاشیر، محمد دین (ڈاکٹر) : ۱۷۸، ۱۷۹
 ۲۷۴، ۲۸۳
 تاج انبیاز علی : ۱۷۵، ۷۸
 تاجور نجیب آبادی، احسن اللہ خان :
 ۲۷۸، ۱۷۳
 تاجعلی جلالپوری، قہر حسین : ۱۷۳
 ترکی، غلام محمد : ۳۳۸
 تسکین : ۲۹۶
 تینیم، محمد حبیب اللہ : ۳۱
 تلون : ۲۸۰
 تلکین : ۲۷۱
 تلکین سرسخت، محمد قادی الدین : ۲۲۷
 تنہا عادی : ۱۶، ۱۵
 تیجا سنگھ : ۱۹۳
 تیمود، امیر : ۶۴

ٹ

- ٹامس گرام پیل، دیکھیے بلی، ٹامس گرام
 ٹینگور، راجندر ناتھ : ۱۸۰، ۹۰
 ٹینی سن : ۲۷۷
 ٹھاکر پونچھی، جگن ناتھ : ۱۴۲، ۱۴۱

ث

- ثابیت لکنوی، افضل حسین : ۲۸۱، ۲۷۶
 ثاقب، احسن اللہ خان : ۲۱۴، ۲۱۶
 ۲۱۵
 ثاقب، شید حسن رضا : ۱۷

ج

چاندرا نی : ۵۰
چٹائی، عبدالرحمن : دیکھئے مبارک
چٹائی

چکبستا : ۲۴

چب لال : ۲۵

ج

حالی : (۵، ۶۵، ۶۷، ۸۲)

حامد (اُستاد) : ۱۷۶

حامد (آبادی) حامد حسین : ۲۶۹

حامد، حامد علی : ۱۳۹

حامد حسین : ۳۰۶

حامد علی خان : ۱۳۳

حبیب (سپر حاکم) : ۱۲۷

حبیب حسن : ۱۲۸

حبیب الرحمان خان شردانی : ۶۷

حامد الدین : ۲۱۳

حامد الدین قاضی : ۱۸۸/۱۷۷

حامد الدین حیدر : ۲۳۳

حسرت، چراغ حسن حیدر : ۱۰، ۱۳۶

حسن جان بیگم : ۳۳۲

حسن نظامی (خواجہ) : ۱۹۵، ۲۰۱

۳۵۰

فرچہ پوری، عبدالحفیظ صدیقی : ۱۵۸

ثرفاطہ (خوشیہ) : ۱۷۰

ج

جانب دلوس، بشارت علی : ۱۹۱، ۱۹۲

۳۴

جادو یا قبال : ۱۶۰

جفر حسن بہار : دیکھئے بہار، جبر حسن

مگر مراد آبادی : ۸۸

گلنا تھوڑا شاد شہوے : ۴۸

جیل مانچوری : ۹۳، ۹۵

جیلانی، علی احمد : ۹۶

جہاں، فیصل احمد : ۱۳۶، ۱۳۸، ۱۳۷

جمیعت راسے : ۲۶۱

جیل میان (سپر حید احمد خان) : ۸۲

جیل مظہری : ۳۳

جیل حسین : ۲۰۴

جمید حامد، انسائیگم : ۳۳۹

جوان، اسمی لال : ۲۴

جوش لمبیانی : ۶۰، ۶۱

جوش فتح آبادی : ۲۳۶

جیلانی ماتو : ۲۱۰

جیلانی میگم : ۳۳۷

جیس، مشر :

رئیس امرودہوی : ۳۹۱

ریاض، ریاض احمد : ۲۸

ریاض الفارسی، ریاض الدین : ۱۱۷

ریڈنگ، لارڈ : ۱۹۷

ریحان (ریت حکان) : ۱۳۷

ز

زبرکھوی، نفعی آغا : ۳۹۳

ذکر حسین : ۳۳۶

ذیب النساء (بگم بختی) : ۳۳

زین العابدین احمد (زین العابدین) : ۲۲۰

زینت (زینت بختی) : ۳۲۲

س

سارول : ۶۰

سارولوی، امرا تھمدان : ۳۵۰

سارونظائی : ۴۲

سارونکووری، بلونت کمار : ۶۰

سارونکھوی، محمد حسن : ۳۶۶

سارونگ، طام درای صاحب : ۲۹۷

سارونصدیقی، محمد اختر : ۱۲۹، ۱۲۸

۱۳۲، ۱۳۱

سارونکھوی، سراج الدین احمد خان : ۲۰

۳۵۰، ۷۶

سارونکھوی، فاطمہ (سید) : ۲۶۶، ۲۶۵

عام سروب (وام دریا) : ۴۷

دکھن سنگھ (جہاد جا) : ۱۹۷، ۱۹۶

دکھن بخش : ۱۷۶

دکھن، عربی الدین : ۱۱۸، ۱۱۷

دکھن، دودھوی، جعفر مہدی : ۳۵۱

دکھن، محمد علی : ۲۳۶

دکھن، پیارے صاحب : ۳۰۳

دکھن احمد صدیقی : ۲۹۲، ۱۲۵

دکھن، امام : ۲۲۵

دکھن، دودی، رضا علی خان : ۲۰

دکھن، حب لال : ۴۷

دکھن، احمد دوائی : ۲۳۶

دکھن، الدین، قاضی : ۱۱۷

دکھن، نکھوی، رفیق حسین : ۳۳۳

دکھن، الدین عباسی : ۶۲

دکھن، میر نند : ۲۱

دکھن، نندن سرن : ۱۲۲، ۱۲۳

دکھن، سنگھ (جہاد جا) : ۱۷۶

دکھن، لال : ۵۰

دکھن، سعادت، یار خان : ۳۲۷

دکھن، نکووری، روشن گل : ۶۰

دکھن، پانی پتی، شگن چندر : ۲۹۶

دکھن، صدیقی : ۲۷۷

شید علی : ۲۲۵	سبط رسول، قادوقی : ۶۹
شید معویہ حسن رضوی : ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵	شہزادہ لکیر، شید : ۲۲۰
شید سلمان ندوی : ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹	سحر، عبد المجید : ۲۸
شیدہ بیگم : ۳۳۳	سحر، محمد حسین قاضی : ۲۹
سید رحیم، دہم : ۲۸۲	سردار سنگھ گویشر : ۱۹۶
سیاہ اکبر آبادی، عاشق حسین : ۲۸۱	سرلادیوی : ۷۱
۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹	سرحدی دیوی : ۱۹۷
ش	سردار، جب علی بیگ : ۳۲۹
شاد عظیم آبادی، علی محمد : ۱۵	سری رام (لالہ) : ۲۹۳
شانی (ہنست باصر) : ۲۱۸	سعید احمد خان : ۸۲
شاہد احمد دیوی : ۷۳	سید کامثوی : ۱۶۳
شاہدہ (ہنست نجم) : ۳۳	سید حسین : ۳۰۶
شاہین (ہنست راشد) : ۲۸۰	سید رضا گہر، دیکھے گہر، سید رضا
شانی، نرین سہاسے : ۷۴	سیدہ (ہنست نجم) : ۳۴
شہیلی : ۶۷، ۶۸	سکندر لدھی : ۶۲
شجاع الدور : ۲۹۳	سکندر حیات خان (نمر) : ۴۹
شجیع، معظم جاہ (پرنس) : ۲۵۲، ۲۵۳	سلطان محی الدین : ۲۲۷
شرر، عبد الحکیم : ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹	سلیم پانی پتی، وحید الدین : ۲۰۲
شرر، اندین شاہ : ۱۹۶	سنگان خان : ۲۷۸
شہباز (پیر خان) : ۱۲۷	سنگیت (ہنست طالب) : ۲۹۹
شفق عابدی، شہزاد حسین : ۳۹	سورج پرشاد شہوے : ۴۸
شفقت کاشی، فضل محمد : ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷	شید حسین نون : ۲۲۸، ۲۲۹
شفقت الد : ۸۳	شید عابد حسین : ۱۲۵، ۱۲۶

- شفیق الرحمان قدوائی : ۱۲۳
شکلا (جنبہ قاصر) : ۳۱۸
شکب (پیر حاکم) : ۱۲۷
شکیلہ بیگم : ۶۹
شکیلہ خاتون : ۲۰۹
شمس مینری شمس الدین احمد : ۱۳۱
شمس الدین : ۲۱۳ ، ۲۱۴
شمس الدین (میر شمس) : ۶۳
شمس الرحمن فاروقی : ۲۳۳
شمس الدین : ۲۴۱
شمس الدین حیدر : ۲۳۰ ، ۲۳۱
شمس الدین (نقی) : ۲۱۲
شہاب الدین (چودھری سر) : ۲۲۹
شہباز بیگ پیرزا : ۲۲۳ ، ۲۲۵
شہزاد (پیرداش) : ۲۸۰ ، ۲۸۱
شودش کاشمیری ، عبدالکریم : ۲۸۷
شوق قدوائی ، احمد علی : ۲۹۰ ، ۲۸۸
شوق ، عبدالعزیز : ۳۰۵
شوکت میر تقی ، احمد حسن : ۳۰۸
شوکت تھانوی ، محمد عمر : ۳۱۱
شوکت حسین رضوی : ۷۳
شیخ امیر : ۱۲۲
شہید اناموی : ۱۰۳
شہید ، رام چھپال سنگھ : ۱۹۱
شیر سنگھ فیروز پوری : ۱۹۰
شیر شاہ سودی : ۳۱
شیر محمد اختر : ۱۷۷ ، ۱۷۸ ، ۱۷۹
شیل ، والٹر (متر) : ۱۸۱
شیلا انجیلیسن : ۲۸۰ ، ۲۸۱
شیورانج بہادر (راجا) : ۲۵۵
شیو شنکر لال : ۲۱۰
ص
صابر حسین : ۲۵۱
صادق انوی ، حاجی محمد : ۲۲۷
صہب خان شہید انصاری : ۳۳۳
صدر الدین چغتہ : ۱۷۷
صدیق حسن خان (نواب) : ۲۰۳
صدیق علی شاہ : ۳۳۹
صغیر انسا : ۶۵
صفدر علی : ۱۳۹
صفی بھنوی ، علی نقی : ۲۹۳ ، ۲۵۰
صفی اللہ : ۱۲۲
صفیہ (بنت حسان) : ۱۲۷

ض

عبدباری (عبادی) ندوی: ۷۸

عبدالحلیم : ۱۵۹

عبدالحق (دشمن): ۱۶۶

عبدالحق (مولوی): ۲۰۴، ۲۰۵

عبدالحکیم : ۱۵۸

عبدالحق نہال، دیکھئے نہال سیوہاری

عبدالحمن (سر): ۱۸۳

عبدالحمن چٹائی: ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹

۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۳، ۱۸۴، ۲۷۷

عبدالحق نگرانی: ۱۷۷

عبدالحق چٹائی: ۱۷۷، ۱۸۱

عبدالحق (شاہ): ۲۵۶

عبدالحق خان: ۲۶۱

عبدالحق قادری: ۳۲۷

عبدالحق (منشی): ۳۷۱

عبدالحق: ۱۵۸

عبدالحق: ۲۷۷

عبدالحق غوجا: ۱۲۳

عبدالحق، دیابادی: ۳۵۵

عبدالحق: ۶۷

عبدالحق چٹائی: ۱۷۷، ۱۷۹

عبدالحق عمادی: ۲۱۶

عبدالحق سندھی: ۱۷۶

ضامن، ضامن علی (پرنسپل): ۲۰۴

ضمیر (رشتہ گو): ۳۳۹

ضمیر الدین نیری: ۲۱۳، ۲۱۴

ضیاء الدین: ۴۶

ضیاء، عظمت علی

ط

طالب دہلوی، شیش چندر: ۲۹۷

۲۹۸، ۲۹۹

طالب رزاقی، محمد قطب الدین حسن

۳۵۵

ظ

ظالم سنگھ (رانا): ۲۷

ظفر علی خان: ۷۶، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰

۲۹۱، ۲۹۲

ظفر ہدی: ۳۶۶

ع

عابد اختر (عماد): ۲۳۶

عابد، عابد علی: ۲۷۷

عابد، کھنوی، علی عمر: ۳۰۴

عابد الرحمن چٹائی: ۱۸۶

عابد، رنگ زیب: ۲۷۷

عباس (علی): ۶۴

غ

عشقان محل خان (قلام، ۹۳، ۹۵،

۲۵۲، ۱۸۲

غالب : ۸۳، ۲۲۸

غضنفر علی : ۱۴۹

غضنفر علی بخش : ۲۳۳

غلام احمد علی : ۲۲۷

غلام جیلانی (حکیم) : ۳۱۷

غلام جیدر خان : ۷۶

غلام ساحر علوی : ۳۸

غلام کبریا : ۱۶۲

غلام محمد صدیقی : ۶۵، ۶۶

غلامی، غلام رسول : ۲۷۶

غوث محمد : ۱۴۳

غوثیہ (نور فاطمہ) : ۱۷۰

غیاث الدین بٹن : ۶۲

ف

فانی : ۸۸

فائزہ دہلوی : ۲۲۸

فدا بخاری : ۲۲۸

فردوس جہاں : ۱۴۹

فرزادہ (شہناج خان) : ۱۳۷

فرید احمد عباسی : ۶۵

فرید الدین (مستر) : ۸۷

عرشی، محمد حسین : ۳۱۳، ۳۱۸

عزیز جمال آبادی، محمد عزیز الرحمن :

۲۷-۲۸

عزیز قدوسی : ۱۶۳، ۲۳۳

عزیز کھنوی، مرادوی : ۲۵۱، ۲۹۳

عشرت النساء بیگم : ۱۷۰

عطارد شاہ بخاری (سید) : ۲۹۱

عطفت علی (قاضی) : ۲۰۷

عظیم حسین (میاں) : ۴۹

علی بیاد (منشی) : ۳۷

علی حسن، عظیم آبادی : ۱۵

علی حسین (حافظ) خود : دیکھیے فوراً

علی حسین

علی محمد : ۱۱۰

علی محمد : ۱۱۲

علی محمد عباسی : ۱۵

علی نقی، نام : ۲۰۵

علی نقی مجتہد : دیکھیے نقی صاحب

عمر الدین نقاش : ۱۷۷

عمر خٹام : ۱۸۳

عنایت اللہ خاں شرقی : دیکھیے شرقی علامہ نصاح حسن کھنوی : ۲۹۳، ۳۱۴

سک

- کاظم جنگ : ۳۳۸
 کابل ، کافور حسین : ۲۶۶
 کرباناد : ۱۸۸ ، ۱۸۷
 کوشن چندر : ۱۷۱ ، ۱۷۲ ، ۱۷۳
 کریم بخش : ۷۲
 کریم خان : ۲۲۰
 کسری مناس : ۱۱۲
 کشتن پر خاد در باراجا : ۲۰۸
 کشتوربا و چغتائی : ۱۸۷
 کنخیالال : ۲۵
 کویرین ، ایکز ندر : ۲۷۹
 کوب آفندی : ۳۵۲
- سگ
- گاندھی (ربا تا) : ۶۰
 گور ، مشر : ۲۱۲
 گلاب راسی : ۲۳
 گلاب سنگ (ربا تا جا) : ۲۸۷
 گنگ گلام (سر) : ۱۷۳
 گوران دتال : ۳۱۲ ، ۳۱۳
 گوردکی : ۷۵
 گوری شکر : ۲۷۱ ، ۲۷۲

نصیح کهنوی ، جعفر علی : ۳۳۹

نضل الہی ہشتی : ۲۷۱ ، ۲۷۵

۲۷۷

نضل حسین (سر) : ۲۹

نوز ، علی حسین : ۳۰۳ ، ۳۰۴

نہیم احمد فی : ۲۸

نیاض گواری ، نیاض احمد خاں :

۱۱۹ ، ۳۳

فیروز دین (مولوی) : ۲۶۲

فیروز طرانی ، فیروز الدین احمد :

۳۱۵ ، ۳۱۶ ، ۳۱۷

فیض ، فیض احمد : ۱۳۷

ق

قادری بیگم : ۳۳۷

قادری ملانی : ۳۵۷

قاصر ، برہم ناتھ دت : ۲۱۲ ، ۲۱۳

۳۱۹

قنیک دانا پوری : ۱۷

قطب الدین

قیس کوٹوی ، نور محمد : ۲۷۷ ، ۲۷۸

قصر جان : ۱۲۹

قیصر ہشت (صلاح الدین) : ۳۲۹

گوند سردوب، دیکھے افور، منوہر سیکھے
گہر عظیم آبادی، سید رضا

ن

لاڈل بیگم : ۳۳۷

قلم صاحب : ۱۵

لکے، منکر : ۱۸۰، ۱۸۱

فلت سنگھ : ۲۱۳

لعل محمد : ۱۶۳

م

الویہ، دن موہن (چٹکت) : ۲۰

مائی ناگپوری، بشیر خان : ۲۳۰

ماہر کھنوی، باسط حسن : ۲۶۶

بتلا، مردان علی خان : ۳۳۰

مبشرہ : ۸۴

مقررہ اس (ڈاکٹر) : ۱۸۹

مجید لاہوری : ۱۳۷، ۱۳۸

مجید ملک : ۱۸۴

مجتبیٰ حسین، ماشرا : ۱۲۹۵

محبوب الرحمن : ۳۹

محبوب عالم (منش) : ۲۹

محبوب علی خان (نظام) : ۶۲

محبوب : ۳۵۵

حسن کاکودی : ۳۸

حسن احمد حسن : ۲۰۹

عشر کھنوی : ۳۵۱

عشر مرزا پوری، فرزند علی : ۱۲۸

عقوڑا الرحمن : ۳۹

محمد اجل خان (دیگم) : ۱۳۴

محمد احسن عباسی : ۶۶

محمد احمد : ۳۰

محمد اختر (سید) : ۲۳۳، ۲۳۶

محمد ادیس : ۱۶۳، ۱۶۴

محمد اسحاق : ۱۶۳، ۱۶۸

محمد اشرن خان : ۲۶۱

محمد اصغر علی جعفری : ۳۳۲

محمد اکبر خان : ۷۶

محمد آریب خان (فلڈ مارشل) : ۱۳۶

۱۸۳

محمد بخش چغتائی : ۱۸۵

محمد حلیم، قاضی : ۲۰۷

محمد حسن، اثر قاضی، دیکھے اش محمد حسن

محمد حسین (قاضی) سکر دیکھے سکر محمد حسین

محمد حسین ششکا، دیکھے ششکا محمد حسین

محمد حسین خان : ۱۲۳، ۱۲۴

محمد حمید اللہ خان (نواب) : ۱۶۸

محمد داؤد عباسی : ۶۶، ۶۷، ۶۸

- محمد رفیع : ۳۳
 محمد زکریا کاندھلوی : ۴۹
 محمد سرور (جامی) : ۱۷۵، ۱۷۴
 محمد شاه : ۴۵
 محمد شفیع : ۳۳
 محمد شیخ قوی (سید) : ۲۱۸
 محمد صادق علی : ۳۰۳
 محمد عصمت اللہ : ۱۸۳، ۱۸۵، ۱۸۶
 ۸۹
 محمد عالم (حافظ) : ۲۷۷
 محمد علی جوہر (مولانا) : ۶۸، ۶۹
 محمد مبین چریاکوٹی : ۲۲۸
 محمد مجیب : ۱۲۵
 محمد محمود شریف : ۳۱
 محمد مخدوم : ۴۲
 محمد نبی خان : ۱۳۳
 محمد ادریش حسن : ۲۶۶
 محمد وحید کلانی : ۲۷۷
 محمد وسیع : ۴۴
 محمد بشم فرنگی علی : ۳۳۳
 محمد یعقوب (سج) : ۲۳
 محمد یوسف (سید) : ۶۱
 محمد یوسف : ۱۷۵، ۱۷۴، ۱۷۳
 محمد یوسف (دیوان) : ۱۷۲
 محمد یوسف قادری : ۳۵۵
 محمد یوسف مخدوم ذوال : ۶۴
 محمد یوسف (نوی) : ۱۲۵
 محمد احمد عباسی : ۶۳، ۶۵، ۶۶
 ۶۷، ۶۸، ۶۹
 محمود احمد خان : ۷۸، ۷۹
 محمد بیگ امیرزا : ۳۴۵، ۳۴۴
 محمد حسین : ۳۰۶
 محمد حسین بیگ امیرزا : ۳۴۵
 محوی مدنی بکھوئی : محمد حسین :
 ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶
 محمود آباد چند سنگ (مہارانا) : دیکھیے
 راجندر سنگ (مہارانا)
 مدد موہن (الوی) : دیکھیے
 مدد موہن
 تغنی حسین (سید) : ۳۲۳
 مرزا جواد بکھوئی : ۳۲۸
 مستقیم اللہ عباسی : ۶۳
 مشرت جینائی : ۱۸۶
 مسعود بیگ امیرزا : ۳۴۵
 مسیح الدین خان : ۳۳۷
 محمد ابراہیم (سید) : ۳۰۴، ۳۰۵
 ۳۳۳

- مشتاق حسین (دکناء الملک) : ۶۶
 مشرق (علاء) عنایت اثر خان : ۲۷۹
 مصطفیٰ احمد شاہ : (۱۷۰)
 مضطر حیدری (دولاد حسین) : ۲۲۳
 ۲۲۲
 مضطر، محمد علی : ۱۴۹
 مطیع اللہ : ۸۲
 منظم (پسر حامد) : ۲۷۱
 معین اللہ کوہ : ۳۳۷ ۳۳۸
 معین الدین (ندوی) : ۱۶۷
 معین الدین احمد شاہ (ندوی) :
 ۱۶۷ ۱۶۸
 مفتون کرٹوی : ۲۸ ۲۹
 ملا آغند نوری (چند شاہ) : ۲۸
 ملا صاحبی نورا آغی : ۱۹۵ ۱۹۶
 ملیح مرزا لکھنوی : ۳۲۹
 ممتاز (احمد خان) : ۸۲
 ممتاز محمد خان دوکانہ : ۴۹
 منصور (احمد خان) : ۸۲
 منظر لکھنوی، منظر حسن : ۲۶۵ ۲۶۶
 منظور الحق نعمانی : ۱۷۱
 منور لکھنوی : ۲۱
 منور یگ پیرزا : ۳۲۴
 سر حسین ضوی : ۲۲۴۰
 مینر شگاہ آبادی، ایمل خان : ۲۱۹
 مینر حسین (مینر لکھوی) : ۳۰۶
 مینر خان : ۲۴۰
 میراں : ۷۵
 موتا سنگھ رامپور : ۱۹۳
 موسیٰ چشتی مانچوڑی : ۶۵
 موسیٰ کاکم (امام) : ۲۲۵
 موسیٰ علی (سید) : ۳۵۲
 مومند : ۸۴
 مؤید حسن : ۲۱۰
 مہجور شمس، سید عبدالقیوم : ۱۱
 مدنی انزبان (سید) : ۲۰۵ ۲۰۶
 مدنی حسن نامری : ۲۲۲
 مہدی سنگھ : ۲۰۹
 مہندو ناتھ : ۷۱ ۷۲ ۷۳
 ۷۴
 میرزا این پرشاد : ۲۵ ۲۶
 ۲۸ ۲۹
 میش داس (راے صاحب) : ۲۹۷
 میش داس (منشی) : ۳۱۱
 میر میر تقی : ۲۰۵ ۲۲۷
 میراجی (دشنام خان) : ۲۷۸

- میران بخش (تھاش) : ۱۷۷۱، ۱۷۸۱، ۱۷۹۱
نصیر خان : ۲۲۰
- میر حسن (رشد) : ۵۴
نظام الدین : ۲۸۷
- میرن دیوی (رشد حسن بدی) : ۳۰۶
نظر سہاوی : ۲۰
- نظر لطیفی : ۳۳۸، ۳۶۳
نظر خان : ۲۲۰
- نقش صاحب (رشد علی نقی بہتہ) : ۲۲۰
- نادر، کلب حسین : ۳۲۹
نقش کھنوی : ۱۶۳
- نادر مجاوی : ۱۲۸
نثار آبادی (نثار حسین) : ۱۰۵، ۱۰۴
- نعمان، ابراہیم ندوی، رشد : ۱۶۰
نجم آندی، میرزا جمال حسین : ۲۲۹
- ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲
نجم الدین : ۲۶۵
- نجمہ دہشت بخشی : ۳۲
نجیب (پیر حسن) : ۱۲۷
- نصاح سنگھ (ڈاکٹر) : ۱۷۹
ندیم جعفری، فیض احمد : ۲۲۷
- نذیر احمد (ڈبئی) : ۸۷
نذرت جہان : ۲۲
- نذیر (پیر راشد) : ۲۸۱
نسرین (رشد حامد) : ۲۷۱
- نسرین (رشد راشد) : ۲۸۰
نسرین خاتون : ۱۵۹
- نشر جان دھری، محمد عبد الحکیم خان : ۲۶۳، ۲۶۲، ۲۶۱
- نکمن، مسٹر : ۸۹، ۹۰
نندکار سنگھ : ۲۱۰
- نئے آغا زرکھنوی : دیکھئے زرکھنوی
نوح نادوی : ۲۷، ۱۱۸، ۳۰۹
- ۳۱۰
نورالحسن ہاشمی : ۹۰
- نور جہان (عکد ترم) : ۲۳۲
نور محمد : ۱۱۰
- نوکشور (نشی) : ۳۰۳
نہال سیدوادی، عسکرائی : ۴۰
- نہرو، جواہر لال (پنڈت) : ۲۲۶
نیاز فتحپوری : ۱۹۶
- نیرنگ کاکردوی، عبد الوحید : ۲۸
نیر مسعود (ڈاکٹر) : ۳۳۲
- دانش حسین : ۲۶۵

۲۵	ہر ناتھ :	۲۴۰	داس علی افضل رسول :
۳۷	ہریش سنگھ (جہار ناتا) :	۱۷۰	جی الہا بیگم :
۲۹۵، ۲۹۴	ہزار گھنٹی، سید حسن :	۱۵۰	حیدر آبادی :
	ہنرک، بکے، دیکھے، بکے، ہنرک	۱۷۰	دودا احمد :
۲۳	ہنر، منصب علی (میر) :	۱۸۵	ذیر النساء بیگم :
	خی	۳۱۸	خواجہ ناتھ دتتا :
۲۸۰	یامین (منجہ راشد) :	۸۳	دقار (احمد خان) :
۱۳۱	یزدانی جالندھری :	۲۱۸	دیران دیوی :
۲۲۵، ۲۲۴	یعقوب بیگ میرزا :	۵	
۱۷۸	یوسف حسن (حکیم) :	۳۲۹	پادی علی میرزا :
۳۲۹	یوسف ہرست (مخوشرف الدین) :	۶۳	پادون الرشید :
۳۰	یوسف، محمد یوسف :	۲۲۲	پاشی، القات رسول :
	یگ راج نظر سوم لوی : دیکھے نظر	۲۳۶	پاشی بانو :
	سوم لوی، یگ راج	۳۳۷	ہمایوت علی الدین :

مطبوعات (کتب در سائل)

الف مقصودہ		اسلاف میرٹس	
۱۳۳	ابین دہان نہیں رہتا :	اسلام اور عربی تمدن	۱۲۸
۲۰۹	ایمانی	اشعارِ نظر	۲۱۵
۹۹	احمد (روزنامہ)	انکارِ بیل	۲۰۹
۱۳۲	ادبِ تنہائیاں	اقبال کی شاعری	۱۶۸
۲۳۱	ادب اور ادیب	اکالی (مفتہ دار)	۱۹۵
۲۳۱	ادبی ڈرامے	ابلاغ (مفتہ دار)	۱۹۸
۱۶۸	ادبی نقوش	ابلیس روا	۱۳۶
۲۳۱	ادب و ادب آزادی کے بعد :	الہیاد الہیاد	۲۹۲
۲۰۵	ادب و ادب کی تاریخ	الخیل (ماہنامہ)	۸۸
۳۲	اردو ڈراما اور اسٹیج	الزام کس پر ہے	۱۳۶
۲۲	اردو شاعری کا سماجی پس منظر	انفکاح کی خوشبو	۲۷۱
۲۰۹	اردو شیعہ کا ارتقا	القرآنۃ الرشیدہ	۱۲۷
۲۰۲	اردو مریخ کی روایت	الہامِ متکون	۲۶۲
۷۵	اورالوں کی کتب	الہام (مفتہ دار)	۱۹۸
۱۶۲	اورنگزادہ جدید	الناظر (ماہنامہ)	۳۰، ۳۹، ۵۵
۸۲	اورنگزادہ حالی	الانتم کی اندر کھجی	۲۰۶
۲۰۴	ازواج الانبیاء	اشواقِ وفا	۳۲۷
۲۹۱	اس بازار میں	امروز (روزنامہ)	۱۳۷، ۱۳۶

۲۹۰ : ۱	آباد (روزنامہ)	۲۹۸	امیجی رپورٹر :
۱۲۶ : ۱	آستین کسانپ	۹۳	امیر طغات :
۱۷۵ : ۱	آفاق (روزنامہ)	۱۳۷	انجام (روزنامہ)
۲۰۹ : ۱	آئینہ	۳۲۰	اندلسیہا
۲۵ : ۱	آئینہ بخور	۳۰۴	انشائی قربانیاں
۳۳۰ : ۱	آئینہ سخن فنی	۳۲	انصاف کا کوڑا
۲۲۱ : ۱	آئینہ معرفت	۲۹۹	انوارِ نظر
ب		۲۰۵	اندرنامہ
		۲۳۰	انبیاء
۷۵ : ۱	بجن (زمینداناٹھ)	۲۱۹	اہل سیف
۳۲ : ۱	بد نصیب بادشاہ (گل)	۲۲۹	ایض بزم
۷۲ : ۱	بھکت (زمینداناٹھ)	۲۷۱	ایضات کی کہانی
۱۳۰ : ۱	بھٹ کا گھر (حسین خان)	۲۸۲	ایران میں اجسنی
۲۳۶ : ۱	برقہ دباراں (رحیم)	۳۲۱	ایران میں رشہ نگری
۳۱۹ : ۱	برگ دبار (قاصر)	۳۳۰	ایرانوں کا مقدس دورا
۳۳۰ : ۱	بزم سلیمان (ادیب)	۳۶۹/۳۷۱	ایشیا (ہفتہ وار)
۳۴۸ : ۱	بڑی حویلی (محمد یگانہ)	۷۵	ایک شمع ہزار دیوانے
۳۸ : ۱	بوستان (سعدی)	۳۲۹	آب حیات
۳۱ : ۱	بوسے گل (راکل)		
۲۶۲	بوسے گل، ناز دل، دودھ چرخ محفل	۳۰۶	آبشار
۱۵۸ : ۱	بیان التراب	۲۹۵	آبکل (ماہنامہ)
۳۳۹	بیسویں صدی میں اردو ناول	۷۳	آدمی اور کئے
۲۷۱ : ۱	بھارت کے نامور شاعری	۱۲۲	آدمی چاند کی رات
۱۲۲	بھنور (شاکر پوٹھی)		

نیری صورت میری آنکھیں (ہندو ناچ) : ۷۵	ترونی (منقون) : ۲۴
تھادیر چٹائی : ۱۸۲	تھادیر چپڑ (راجپوتانہ) : ۱۳۷
تعبیر، تشریح، تنقید (کج ازان) : ۶۵	تفصیل لطافات (مجان) : ۲۵
تکاسن سحر (شیم) : ۲۳۶	تخت خدمت (شووش) : ۲۹۲
تیمور باگھرانا (چٹائی) : ۱۸۲	تہا تہنا (ہندو ناچ) : ۷۴
تہذیب بمحوت (نجم) : ۳۵۲	تہذیب نسوان (باناس) : ۱۷۲
تک (دودن نامہ) : ۲۹۸	

ٹ

ٹریڈر جیسٹ (باناس) : ۱۷۰
ٹیلیفون کی کہانی (کج ازان) : ۲۰۶
تھوکر (ہندو ناچ) : ۷۵

ج

جام جم (مضطر) : ۲۲۴
جامہ (باناس) : ۱۲۵
جان بھادر (شیم) : ۲۳۶
جب پھر روتے ہیں (ٹھاکر پونجی) : ۱۴۲
جذبات بسل : ۲۰۹

پ

پاکستان سے ہندوستان تک (ہندو ناچ) : ۱۲۲
پت جھوکے پھرتے (ٹھاکر) : ۱۲۲
پرچم ضیا (قائم) : ۲۱۹
پردہ سادہ (بھووشی) : ۴۲
پہن دروازہ زخاں (شووش) : ۲۱۲
پنجاہیت (باناس) : ۱۰۰
پیاد کا موسم (ہندو ناچ) : ۷۵
پیاسے بادل (ٹھاکر پونجی) : ۱۲۲
پیام تعلیم (باناس) : ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶
پیغام صلح (منقہ دار) : ۱۷۲
پھولوں کا بار (نجم آندی) : ۲۵۱

ت

تاجپین (شاہ حسین الدین احمد) : ۱۷۷
تاج (اسلام حسین الدین احمد) : ۱۷۷
تاج (مردہ) (محمود احمد عباسی) : ۶۸
تاج پور شاہین : ۳۵
تاؤ کے اپدیش (حسین حسان) : ۱۳۶
تجلیاتِ الود (انور کاسمی) : ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵
تحقیقِ انساب (محمود احمد عباسی) : ۶۸
تحقیقِ مزید (محمود احمد عباسی) : ۷۰
تذکرۃ الکرام (محمود احمد عباسی) : ۶۸
تذکرہ شعراءِ اردو (۱۱) : ۷۰

جہادِ اُپشرق (در بیان جنگِ مفتون) : ۲۲، ۳۱۰

جواہرِ یاس (قاسم) : ۳۱۹

جواہرِ سخن (اویب) : ۳۲۸

جئے بکشان (نہج) : ۳۲

جہاد میں رہتا ہوں (ہندو ناتھ) : ۷۲

جیان نا (ہاناس) : ۱۰۰

ج

چاندن کے سایے (شاکر پونجی) : ۱۳۲

چاندی کے ستار (ہندو ناتھ) : ۷۲

چٹان (سفتہ وار) : ۲۹۰

چراغِ بزمِ دہزمِ آندری : ۳۲۹

چٹائی آرٹ (چٹائی) : ۱۸۳

چٹائی اور اس کے نقاد : ۱۸۲

چٹائی کی عریاں تصویریں : ۱۸۲

چندوں کے چاند (شاکر پونجی) : ۱۴۲

چہ قلندارِ گفتم (شورش) : ۲۹۳

ح

حرفِ غزل : ۲۰۵

حرفِ ناتمام (طالب) : ۲۹۹

حرفِ نیم شب (غیم) : ۲۳۶

حزبت (روزنامہ) : ۹۹

حسرتِ کمرہ (شفقت) : ۲۲۸

حسین شہید بہروردی شورش : ۲۵۲

حضرت آرزو کی (صلاحیتیں) : ۲۵۰

حقیقت تو کم کہو (محمد سحر قباٹی) : ۶۰

حمید نظامی (شورش) : ۲۹۲

حیاتِ سلیمان (ندوی) : ۱۶۸

حیاتِ شیدنا (امجاد) : ۲۲۱

خ

خالصا خبار (سفتہ وار) : ۱۹۰

خاؤ و خیر (غیم) : ۲۲۷

خدیگہ ناز (طالب) : ۳۰۰

خداوندِ مساویہ و زبیر (محمد سحر قباٹی) : ۷۰

خلفائے راشدین (شاہ حسین الدیج لہر) : ۱۰۰

خفا کا جادو (سری رام) : ۶۵

خجستانِ کینگی (طالب) : ۳۰۰

خورشیدِ دانا (سج الزماں) : ۲۰۶

خوش رنگ بھول (دھوان) : ۲۵

خیالستان (ہاناس) : ۹۶

د

داستانِ میری، انوکھرا (ہندو ناتھ) : ۷۰

دلِ حضرت (شفقت کالمی) : ۲۲۸

دلہنایِ آرزو (اویب) : ۲۲۷

درد کا دشت (ہندو ناتھ) : ۷۵

دستگیر (ہاناس) : ۲۹۸

دلی اٹھانہ (مٹا دن کی) (محمد دیگ) : ۲۳۰

۷۵ :	ردا	۶۰ :	دلی میں مرثیہ گوئی (رادینا)
۲۶۳ :	روح ادب	۱۲۵ :	دنیا کے بچے (عین حسان)
۳۲۸ :	روح رفیع	۲۱ :	دو چرخ
۲۲۶ :	روحشن اندھیرا	۱۲۶ :	دیک (عین حسان)
۹۹ :	روبان (راہنما)	۱۶۸ :	دین رحمت (شاہ عین الدین احمد)
۴۶ :	روحانیانِ ہند	۳۰۵ :	دیوانِ اظفری
۱۹۹۱۹۵۱۸۹ :	ریاست (سختہ طالع)	۲۰۵ :	دیوانِ بیر محمدی
۲۰۰ :	ریاست	۱۰۶ :	دھرتی میرے پیار کی (نثار)
۲۰۶ :	ریاستہائے متحدہ کی تاریخ	۳۱۹ :	ڈال ڈال، پاصا (ناصر)
۲۶۸ :	زخمِ حسرت	۱۴۲ :	نویسی (ٹھاکر پٹھی)
۱۴۲ :	زلف کے سروں تک	۳۱۹ :	نوکر فکر (ناصر)
۱۸۹۴۵ :	زاد (راہنما)	۷۵ :	راتِ اندھیرا ہے
۱۲۶ :	زمین کے بھائی بہن	۱۴۲ :	رات کے گھونگٹ
۲۸۸۱۵۹ :	زمیندار (روزنامہ)	۲۸۲ :	امامِ دانش پر
۱۴۲ :	زندگی کی دھڑ	۲۵ :	رام بن پاس
۷۵ :	زیرِ صے ہیرد	۱۲۶ :	دائو نے پڑھنا سیکھا
۷۵ :	ساقی	۲۵ :	ربا عیاتِ جوان
۳۰۰ :	سبزہ بیگم	۲۹۹ :	رکنِ آلا
۱۸۳ :	ستاروں	۱۹۵ :	رحیم (روزنامہ)
۴۹ :	مراجہ الدین علی خان آزاد	۳۱۶ :	رفیقِ الاطبا (راہنما)
۳۲۵ :	سرکارِ دہلی		

۸۰ :	میشو	۱۶ :	سراۓ نشاط
۴۶ :	شعاع بہر	۳۶ :	سفید جوگون
۹۹ :	شعورے پنجاب	۸۲ :	سفینہٴ ادب
۶۱ :	سنگنظا (رنا تک)	۳۳۰ :	سلطان عالم (ابو علی شاہ)
۱۲۵ :	ضحیٰ	۶۱ :	سودا (ڈوراما)
۱۲۲ :	شمع ہر رنگ میں جلتی ہے	۱۰۵ :	سودا گز پچھ
۱۹۳ :	شہادت کا تازہ قطرہ	۷۵ :	سوز، دیت انگنا
۱۰۰ :	شیرازہ (مفتی دار)	۲۵ :	سوز دل
۱۹۱ :	شیر پنجاب (مفتی دار)	۲۶۶ :	سہیل بھین
	ص	۲۹۲ :	تدو خطا اشد شاہ بخاری

۲۳۶ :	صبح فادان	۱۰۵ :	سیر بدست
	ط	۱۶۷ :	سیرۃ البنی

۳۰۵ :	طبقات ناصر	۲۰۱ :	سیف و قلم شش
۳۲ :	طلوع کمر		

۱۶۸ :	عرب کی موجودہ حکومتیں	۳۲ :	شاخار (دہا ہی)
۱۱۰ :	عردہ (رانا سار)	۳۳۱ :	شاعر اعظم انیس
۱۶ :	عظیم آباد کی غزشتہ ادبی مجلسیں	۳۰۶ :	شاعر کا دل
۲۳۶ :	عکس گل	۲۷۸، ۱۷۷۳ :	شامکار
۱۸۳ :	عمر خیام (مستود)	۲۹۲ :	شبِ جلے کرم بودم
۱۸۳، ۱۸۳ :	عمل چستانی	۱۱۲ :	خشبِ رقتہ
	غ	۲۷۱ :	مشغون (رانا سار)
۱۳۹۰ :	غبارِ خاطر	۲۶۳ :	شرحِ بالِ جبریل
		۳۲۵ :	شرحِ بابائے ادب تنقیدِ کلام غائب

۲۶۶ :	منظر و نظادہ	۱۸۲ :	اٹھن آوٹ س چٹائی کا کھٹہ
۲۶۷ :	مواضع آئیں و دبیر	۲۸۶ :	ادب
۲۹۲ :	موت سے دلچسپی	۹۰ :	امروز
۳۵۰ :	موسم و مزاج	۱۰۷ :	امروز و بزم
۱۶۷ :	ہماجرین	۷۷ :	انی ڈارنگ
۳۱۹ :	حکیم مکتوب امیر	۲۶۲ :	شنوی مولانا دوم
۳۱۹ :	میراجائی	۳۲۷ :	جاسین رنگین
۳۲۱ :	میری دنیا	۳۶ :	نما و ناست بہر
۲۰۱ :	نما قابل فروش	۱۸۹ :	غزین راہنامہ
۲۱ :	نما اول	۲۲۱ :	مختصر تاریخ ادب اردو
۱۲۵ :	نما مودان اسلام	۶۱ :	مقدور (سارگر)
۴۶ :	نثر و نثر	۲۳۰ :	ذہب اور شاعری
۲۷۸ :	نخلستان (راہنامہ)	۳۳۰ :	مراثی و نغمہ
۶۱ :	نیل (راہنامہ)	۱۸۳، ۱۸۲، ۱۸۱ :	مرقع چٹائی
۸۲ :	نور حیدر	۱۸۳ :	
۲۶۳ :	نثر ادب	۳۱۶ :	سیما (راہنامہ)
۳۲۷ :	نظام اردو	۲۵۱ :	مشودہ (راہنامہ)
۱۹۵ :	نظام المشائخ (راہنامہ)	۲۵۲ :	معراجِ نگر
۲۲۸ :	نظر احصی	۲۷۶ :	مجاد، نیران
۳۶۶ :	نغمہ فردوس	۶۷ :	کتوباتِ حال
۱۸۲ :	نغمہ لذت	۲۲۱ :	کلب ادب کے شاہزادے
۲۲۸ :	نغمہ سہید	۷۷ :	منزل ایک، سا فرد

۵

۱۶۶ :	ہفت رنگ	۱۴۳ :	نغمہ صحرانامہ
۲۳۶ :	ہجاری زمین	۱۴۳ :	نغماتی جائزے (نامہ)
۲۳۲۲۲۲۶ :	ہجاری شاعری	۱۸۴، ۱۸۲ :	نقش چغتائی
۲۵۹ :	ہمارے حسین	۱۲۵ :	نقیب (نامہ)
۲۲۴، ۱۴۳ :	ہمایوں (نامہ)	۱۳۷ :	نکار (سفہ دار)
۶۸ :	مجدد (روزنامہ)	۳۳۰ :	نگارشات ادیب
۱۱۲، ۱۹۱ :	مہم (روزنامہ)	۱۳۷، ۱۰۰ :	نکدات (سفہ دار)
۱۳۷ :	ہم نظم (نامہ)	۴۲ :	نوائے راز
۱۹۵ :	مندر (سفہ دار)	۱۵۷، ۱۵۱ :	نوائے وقت (روزنامہ)
۱۱۳، ۱۱۲، ۱۹۱ :	مہدستان (سفہ دار)	۸۸ :	نویاد (نامہ)
۱۸۲ :	مندی تھادیر چٹائی	۷۲ :	نئی بیماری
۲۶۹ :	ہجر	۲۲۰ :	نئے ادبی رجحانات
۲۹۹ :	یادگاہ برقی	۲۷۱ :	نئے نام
۱۶ :	یادگاہ عشقی	۲۷۱، ۱۵۱، ۱۵۷ :	یہ رنگ خیال (نامہ)
۱۴۲ :	یلوں کے گنڈر	۱۴۲ :	دادیاں اور دیرانے
۲۸۲، ۲۷۹ :	یاما (کو پڑھ)	۲۵۵ :	واقعات اطفری
۴۸ :	یوسف زلیخا (جالی)	۲۸۲، ۱ :	وقت کا آسمان
۳۰۰ :	یہ بھی دلی	۴۱۶، ۲۶۳ :	دکل (مرقسر)
۱۴۲ :	یہ رشتے ایہ لوگ	۲۱۷ :	
۷۴ :	یہاں سے وہاں تک		

بی تعلیم کے مسائل



مصنف: باقر مہدی
صفحات: 172
قیمت: 57/- روپے

مطالعہ فقہاء خاطر



مصنف: عبدالقوی دہلوی
صفحات: 228
قیمت: 68/- روپے

وہ صورتیں انجی



مصنف: نالک رام
صفحات: 256
قیمت: 88/- روپے

نائب اردو نگار کا انتخاب



مصنف: محمد مجیب
صفحات: 132
قیمت: 59/- روپے

وجد: شاعر اور شخص



مترجم: پیسٹ ناظم
صفحات: 144
قیمت: 60/- روپے

چمکی رات



مصنف: فراں گورکھپوری
صفحات: 260
قیمت: 90/- روپے

دلی کی چند عجیب کہانیاں



مصنف: اشرف صہبائی، دہلوی
صفحات: 224
قیمت: 80/- روپے

تذکرہ نامہ وصال



مصنف: نالک رام
صفحات: 432
قیمت: 130/- روپے